ہم لوگ



فہمیدہ ریاض

اوکسفرڈ

هملوگ

ہم لوگ

فہمیدہ ریاض

تعارف: محمد رضا کاظمی

OXFORD
UNIVERSITY PRESS
اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم، فضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویارک

اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکو سٹی نیروبی
نیو دہلی شنگھائی تائپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:
ارجنٹائن آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان پولینڈ پرتگال سنگاپور
جنوبی کوریا سوئٹزرلینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔

پہلی اشاعت ۲۰۱۳ء

ISBN 978-0-19-906232-4

پاکستان میں پرنٹ ویژن، کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس نمبر ۸۲۱۴،
کراچی۔۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

انتساب

پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے نام

فہرست

تعارف .... ح

زندہ بہار ۱

گوداوری ۱۳۳

کراچی ۲۳۵

تعارف

فہمیدہ ریاض ہمارے شعری افق پر آتے ہی چھا گئیں۔ ان کے لہجے کی تندی، ان کے اظہار کی بے ساختگی، ان کا اثر فوری تھا، مگر ان کی شاعری پائدار بھی ثابت ہوئی اور وقت کے ساتھ تہ در تہ معنویت کو کھولتی گئی۔ ان کی شاعری نسائی شاعری سے زیادہ پیامی شاعری تھی، اس لیے حقوق نسواں کو حقوق انساں کی حیثیت سے منوانے میں ان کا کردار قابل رشک ہے۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری بلیغ ہوتے ہوئے بھی ایسے مقاصد سے وابستہ رہی جن کی ترجمانی کے لیے انھوں نے نثر، اور نثر میں بھی کہانی کا پیرایہ پسند کیا۔ ان کی دردمندی اس بے درد زمانے میں ایک سہارا ہے۔ اور یہ ان کے کتاب کے عنوان سے ہی واضح ہے۔

ہم لوگ برصغیر جنوبی ایشیا کی تقریباً گزشتہ نصف صدی پر محیط، اذیت ناک تاریخ کے پیچ اور خم کے چند اہم مقامات کے عکسوں پر مشتمل کہانی ہے۔ اس کے تین حصے، زندہ بہار، گوداوری اور کراچی بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کے حالات اور چند کلیدی واقعات کے بارے میں ہیں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ہندوستان میں جلاوطنی کے سات برس گزارنے کے فوراً ہی بعد فہمیدہ ریاض کو بنگلہ دیش جانے کا موقع ملا اور پھر کراچی کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح اس سہ رخی تصویر کے تینوں پہلو ان کی نظر سے گزرے۔ اگر چند جملوں میں اس کتاب کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو فہمیدہ ریاض کے الفاظ میں ''یہ روداد ہے اس بات کی کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے اپنے ساتھ کیا کیا۔'' اسی لیے کتاب کا عنوان ہم لوگ انہوں نے خود ہی تجویز کیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر انگریز نے اس وسیع و عریض برصغیر کو اس حالت میں چھوڑا تھا کہ اس کے مذہبی، لسانی، تہذیبی اور طبقاتی تنوع میں شدید ٹکراؤ کے پورے امکانات موجود تھے۔ ساتھ ہی ہزاروں

برس کی تاریخ نے برصغیر میں باہمی میل جول، انحصار اور رابطوں کا مضبوط جال بھی بُن رکھا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حکمرانوں نے تصادم کی صورتحال کو اپنے قابو میں نہ کیا (یا وہ ایسا نہ کر سکے) اور ایک دوسرے سے جوڑنے والے سوتوں کو دانستہ (یا نادانستہ) خشک ہونے دیا۔ حکمران طبقوں اور ان کے پسندیدہ دانشوروں نے محض ایک نوعیت کے اتحاد پر اتنا زور دیا کہ دوسرے تمام منسلک کرنے والے پہلوؤں کو فراموش کر دیا اور ان کے ٹوٹنے، بکھرنے اور چیتھڑے اُڑنے کی جانب چنداں توجہ نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جیسے ایک جمہوری ملک میں مذہبی فرقہ وارانہ فسادات آئے دن کا دستور بن گئے، پاکستان میں مختلف قومیتوں کو مسلسل شکایت رہی کہ ان کا گلا گھونٹا جا رہا ہے اور بنگلہ دیش کی علیحدگی اور خود مختاری کی بنیاد میں غیر بنگالیوں کا خون بھی جا پڑا۔ (پاکستان میں بین الاقوامی کش مکش اور ''جہادی'' جوش وخروش نے مسلسل خونریزی کی ایک اور صورت پیدا کردی ہے، جس کا احاطہ یہ کتاب نہیں کرتی، لیکن کتاب کے مندرجات کو موجودہ حالات کا پس منظر سمجھا جا سکتا ہے)

ہم لوگ کے تین مختلف حصوں میں مختلف تکنیکی وسائل استعمال کرتے ہوئے، اس ''کیک کے تین ٹکڑے'' پیش کیے گئے ہیں جو ذائقے میں کم وبیش یکساں ہیں۔ اس سے اول تو ہمیں برصغیر میں انسانی جان کی حیرت انگیز بے قدری کا احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایسے لوگوں کا کثیر تعداد میں قتل کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے جن سے قتل کرنے والے بالکل واقف نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ رجحانات انتہائی غربت اور آبادی کی کثرت کا نتیجہ ہوں پھر بھی قتل عام، تشدد اور اجتماعی لوٹ مار برصغیر کی آبادی کا خاص الخاص وطیرہ نظر آ سکتی ہے۔

لیکن فہمیدہ ریاض اپنی تحریروں میں، اس اندوہناک کشت وخون میں الجھے تہذیب اور شرافت کے وہ مضبوط دھاگے بھی دکھاتی ہیں جو برصغیر کے لوگوں (ہم لوگوں) کا رشتہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے جوڑتے ہیں اور جو بذاتِ خود ہم لوگوں کی فطرت کا حصہ ہیں۔ زندہ بہار میں ایک کانفرنس میں پاکستان سے آئی ہوئی مندوب، بنگال کی علیحدگی پر مسلسل شش وپنج میں مبتلا رہنے کے بعد آخری صفحات میں اس نئے ملک کو قبول کرتی ہے اور بنگلہ دیش کے پرچم کو ''اپنے دل کی سلامی'' پیش کر کے رخصت ہوتی ہے۔

گوداوری میں اندوہناک ہندو مسلم فسادات کے فوراً بعد، بمبئی میں جوہو کے ساحل پر، کہانی کی بنیادی کردار کی بچی جب ٹیوب پر سوار ہو کر سمندر کی لہروں کی زد میں آ جاتی ہے تو ساحل پر موجود تمام افراد

اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور اسے سمندر سے نکال لاتے ہیں، جبکہ کراچی میں جو اس شہر میں ہونے والی متواتر خونی وارداتوں پر مشتمل ہے، بیان کرنے والوں کی ذہنی اذیت اور ملال بذاتِ خود اس صورت حال کے خلاف احتجاج بن جاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کا یہ مصرعہ

ہر اشک مصر، ہر آہ بضد، یہ رات ہمیں منظور نہیں

بتاتا ہے کہ ان کی نثر و نظم اپنے مشاہدے اور مقصد میں متحد ہیں۔ یعنی ہم لوگ کی مصنفہ، فہمیدہ ریاض گو شاعرہ کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں لیکن ان کے تحریر کردہ تین ناولوں، متعدد کہانیوں اور تخلیقی ادب کی نقد و نظر نے انھیں اعلیٰ پائے کی فکشن نگار اور دانشور کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ ان کی یہ تمام نثری تحریریں جذباتیت اور مبالغہ آرائی سے پاک ہونے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی جستجو کے باعث بہت انفرادی مقام رکھتی ہیں۔ مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے وہ اس المیے اور بنیادی قوم پرستانہ دھاروں اور کسی بھی وقت میں پسندیدہ ''نظریات'' کے تضادات اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مصائب اور درد و الم کی مسلسل نشاندہی کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا رویہ غیر جانبدارانہ رہتا ہے، جس سے یہ تحریریں انسانی رویوں کی خیال انگیز دستاویز بن جاتی ہیں اور یہی اردو ادب میں ان کی اہمیت کی اصل وجہ ہیں۔ اگر ہم تینوں ملکوں کے مظلوم اقوام کی ترجمانی کے پیش نظر ان کی مساعی کو ایک مرکز پر لانا چاہیں تو ہمیں جوش کا یہ شعر یاد دلاتا ہے کہ جیت دراصل مظلوموں کی ہوتی ہے ۔

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانت فصل بہار ہیں ہم لوگ

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

زندہ بہار

ڈھاکہ: ۱۴؍دسمبر ۱۹۸۹ء

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ وہ وقوعہ جسے ہم عرفِ عام میں زندگی کہتے ہیں، اپنی اور آپ کی عمرِ رواں کا نام دیتے ہیں، کتنی فی صد صرف باتوں پر مشتمل ہے؟ باتیں جو ہم سنتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کسی بھی کہانی کا ایک حصہ مکالموں ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ کہانیاں اکثر مکالموں کے بنا نہیں ہوتیں۔ لیکن کیا باتیں کوئی کہانی، کوئی واقعہ بنا سکتی ہیں؟ شاید نہیں، تا حالے کہ آپ انسان کے، معلومات سے جسمانی مَس کو ایک واقعہ سمجھیں —جو شاید وہ ہے بھی، اور ایک باریک، لامحسوس تبدیلی بھی پیدا کر ہی دیتا ہے— جبکہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ عشق و محبت ہی کو لیجیے۔ ادبی تاریخ کا لازوال موضوع سر تا سر باتوں پر مبنی ہے، جو محبوب محب سے کہتا ہے، جس کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں کچھ احساسات۔ یہی قصے کی جان ہوتے ہیں۔ بلکہ ہماری صنفِ سخن غزل کی تو مستند بنیاد ہی یہ ہے، یعنی باتیں، ان سے پیدا ہونے والے احساسات، جبکہ کچھ بھی ہو رہا نہیں ہوتا۔ پھر بھی، جیسا کہ آپ آگے پڑھنے والے ہیں، یہ فیصلہ آپ اختتام تک کر پائیں گے کہ آیا یہ ایک قابلِ تحریر موضوع تھا۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ دسمبر ۱۹۸۹ء کے خوشگوار مہینے میں مَیں، یعنی راقم الحروف، ڈھاکہ گئی تھی۔ میں پہلی بار ڈھاکہ گئی تھی۔ سفر پر روانہ ہوتے ہوئے مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ کیوں میں پہلی بار جا رہی ہوں۔ دراصل یہ ایک انتہائی تاخیر زدہ سفر تھا۔ برسوں پہلے، جب میں حیدرآباد سندھ کے ایک کالج میں پڑھتی تھی، تو طالبات کا ایک دستہ، جس مَیں میں شامل تھی، اس وقت کے مشرقی پاکستان جانے والا تھا۔ اس زمانے میں سیر سپاٹے اور قومی یکجہتی کے لیے طلبا کے وفد ملک کے دونوں حصوں میں آتے جاتے تھے۔ لیکن عین وقت پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہڑتال ہو گئی تھی، شہر کا نظم و نسق دگرگوں ہو گیا تھا، اور ہمارا سفر ملتوی ہو گیا تھا، ہمیشہ کے لیے ملتوی۔ لیکن میرا ملال کبھی معدوم نہیں ہوا تھا۔ اور اس بار مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا

کہ دراصل وہ ملتوی شدہ سفراب ہو رہا ہے، جسے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سنہ پینسٹھ میں ہونا تھا۔

اس عرصے میں کیا کچھ ہو گیا!

۱۹۷۱ء میں، بنگال کی جو تصویر میرے دماغ میں تھی اس پر اچانک بہت سا خون گر پڑا تھا۔ یہ سُرخا سرخ ہو گئی تھی؛ ایک خون میں بھیگی ہوئی تصویر۔ پھر بھی تصویر تو وہی تھی، بنگال — سو تو کسی سیاہ آنکھ کا خواب تھا؛ دراز، سیاہ گیسوؤں کی خوشبو، بھٹیالی کی پُرسوز تان، جو ازل سے ابد تک بہتے پانی پر لہرا رہی تھی۔ بنگال — زین العابدین کے موقلم کے سرسراتے خطوط، اور نذرالاسلام، اور ٹیگور کی شاعری۔ آپ بنگال سے کیونکر پیار نہ کریں گے؟ کیونکر اس پر عاشق نہ رہیں گے؟ ایک رومانی، جذباتی، اردو کی شاعرہ ہونے کے ناتے، بنگال سے بہت پیار کرتے رہنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ ایک ایسی بات جو ظاہر ہے ہونی ہی تھی۔ جبکہ بنگال سے محبت کرنے کے لیے تو آپ کا جذباتی، رومانی، یا شاعر ہونا تک ضروری نہیں۔

اس لیے میں اپنے دل میں ایک پیار بسائے جا رہی تھی، ۱۹۶۵ء کا پیار۔ کس طرح میں نے اپنے سفر کی تیاری کی تھی۔ برسوں پہلے، کس طرح، کالج کے زمانے میں بھی، بنگالی کے دو جملے سیکھے تھے۔ ''آپ نارشونگے ملاقات کورے بوندھیتو ہولم۔'' اور دوسرا جملہ تھا، آئی لو یو، ''امی تمار بھالو بھاشی،'' جو تب بھی ایک اچھا، سب کو ہنسا دینے والا جملہ تھا — کسی بھی بے تکلف محفل میں میرا پروانۂ راہداری۔ یہ دونوں جملے مجھے آج بھی جوں کے توں یاد تھے۔ ایک لفظ بھی تو نہ بھولا تھا۔

اس کے باوجود، اس عرصے میں، کیا کچھ ہو گیا!

وقت گزر گیا تھا۔ ہمارے اندر اور باہر۔ بہت وقت۔ کیا سے کیا ہو گیا!

جہاز سے اترتے ہوئے میرے دل میں چپکے چپکے کوئی رو رہا تھا: ہاتھ مل رہا تھا افسوس سے۔ اس وقت مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ میں خود کتنی بدل چکی ہوں۔ وہ لڑکی جو ۱۹۶۵ء میں اپنے سفر کی تیاری کر رہی تھی، اب کہاں ہے؟ ان صاحبہ سے اس کا کیا تعلق ہے جو اس وقت اچھی خاصی حواس باختہ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر کھڑی ہیں؟ اب ہم آپ کو واقعاتی حقیقتوں کا ایک ذرا سا مَس دیتے ہیں، جن سے بہرحال ہم سب کو گزرنا پڑتا ہے، خواہ ہمارے احساسات اور جذبات نہایت منزہ کیوں نہ ہوں۔

یہ حواس باختہ صاحبہ جو امیگریشن کے سامنے کھڑی ہیں، انھوں نے ہر وہ کام کیا ہے جو انھیں نہیں کرنا تھا۔ یہ اپنا دستی سامان جہاز میں بھول آئی ہیں، نو اسموکنگ کی سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے کی کوشش کرتی رہی

ہیں، انھیں اپنے پرس سے ضروری کاغذات کے سوا ہر چیز مل گئی ہے، اور انھوں نے ڈِس ایمبارکیشن کارڈ نہیں بھرا ہے۔ اس وقت انھیں اپنا ہینڈ بیگ خود اپنے منتشر وجود سے زیادہ ناقابلِ فہم معلوم ہو رہا ہے۔ [بیانیے میں آسانی کے لیے ہم انھیں کبھی 'میں'، کبھی 'وہ' اور کبھی 'فہمیدہ ریاض' لکھیں گے۔]

ایر پورٹ کے اندر بنگالیوں کا ایسا انبوہ دیکھنے میں آ رہا تھا جیسا ریلوے اسٹیشن پر بھی نہ ہوتا ہوگا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اس ہجوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے ڈِس ایمبارکیشن کارڈ نہیں بھرا تھا۔ اور فہمیدہ ریاض اس وقت صرف یہی سوچ رہی تھیں کہ اتنے سارے بنگالی آخر کہاں سے آ گئے!

ایک منحنی سے صاحب کارڈ بانٹ رہے تھے، مگر ان کا انداز ایسا تھا جیسے راشن تقسیم کر رہے ہوں۔ انبوہ نے ان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ بالکل بلوے کی سی صورت تھی۔ کارڈ بانٹنے والے صاحب ''ہائیں''، ''ہاپ'' کی گُھرکیاں دیتے ہوئے دونوں بازوؤں کو چاروں طرف لاٹھیوں کی طرح گھمانے لگے۔ اس صورت حال پر واقعی لاٹھی چارج ہوسکتا تھا۔

قطار میں کھڑے کھڑے میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اتنے بنگالیوں کو اکٹھا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؛ اس قدر تیزی سے بولتے، اور اتنا زیادہ بولتے۔ چاروں طرف بنگالی زبان کی سیال، رس گلے کے شیرے جیسی دھاریں کِل کِل کرتی بہہ رہی تھیں۔

نہ جانے کیوں میں نے سمجھا تھا کہ بنگال سے میرا پہلا تعارف آہستہ سے ہوگا۔ یہ تو ایک بھرپور ملاپ تھا۔ اپنے ہی کسی سائیکلون کے چکر کی طرح بنگال تو اب آپ کے چاروں اور تھا۔ اس انسانی گرداب میں غوطہ لگا کر مجھے کارڈ حاصل کرنا تھا۔ لیکن اصل مشکل تو کارڈ تقریباً چھین کر پلٹتے وقت ہوئی، جبکہ باقی سب لوگ دوسری سمت زور لگا رہے تھے۔ ان کے بازوؤں، سینوں اور چہروں میں پیوست میں ان دو جملوں کی مدد سے ہرگز راستہ نہیں بنا سکتی تھی جو مجھے یاد تھے۔ حتیٰ کہ یہ ریلا خود ہی مجھے امیگریشن سے باہر لے آیا، جہاں اب مجھے اپنا سامان تلاش کرنا تھا، اور جہاں عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کا یہ گُتھا ہوا بافتہ اب سامان کی تلاش میں بکھر گیا تھا۔

وہ کنارے پر کھڑی سانس درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امیگریشن سے باہر نکلنے کی جدوجہد ختم ہوتے ہی یہ ٹھنڈا کر دینے والا احساس سرکتا آ رہا تھا کہ انجان شہر میں وہ بالکل اکیلی ہے۔ جہاز میں وہ اکیلی نہ تھی، لیکن اب؟ اگر کسی وجہ سے اس کا تار نہ پہنچ سکا ہو اور اس کے میزبان لینے نہ آئے ہوں تو کیا ہوگا؟

ایرپورٹ کی عمارت کے شیشوں سے ناک چپکائے ہزاروں لوگ جھانک رہے تھے۔ یہ مجمع دم کے دم میں اس کی آنکھوں کے سامنے خطرناک مجرموں کے انبوہ میں تبدیل ہو رہا تھا۔گھبرا کر اس نے تقریباً ہر شخص سے اپنا مسئلہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ ہر شخص نے اسے تسلّی دی اور بحفاظت صحیح جگہ پہنچانے کی پیش کش کی اور ایسا کرتے ہی کسی جادو سے میزبان مددگار کی بجائے، مشکوک ممکنہ قاتل میں بدلتا گیا۔

سامان لے کر باہر کے دروازے کی جانب وہ اس طرح جا رہی تھی جیسے قربانی کا جانور مذبح کی سمت جاتا ہوگا۔ اس نے بہرحال یہ طے کرلیا تھا کہ وہ فوری مدد کے لیے پی آئی اے کے عملے سے رابطہ کرے گی۔ وہی لوگ اس کی حفاظت کریں گے، کیونکہ وہ پاکستانی ہیں اور اردو بولتے ہیں، لہٰذا وہ اسے قتل نہیں کر سکتے۔

پاکستانیوں کے علاوہ ایک اور سہارا ہوسکتا تھا— ایسا سہارا جس سے وہ پوری مدد کا یقین رکھ سکتی تھی، کوئی دوسری عورت۔ وہ اسے ہرگز قتل نہ کرے گی۔ نہ ہی وہ کوئی ممکنہ زیادتی کرنے والی ہوسکتی ہے جو بعد میں اسے قتل بھی کر دے۔ وہی اسے یقیناً صحیح راستہ بتائے گی۔ سو اس نے ایسا ہی کیا؛ شیشے کے دروازے کے پاس کھڑی ایک سلونی بنگالن سے انگریزی میں استفسار۔ وہ کسی دوسرے کے انتظار میں کھڑی تھیں جو کولمبو سے آنے والا تھا۔ انھوں نے جھٹ پوچھا، ''تو کیا آپ دولتِ مشترکہ کے ادب والے سیمینار میں آئی ہیں؟'' اور اسے اس کی میزبان پروفیسر تک لے گئیں جو دو رضا کار طالب علموں کے ساتھ خاصی پریشان کھڑی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے اس طرح اچھل پڑیں کہ اس کی تمام پریشانی آناً فاناً غائب ہوگئی۔ اور خوشی میں ہم دونوں دیر تک ہاتھ ملاتے رہے۔

یہ تو ایک قطعی بے ضرر دنیا تھی! خدا اپنی جنت میں مطمئن تھا اور نیچے روئے زمین پر ادبی اور علمی موضوعات پر مذاکرے ہو رہے تھے۔ غیرملکی وفد بلا روک ٹوک آ جا رہے تھے، جن کا محبت بھرا استقبال کیا جا رہا تھا، اور طرح طرح کی زبانیں دلچسپی کا باعث اور خوش ساعت تھیں۔ میں نے ایئرپورٹ پر انبوہ کی جانب دیکھا۔ معصوم منتظر دوستوں اور رشتے داروں کا مجمع اس سے بے پروا، پہلے کی طرح شیشوں سے ناکیں چپکائے اندر نگراں تھا۔ ان میں کوئی بھی اب اسے خونی قاتل معلوم نہ ہو رہا تھا۔ ایک فرد کی پہچان نے اس ڈگمگاتے منظر کو بدل ڈالا تھا، اس کے دل میں رسیوں سے جکڑی خوشی اچانک آزاد ہو گئی تھی۔ بالآخر ڈھاکہ! وہ دوڑتی ہوئی کہیں تک بھی جا سکتی تھی، اور گاڑی میں بیٹھنا نہ چاہتی تھی۔ وقت کا ایک عرصہ اس ذہن سے محو ہو چکا تھا اور ۱۹۶۵ء میں ہونے والا سفر اب ہو رہا تھا۔ جس لڑکی کو وہ اپنے آپ سے

بے تعلق سمجھ رہی تھی، وہ کئی دہائیوں کا کفن پھاڑ کر جوں کی توں نکل آئی تھی۔ ارے تم زندہ ہو؟ میں نے لڑکی سے کہا۔ نہیں، اس نے مجھے بتایا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے، تھوڑی دیر کے لیے ... پھر ایک بدن میں ہمارا ساتھ رہنا تو مشکل ہوگا نا۔

میزبان ڈھاکہ یونیورسٹی کی بنگالی خاتون پروفیسر تھیں — بہت خوش مزاج اور گرم جوش — اور مسلسل باتیں کر رہی تھیں، جو اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

''آج کل بہت وفد آ رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں...'' انھوں نے گفتگو کی روانی میں بتایا۔ ''کئی تقریبات ہو رہی ہیں۔ یہ سب ۱۶ دسمبر کی تیاری میں۔ ہمارا یومِ فتح ہے نا۔''

ارے! ذہن میں گھنٹی سی بجی۔ اور ایک سنسناہٹ۔

مجھے تو خیال ہی نہ آیا تھا کہ یہ دسمبر کا مہینہ ہے۔ اٹھارہ برس پہلے انھی دنوں بنگلہ دیش بنا تھا۔ ۱۶ دسمبر کو پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تھے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ کہاں تھی؟

اب پھر کچھ بھی چند لحظہ پہلے جیسا نہ تھا۔ یادوں کی ایک اونچی، پہاڑ سی لہر گزر رہی تھی۔

ایرپورٹ سے وہ مجھے ڈھاکہ کلب لے گئے، جہاں مسز محیط الاسلام کے شوہر ٹینس کھیلنے گئے تھے۔ انھیں لیتے ہوئے ہمیں میزبان پروفیسر کے گھر جانا تھا۔

کیا یاد آتا ہے ڈھاکہ کلب سے؟ کیا یاد آتا ہے؟

انڈین آرمی — اور کیا! انڈین آرمی کے افسر ڈھاکہ کلب میں ٹھہرے تھے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو میں کہاں تھی؟

گھر پہنچتے ہی محیط صاحب نے ٹی وی لگا دیا۔ ''ایک پروگرام ہے جو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ٹی وی پر خصوصی پروگرام آ رہا تھا۔ ۱۴ دسمبر کی رات الشمس اور البدر کے کارکنوں نے کئی بنگالی دانشوروں کو ان کے گھر سے اکٹھا کر کے، اذیتیں پہنچا کر مار ڈالا تھا۔ ان میں صحافی، ادیب، یونیورسٹی کے پروفیسر شامل تھے۔ ان کی پھولی ہوئی لاشیں بعد میں بوڑھی گنگا میں بہتی ملی تھیں۔ ٹی وی پر ان دانشوروں کے بچوں سے بات چیت کی جا رہی تھی۔

میں ایک خوفناک سناٹے میں آئی، صوفے پر بیٹھی، اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بے شک میں یہ سب کچھ جانتی تھی، لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ دسمبر کا مہینہ ہے، اور یہ سب کچھ اتنا تازہ ہے۔ میرا ذہن اچانک ۱۹۷۱ء سے دوبارہ روبرو ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے ان واقعات کے بارے میں دور سے محسوس کیا تھا اور سوچا تھا۔ اور اچانک... اچانک میں کہاں آ گئی تھی؟ یہ سنہ پینسٹھ کا سفر نہیں تھا، جو ملتوی ہو گیا تھا۔ وہ سفر تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ وقت گزر گیا تھا۔ بہت وقت گزر گیا تھا۔

اسکرین پر ایک لڑکی، شلوار قمیص میں۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے مگر بول نہیں پا رہی۔ آخر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''کہتی ہے، میں بہت چھوٹی تھی۔ اس رات وہ آئے اور بابا کو لے گئے۔''

یہ ایک خوشحال بنگالی گھرانہ ہے۔ چھوٹا سا سرخ اینٹوں سے بنا گھر۔ شوہر کی ٹریول ایجنسی ہے، بیوی پروفیسر۔ ڈرائنگ روم میں بینت کا صوفہ۔ چوکور جوٹ کے قالین کا ٹکڑا وسط میں بچھا ہے۔ دیواروں پر آبی رنگوں میں، سادہ فریموں میں تصویریں۔ عیش وعشرت کا کہیں نام نشان نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں متوسط، خوشحال خاندانوں کے ایسے ہی گھر ہوتے ہیں جو میں نے وہاں دیکھے تھے۔ فرق اتنا ہے کہ نیچے کھڑی گاڑی ایک پرانی ٹویوٹا ہے۔

''آپ کیا کھانا چاہتی ہیں؟''

''پان۔''

''ہاں، پان تو لے آئیں گے۔ یہ کھائیے، زیتون کا اچار۔ یہ وہاں نہیں ہوتا ہوگا۔''

کھانے کے بعد ہم کافی کے لیے پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ٹیلی وژن پر اب خبریں آ رہی تھیں۔ صدر ارشاد کی والدہ فوت ہو گئی ہیں۔ اسکرین پر وہ اور ان کی بیوی غم سے نڈھال، غم گساروں کے کندھوں پر سر رکھے دکھائے جا رہے تھے۔

پروفیسر اور ان کے شوہر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر چپکے چپکے ہنستے ہیں۔

''یہ اپنی ماں کی موت کو بھی سیاسی رنگ دے رہے ہیں، ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔''

''اور مسز ارشاد کو تو دیکھو! کوئی عورت ساس کے لیے ایسے نہیں روتی دھوتی۔''

''ہاں، یہاں تکنیکی غلطی ہوگئی۔''

ہم تینوں ہنستے ہیں۔

کافی پیتے ہوئے محیط اداس ہو گئے۔ پھر دھیرے دھیرے بولنے لگے، ''جس رات انھوں نے ایسا کیا، میں یہیں تھا۔ بہت سے لوگ کلکتہ چلے گئے تھے، مگر میں نہیں گیا تھا۔ بس اسی رات۔''

وہ اپنے موضوع میں ڈوبتے چلے گئے۔ ''آخر انھیں کیوں قتل کیا گیا؟ اس قتل کے پیچھے کیا مقصد تھا؟ کیا مقصد ہوسکتا تھا؟'' وہ نیچی آواز میں آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

بنا کسی مرضی کے فہمیدہ ریاض ان کے ساتھ مل کر سوچنے کی کوشش کرنے لگیں۔ دماغ پر زور ڈالنے لگیں۔ کیا مقصد ہوسکتا تھا؟

''الشمس اور البدر کے لوگ تھے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نہیں، صرف البدر کے،'' محیط صاحب نے بتایا۔

''ہر سال پابندی سے شہدا کو خراج پیش کر دیتے ہیں،'' محیط کہہ رہے تھے، ''لیکن کوئی تفتیش نہیں کی گئی۔ یہ معلوم نہیں کیا گیا کہ یہ کثیر التعداد قتل، کس منظم، وسیع منصوبے کا حصہ تھا۔''

وہ سوچنے کی کوشش کرنے لگی، آیا یہ کسی وسیع تر منصوبے کا حصہ تھا؟ لیکن اس کا دماغ خالی رہا اور سنسنانے لگا۔ اسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رونا شروع کرنے والی ہے۔

''کہتے ہیں مجیب باہنی نے دانشوروں کے قاتلوں سے پوچھ گچھ کی تھی، لیکن رپورٹ شائع نہیں کی گئی۔''

''جب فلم ڈائریکٹر ظہیر ریحان مجیب نگر سے لوٹے،'' محیط نے اسے رازداری سے بتانا شروع کیا، ''اور انھوں نے اپنے بھائی شہید اللہ قیصر کو غائب پایا، تو انھوں نے ایک تفتیشی کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی میں عنایت اللہ تھے، مودود احمد، سید حسن امام، امیر الاسلام اور چند دوسرے۔''

''اچھا؟''

''ہاں۔ مگر ظہیر کی جان چلی گئی۔ وہ میر پور کے خونیں ٹھکانوں میں گیا اور کبھی واپس نہ لوٹا۔ بہاریوں کا گڑھ تھا نا میر پور۔ معلومات کے لیے گیا تھا۔ پھر کسی نے اسے زندہ نہ دیکھا۔ لاش تک نہ ملی۔''

اب اس کے دماغ میں آنسو نہیں ڈھل رہے تھے۔ اسے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ محیط سے کہنا چاہ رہی تھی کہ وہ رو کیوں نہیں لیتا۔

لیکن اس نے صرف اتنا کہا، ''واقعی، تفتیش تو ہونی چاہیے۔''

''یہاں کوئی زندہ بہار لین ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اولڈ ڈھاکہ میں ہوگی۔ نام تو میں نے بھی سنا ہے۔ کیا کوئی رہتا ہے وہاں؟''

میں انھیں کچھ نہیں بتاتی۔ اس بات کا تعلق ایک مشتبہ عشق سے ہے۔ سفید اور سیاہ باریک ڈوروں کے درمیان بہتے بے شمار دوسرے رنگ ہیں، انھی میں کہیں ایک رنگ یہ بھی ہوگا، اپنے ہونے اور نہ ہونے کا برابر یقین دلاتا ہوا۔ لیکن پھر بھی، اس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے یاد تھا۔ اسے خوب یاد تھا۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

وہ اچانک چونک پڑی۔ جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا۔ خاموشی میں ڈوبی بیٹھی رہ گئیں فہمیدہ ریاض، ویران خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورتی...

''یہ آپ کے لیے لمبا دن تھا۔ اب سو جائیے۔''

فہمیدہ ریاض اپنے کمرے میں آتے ہی دروازہ اندر سے بند کر کے باتھ روم میں گھس گئیں اور سنک پر سر جھکا کر قے کرتی رہیں۔

یہ ڈھاکہ میں ان کا پہلا دن تھا، پہلی رات تھی۔

بستر بالکل ایسا تھا جیسے ہندوستان کے عام گھرانوں میں ہوتا ہے۔ لکڑی کے آپس میں جڑے ہوئے تختوں پر روئی کا گدا بچھا دیا ہے۔ میں بھول جانا چاہتی ہوں، مگر دل سے ایک ہوک امنڈتی ہوئی آتی ہے۔ کہیں دور سے ٹرین کی سیٹی کی آواز آ رہی ہے۔ شاید ریلوے اسٹیشن پاس ہے۔ رات کے اندھیرے میں گاڑیاں کومیلا اور سلہٹ اور چٹا گانگ کے لیے روانہ ہو رہی ہوں گی، اس نے سوچا۔ یہ جادو بھرے نام، اور ان کی کشش!

کھڑکی سے باہر ڈھاکہ کے اس نسبتاً خوشحال علاقے میں چھوٹے چھوٹے دومنزلہ گھر چاندنی میں نہائے کھڑے ہیں، اور چاندنی میں ڈوبے ہیں پیڑ پھول اور تالاب۔ اس اجنبی زبان کی سرزمین پر، جہاں تک پہنچتے مجھے ہوائی جہاز میں بھی پورا دن لگ گیا تھا، جہاں میں گورکھپور، بلیا اور قصبہ کے اوپر سے گزرتی

ہوئی پہنچی ہوں، شمس الضحیٰ اور نورالہدیٰ اور قمر الاسلام کو شولام آ لے کم کہنے، جن کے نقوش میں بڑی جھلک بھی ہے۔

شولام آ لے کم اور کھودا ہا پیچ۔

ہم تمھاری شروع اور آخر جانتے ہیں، اور وہاں متصل ہو جاتے ہیں۔ اور بیچ میں جو کچھ تھا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

امی بنگلہ بوجھتے پارے، کنتو بولتے پارے ناں۔

بوجھتے پارے بھی کہاں بھائی! ہم نے نہیں بوجھی پہیلی تمھاری۔

۱۵ دسمبر: ڈھاکہ دن کے اجالے میں

''یہ نیا ڈھاکہ ہے۔ آج میں آپ کو ہوٹل چھوڑ دوں گی۔ اتفاق سے آج جمعہ ہے اور چھٹی ہے۔ پھر تھوڑی دیر کو ہم یونیورسٹی جائیں گے۔ وہاں میرے ڈپارٹمنٹ میں شاید کوئی ہو۔''

''آپ کے یہاں بھی جمعے کو چھٹی ہوتی ہے؟ کس نے شروع کرائی؟ ارشاد نے؟''

''نہیں ضیاء الرحمٰن نے۔ آپ میرے ساتھ چلیے۔ آج دراصل ہمیں میلاد کرنا ہے۔ ہمارے گھر کی نیو رکھی جارہی ہے۔''

وہ مسز عبدالاسلام پر حتی الامکان ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ہوٹل کا نام سن کر ہی اس کی روح فنا ہو چکی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، وہ ہوٹل جانا ملتوی کرتے رہنا چاہتی ہے۔ وجہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کہ بچپن میں دیکھی ہوئی ہندوستانی فلموں میں ہوٹل کو خوفناک جرائم کے اڈے کے طور پر پیش کیا جانا مقبول تھا۔ اس نے ان سب فلموں پر دل سے یقین کیا تھا۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ہوٹل سے کوئی خوفناک واردات منسلک ہو چکی تھی، جو خود اس کے اپنے ساتھ ہوئی تھی۔ لڑکپن کے زمانے میں ایک وہم وقتاً فوقتاً اسے آن لیتا کہ کسی ہوٹل کی تنگ راہداری میں، جس کے دونوں اطراف بھاری چوبی بند دروازے ہیں اور جس پر گہرا سرخ قالین بچھا ہے، وہ ہانپتی ہوئی بے تحاشا بھاگ رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک شخص، سہ رنگے کپڑوں میں، ہاتھ میں چمچماتا چھرا لیے دوڑ رہا ہے۔ وہ چھپتی ہوئی باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے؛ کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ، جہاں سے تازہ ہوا آ سکے۔ وہ موت سے نہیں ڈر رہی ہے، لیکن وہ کھلی

ہوا میں مرنا چاہتی ہے، لوگوں کے درمیان! ہاں، وہ لوگوں کے درمیان، کھلے آسمان تلے مرنا چاہتی ہے۔ قتل ہونے کی بجائے وہ اس خوف کے خیال سے خوفزدہ ہے جو اصل واردات سے ایک لمحہ پہلے اسے محسوس ہوگا۔

اب فی زمانہ، جدید زندگی ایسی ہے کہ کبھی کبھار ہوٹل میں تو ٹھہرنا ہی پڑتا ہے، اور دانت بھینچ کر ہر خوفزدہ کر دینے والا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں فہمیدہ ریاض اپنے حساب سے کچھ احتیاطی تدابیر کرتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ وہم ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن وقت کی اس عجیب عادت کے باعث کہ وہ ایک سطح پر متحرک، ایک سطح پر ساکت اور ایک سطح پر معکوس رہتا ہے، ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

لیکن اس پل میلاد کے خیال نے انھیں پوری طرح متوجہ کر لیا تھا۔

''میلاد؟ کیا بنگالی میں ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔ اور عربی میں بھی۔''

گزری رات اس کے بستر میں ایک ہیولا سویا تھا، یا شاید دو ہیولے تھے۔ ایک تو بالکل چپ تھا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا، بولتے کیوں نہیں؟ مگر وہ آنکھیں سکیڑے، دور کہیں دیکھتا رہا۔ میں نے اس کے سینے پر سر رکھا، اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ کیا آپ ان لوگوں سے بہت نفرت کرتے ہیں؟ انھیں معاف نہیں کر سکتے؟ وہ خاموش رہا۔ ایک زخمی نظر بھی مجھ پر ڈالی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس کی چادر اٹھا کر دیکھا تو اس آدمی کے بدن کی جگہ مبادا مجھے سلگتے ہوئے انگاروں کا ڈھیر نظر آئے۔

دوسرا ہیولا ٹھاٹھ سے مسکرا رہا تھا، اندھیرے میں آنکھیں چمکاتا ہوا۔ جوئے بنگلہ! اس نے مجھ سے شب بخیر کی جگہ کہا تھا اور مسکراتا ہوا سو گیا تھا۔ جوئے بنگلہ! میں نے اس کے ہونٹ چوم کر کہا تھا، اور دونوں کے گلے میں بانہیں ڈالے ساری رات جاگتی رہی تھی۔

اس بے خوابی کا اثر زائل کرنے کی خاطر میں بنگالی میلاد سننے کے لیے بیتاب ہوگئی۔

دن کے اجالے میں ڈھاکہ کتنا حسین دکھائی پڑ رہا تھا۔ ہر طرف درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ اونچے لمبے ناریل کے درخت۔

''ہم فیڈرل کالونی میں رہتے ہیں،'' مسز محیط نے بتایا۔

میں نے کچھ حیرت سے ان مختصر سے گھروں کو دیکھا، جو کسی سول لائنز کے درمیانے گریڈ کے افسروں کے مکانوں جیسے تھے، اور اپنی ڈیفنس سوسائٹی یاد کی۔ یہاں ہر چیز پاکستان سے کوئی دس گنا چھوٹے پیمانے پر ہے۔ ان کی فوج بھی اتنی چھوٹی، اور فوجیوں کے مکان بھی، میں نے سوچا۔ مگر اتنی چھوٹی سی فوج دھڑادھڑ مارشل لا لگاتی رہتی ہے!

صنعتی علاقے سے گزر کر اب ہم بنانی کی طرف جا رہے تھے جو ڈھاکہ کے جنوب میں نیا آباد ہونے والا محلہ ہے۔ بیچ میں ایک بڑی شاہراہ ہماری سڑک سے مل رہی تھی۔

''یہ سڑک مواکھالی کو جاتی ہے۔ پوش علاقہ ہے۔ ڈھاکہ کے امیر لوگ اب گلشن میں مکان بنا رہے ہیں۔''

مواکھالی سے کیا یاد آتا ہے؟ اس نے دل سے پوچھا۔

نواکھالی، دل نے بتایا، جہاں تقسیم سے پہلے، اولین ہولناک ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔

پہلے نہیں، دوسرے، اس نے دل کو یاد دلایا۔ پہلے فسادات تو کلکتہ میں ہوئے تھے۔

ہندوستان میں ایک بی بی تھیں۔ سوشیلا دیوی۔ وہ گاندھی کے آشرم میں رہتی تھیں، مگر دہریہ تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی میں بھی کام کرتی رہی تھیں۔ انھوں نے فہمیدہ ریاض کو ایک عجیب واقعہ سنایا تھا۔ بنانی جاتے ہوئے کار میں انھیں وہ واقعہ یاد آیا۔ کلکتہ میں جب ہندو مسلم فساد ہوئے تو ظاہر ہے کہ خونریزی کرنے کے لیے عام آدمی مناسب نہ تھا؛ ایسے موقعوں پر چند ماہرین کی خدمات لینا پڑتی ہیں۔ انھیں میں سوشیلا دیوی کو ایک پٹھان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک پھیرے میں وہ چھ سات چاقو زنی کی وارداتیں کرتا تھا، لیکن جب وہ ٹھکانے پر پہنچتا تو اس کا بدن تپتے لوہے کی طرح گرم ہوتا۔ اس کے حواس ٹھکانے کرنے کے لیے اس پر برفیلے پانی کی بالٹیاں ڈالنی پڑتیں، بعض اوقات تو برف کی سل پر لٹانا پڑتا۔

شہر کے نئے علاقے میں ایک نہایت مختصر پلاٹ پر بنگالی پروفیسر کے گھر کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ایک مولانا، لنگی کرتے پر بڑا سا سیاہ چوغہ پہنے، تنکوں کی ترکی ٹوپی اوڑھے کھڑے تھے۔ ان کی ڈاڑھی چینیوں سے ملتی جلتی تھی، جسے ہماری طرف (یعنی یو پی میں) 'بکرا ڈاڑھی' کہتے ہیں۔ ذرا دیر میں اِدھر اُدھر بنے مکانوں سے پچیس تیس بنگالی چارخانے کی لنگیوں پر بنیانیں شرٹیں پہنے پلاٹ پر جمع ہو گئے اور سروں کو رومال سے ڈھانپ کر، نہایت عقیدت سے ایک چوکور گھیرا باندھ کر بیٹھ گئے۔ مولانا نے لہک لہک کر بنگالی میں نعتیں پڑھنی شروع کیں۔ بیچ بیچ میں حاضرین شولام، شولام کہتے جاتے۔ اس کے بعد آیتیں پڑھی گئیں،

جن میں فے اور جیم اور زے کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا تھا کہ اگر کوئی عرب سن لے تو عربی بولنا چھوڑ دے۔ یہ ایک زلزلہ خیز، بنگالی نما عربی تھی جسے میں اس وقت سن رہی تھی اور ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔

کیوں ہنس رہی ہو؟ میں نے ہنسنے والی کو ڈانٹا۔

وہ خوب جانتی تھی کہ ایسا کرنا نہایت بدتہذیبی ہے۔ بنگلہ زبان، جس پر وہ پہلی ساعت میں مر مٹی تھیں، غالباً عربی کے صوتی انگ نہیں رکھتی (یا شاید رکھتی ہے مگر بنگالی اس کا غلط استعمال کرتے ہیں؛ پیجامے کو پے زامہ کہتے اور لکھتے ہیں)۔

اسی قسم کی باتوں کی وجہ سے بنگالی ہم سے الگ ہو گئے، میں نے پھر اسے تنبیہ کی۔

نہیں، اس وجہ سے نہیں، ہنسنے والی نے کہا۔ وہ اب اقتصادی ناانصافیاں، سیاسی غلطیاں، وغیرہ گنوانے والی تھی۔

پھر بھی، کسی کے لب و لہجے پر ہنسنا تو اچھی بات نہیں، میں نے بدمزگی سے کہا۔

مگر اس کا کوئی علاج نہیں، اس نے کہا۔ کرۂ ارض پر حضرت انسان کے بے ترتیب ارتقا نے اسے اسی طرح کا بنا دیا ہے کہ اپنے آپ سے مختلف لوگوں کو دیکھ کر، خصوصاً اگر وہ پانچ سے زیادہ ہوں، تو پہلے تو خوفزدہ ہو جاتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اب یہ مل کر اس پر حملہ کریں گے۔ اب اگر خوف ختم ہو جائے تو پھر ان کی حرکات و سکنات اسے اتنی عجیب لگتی ہیں کہ وہ بے اختیار ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔ اس ہنسی میں کینہ نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں، دوسرے لوگ خود اس کی زبان اور لہجے کو اتنا ہی قہقہہ آور سمجھتے ہیں، یا کم از کم کسی لطیف مذاق کی مانند اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ثبوت؟ حاضر ہے۔ یہ لیجیے۔

گزری رات جب وہ اپنے بستر پر دو شخصوں کی موجودگی کے باعث سو نہ سکی تھی تو اس نے کمرے میں کتابوں کے شیلف میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ جنگِ آزادی پر لکھے گئے ایک بنگالی ناول کا انگریزی ترجمہ۔ ایک صفحے پر وہ ٹھٹک گئی تھی:

> بازار میں اس وقت ہر طرف اردو بولی جا رہی تھی۔ یوں کہیے کہ اردو کا ایک ریلا تھا جو پوری قوت سے بہا جا رہا تھا۔ ویسے تو میں اکثر اس زبان کے زیر و بم سے خاصا محظوظ ہوتا ہوں، مگر یہ وقت ہنسنے کا نہ تھا...

کیا؟ بنگالی اردو پر ہنستے ہوں گے! یہ بات انتہائی تعجب خیز اور ناقابلِ یقین ہے۔

دنیا میں بہت سی باتیں ناقابلِ یقین ہیں۔ مثلاً کیا آپ جانتی ہیں کہ جنوبی یمن میں ایک ایسا پودا ہے جس کا رس خون کی طرح سرخ ہے؟ پھول توڑو تو زخمی شاخ سے خون سا ابلتا ہے۔

میلاد ابھی جاری تھا۔ میزبان پروفیسر میرے پاس آئے۔ ''یہ سامنے جو صاحب کھڑے ہیں شاید بہاری ہیں۔ آپ ان سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ میں نے ان کو اردو بولتے سنا ہے۔''

میں فوراً ان کی جانب لپکی۔

چار خانے کی لنگی بش شرٹ پہنے بنگالی لگتے آدمی نے اچانک فراٹے سے اردو بولنا شروع کر دی۔ ''یہیں رہتا ہوں میں۔ جی نہیں، بہاری نہیں، کانپور کے پاس ایک جگہ ہے قنوج، وہاں کے ہیں ہم۔ عطر بہت مشہور ہے وہاں کا۔ عطریات ہی کا کاروبار کرتے ہیں۔ جی ہاں، پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب وہ جو بُرا وقت آیا تھا سو تو گزر گیا۔ اللہ نے بچا لیا۔ پچھلے برس یہاں یہ مکان بنوا لیا ہے۔ (دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ جو ایک مختصر پلاٹ پر بنایا گیا ہے۔) میری بھانجی پاکستانی ہے۔ بیٹے کی شادی اسی سے کی ہے۔ آپ ملیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔''

مجھے اپنے ہم سفروں کی یاد آئی جن میں کافی بہاری یا اردو بولنے والے لوگ رشتے داروں سے ملنے، بیاہ شادی میں شریک ہونے آ رہے تھے۔ ''ماموں جان کے بیٹے کی شادی میں جا رہے ہیں،'' ایک بچے نے بتایا تھا، ''جی ہاں وہ بھی پاکستان آئے تھے۔ ایک بار دیکھ کر واپس چلے گئے۔''

میں نے بنگالی نما قنوجی سے پوچھا، ''یہاں کوئی زندہ بہار لین ہے؟''

''ہے تو،'' انھوں نے کہا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک جمیل تبسم پھیل گیا— ایسی حسین اور لطیف مسکراہٹ کہ میں سانس روک کر دیکھتی رہ گئی۔ تو دراصل یہ ایک فرشتہ تھا!

''کہاں ہے؟''

''پرانے شہر میں۔ زندہ بہار... فرسٹ لین یا سیکنڈ؟''

''یہ تو... میں بھول چکی ہوں،'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''کیا یہ آپ کے پچھلے جنم کی بات ہے؟''

''نہیں نہیں،'' میں نے گھبرا کر کہا، ''وہ ایک جنم جلی عورت تھی اور اس کا کوئی پچھلا جنم نہ تھا۔''

''تو پھر... خیر، کوئی بات نہیں، دونوں دیکھ لیجیے گا۔''

شام کو میزبان پروفیسر نے کہا، ''یہ گھر، جہاں ہم رہتے ہیں، یعنی ڈیفنس میں، میری نند کا ہے۔ میرے نندوئی سیاست میں ہیں۔ چلیے آپ کی ملاقات کراتے ہیں۔''

نندوئی صاحب ریٹائرڈ جنرل نکلے۔ پہلے مغربی پاکستان میں تعینات تھے، اور کرنل تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد انھیں فٹ سے جنرل بنا دیا گیا تھا۔ ایسا بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اس ننھی منی فوج میں جنرل ہی نہ تھے، اس لیے الل ٹپ ترقیاں کرنی پڑیں۔

''بات یہ ہے کہ...'' میں نے ذرا ہمت کر کے کہا، ''ایک تو کچھ ہم پاکستانی اپنے مصائب ہی میں مبتلا رہے۔ دوسرے، آپ کے حالات بھی خاصے گنجلک ہیں۔ مجیب کے قتل کے بعد سب کچھ گڈمڈ ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کس نے کس کو مار دیا اور پھر کیا ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ایک بیہودہ سوال پوچھ رہی ہوں، مگر اسے آپ میری لاعلمی سمجھیے اور میری تاریخ کی معلومات کو درست کر دیجیے۔''

''جی ہاں۔ شیخ مجیب کو مشتاق کھونڈکر نے مارا۔''

''کیوں؟ کیا یہ سی آئی اے پلاٹ تھا؟''

''تھا تو،'' انھوں نے نرمی سے کہا، ''مگر شیخ مجیب بہت غیر مقبول ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے بنگال میں بھیانک قحط پڑا تھا۔''

''اور پھر؟''

''خالد مشرف نے — وہ بھی فوجی تھے — مشتاق کھونڈکر کو صدر کے عہدے سے معزول کر دیا۔ خالد مشرف پرو انڈیا تھے۔ آپ ہندوستان نواز کہہ سکتی ہیں۔ اس کے بعد کرنل ابو طاہر نے خالد مشرف کو قتل کر دیا۔ کرنل طاہر ایک بہت ذہین اور جیالے انسان تھے۔''

''ان کے بارے میں تو میں بھی جانتی ہوں۔ میں نے ان کا عدالت میں دیا ہوا بیان پڑھا تھا، جو ہم لوگوں نے اردو میں ترجمہ کر کے چھاپا تھا۔''

''اوہو! واقعی؟ وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ جب بھٹو صاحب کو لاہور ہائی کورٹ نے سزائے موت سنا دی تھی، اور پاکستان میں صحافت پر سخت سنسر تھا، تب اشاروں اور کنایوں میں باتیں کی جا رہی تھیں۔ کرنل طاہر پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر پھانسی دی گئی تھی۔ عدالت میں ان کا بیان بہت متاثر کن تھا، اس لیے وہ پاکستان میں چند

جرأت مند حلقوں کی جانب سے ایک رسالے میں شائع کیا گیا تھا۔ گویا بھٹو صاحب کے دل کی بات کسی دوسرے کی زبان سے کہلوائی جا رہی تھی۔ خیر، وہ تو ایک دوسرا قصہ ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ کرنل طاہر کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے؟''

''کرنل طاہر ...ہاں، کرنل طاہر بہت بہادر تھے۔ وہ ہماری جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ لڑائی میں ان کے دونوں پیر بم سے اڑ گئے تھے۔ مگر وہ ہندوستان نواز نہیں تھے۔ انھیں ہندوستانی فوج کا احساسِ برتری سخت ناگوار گزر را تھا۔ وہ ایک سچے قوم پرست تھے۔ جب وہ انقلاب لائے تھے تو رات کو ڈھاکہ ان نعروں سے گونج رہا تھا: 'عوام اور سپاہی ایک ہو جاؤ'۔ خالد مشرف کی رہائش پر حملہ سپاہیوں اور عام لوگوں نے مل کر کیا تھا۔''

''کرنل طاہر خود صدرِ مملکت نہیں بنے۔ انھوں نے جنرل ضیاء الرحمٰن کو صدر بنایا، اور ضیاء الرحمٰن نے انھی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر انھیں پھانسی کی سزا دے دی۔''

''ہاں۔''

''لیکن کس جرم پر؟ آخر کیوں؟''

''یہ بات...'' نندوئی نے اٹک اٹک کر کہا، ''کچھ واضح نہیں ہے۔''

کیوں واضح نہیں ہے یہ بات؟ میں نے کمرے کے در و دیوار سے پوچھا۔ یہ گھر اتنا سادہ کیوں ہے؟ وہی بینت کے صوفے اور جوٹ کے قالین کا چوکور ٹکڑا۔ یہ ہرگز کسی ریٹائرڈ جنرل کا گھر نہیں ہو سکتا، کم از کم پاکستانی کا تو نہیں۔ جبکہ یہ نندوئی ضیاء الرحمٰن کے زمانے میں وزیرِ اطلاعات رہ چکے ہیں، اور اب خالدہ ضیا کی سیاسی جماعت کے سربرآوردہ رکن ہیں۔

''لیجیے، چائے پیجیے اور یہ پنیر کھائیے۔'' ان کی بیگم نے مجھے ڈھاکہ کے جگ مشہور سفید پنیر کا ٹکڑا دیا۔ اس سے زیادہ مزے دار پنیر میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ میری میزبان پروفیسر میرا سامان لے کر مجھے بنگلہ سیاحتی بیورو کے پرجاتن ہوٹل کی طرف لے جا رہی تھیں۔

اب پھر رات ہو چکی تھی۔ اچانک مجھے ان دونوں کا خیال آیا۔ وہی جو ہر رات میرے بستر میں آ گھستے ہیں۔ پچھلی دو بے خواب راتوں کو یاد کر کے میں کانپ گئی۔

''بھئی، مجھے ذرا خواب آور گولیاں خرید وا دیجیے۔''

''اچھا؟ نئی جگہ نیند نہیں آتی ہوگی نا...'' انھوں نے کہا۔

''جی ہاں،'' میں نے بات بنائی۔ اب انھیں کیا بتاتی کہ میرے ساتھ ہر رات کیا ہوتا ہے!

آج کی رات ہوٹل میں اکیلے گذارنی ہے۔ کل کمرے میں حصہ بٹانے ایک دوسری مندوب آ جائیں گی۔ دونوں بدمعاش ہیولے شاید بھاگ جائیں — یہ جو کراچی سے بنا ٹکٹ اور ویزے کے میرے ساتھ لگے چلے آئے ہیں۔

ہم ایک کیمسٹ کی دکان پر رکے۔ دواؤں کی قیمت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ ''ارے یہ کیا؟ ایٹی وان کی چھ گولیاں تیس روپے کی؟''

''یہ فارن کا مال ہے۔''

''کیا؟ بنگلہ دیش میں دوائیں نہیں بنتیں؟''

''جی نہیں، بنگلہ دیش میں دوائیں نہیں ہیں۔ معمولی سی بیماری کی دوا بھی باہر سے آ رہی ہے۔ زندگی بچانے والی دواؤں کی تو بات ہی کیا ہے۔''

اس رات ہوٹل کے کمرے میں میرے بستر میں صرف ایک ہیولا سویا۔ ہمیشہ کی طرح پتھر کے بت کی مانند سخت، ساکت اور خاموش۔ سنتے ہو جی، میں نے اس سے کہا۔ یہ لوگ کیوں الگ ہو گئے ہم سے؟ اور انھیں کیا ملا؟ وہ یونہی خاموش لیٹا رہا۔ اسے شاید ان باتوں میں دلچسپی نہ تھی۔

آج مجھے ایک فرشتہ ملا، میں نے پھر کہا۔ (میں ہی تو بولتی رہتی ہوں۔ ایٹی وان نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔) اس نے مجھے بتایا کہ زندہ بہار لین واقعی ایک جگہ ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ تمھاری طرح یہ بھی میرے تخیل کی ایجاد ہوگی۔ میرا دماغ اب مجھ سے کرتب بازی کرنے لگا ہے نا، میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔

عمر ہوگئی نا بھئی، کیوں؟ عمراں لنگھیاں، وہ بے خیالی میں گنگنانے لگی۔

وہ خاموش رہا۔ اسی طرح چت لیٹا، سلگتی آنکھوں سے چھت کو تکتا رہا۔

مجھے بالکل کسی دوسرے خیال نے آن لیا۔ دراصل آج میں نے ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا۔ کرنل طاہر کا عدالت میں بیان ہم لوگوں نے نہیں چھاپا تھا۔ منظرنامے کو درست کرنے کے لیے میں نے منظر کو دوبارہ چھت پر پینٹ کیا۔ اب میں میزبان پروفیسر کے نندوئی کے گھر پھر بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔

فلم کو الٹا چلا کر اسی جگہ روکا جہاں میں نے یہ بیان دیا تھا کہ کرنل طاہر کا بیان ہم لوگوں نے چھاپا تھا۔ اب ڈھاکہ کا پنیر کھاتے ہوئے میں نندوئی صاحب سے کہہ رہی تھی:

''دراصل میں نے ابھی ابھی غلط بیانی سے کام لیا۔ کرنل طاہر کا مضمون ہمارے رقیب گروپ نے چھاپا تھا۔''

''کیا وہ دائیں بازو کا تھا؟''

''بالکل نہیں۔ ہمارے سیاسی نظریات میں سرِمو اختلاف نہ تھا۔ مگر گروپ دو تھے اور رقابت شدید...''

''دو گروپ کیوں تھے؟''

''دراصل اس گروپ کے سربراہ بہت بدمزاج تھے۔ قابلیت تو ان میں بہت تھی مگر نک چڑھے بھی تھے۔ اس لیے دوسرا، تیسرا اور متعدد گروپ بنتے گئے۔ تو جب ملک پر آفت ٹوٹی تو سب گروپ یکساں خطوط پر متوازی کام کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو حکومت کا یا سی آئی اے کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ دشمن سے بڑھ کر ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے تھے، تاکہ قابلِ گرفت نکتہ پکڑ کر ایک دوسرے کا پول کھول سکیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ترقی پسندی کی آڑ میں دوسرے گروہ عوام کی امنگوں کے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں کہ انھیں، یعنی دوسرے گروپوں کو، جتنی سزا دی جائے سو کم ہے۔''

''اتنا سا نکتہ بیان کرنے کے لیے آپ نے اس ملاقات کو جناتی طور پر دوبارہ وجود دیا؟''

میں نے سوچا... سچ پوچھیے تو سوچا تو کچھ بھی نہیں... لیکن کیا واقعی یہ چھوٹا سا جھوٹ تھا؟ بالکل غیر اہم؟ مگر مارشل لاء کے خلاف عوامی مزاحمت ایک بہت بڑی سچائی ہے۔ تمام بڑی بڑی سچائیاں چھوٹے چھوٹے غیر اہم جھوٹوں سے مل کر بنتی ہیں۔

کیا مطلب؟ تو پھر سچائی کہاں رہی؟

سو اپنی جگہ قائم و دائم رہتی ہے— کیونکہ وہ ہوتی ہے۔

اور جھوٹ؟

سو بھی اپنی جگہ قائم و دائم۔ عوامی مزاحمت کی سچائی ان تمام چھوٹے چھوٹے جھوٹوں کو سچ نہیں بنا سکتی۔

تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟

یہی تو پتہ نہیں۔

یہ کیسی تحقیق ہے جس کے مقصد کا علم تحقیق کے دوران ہوگا!

اب وہ پھر اپنے بستر میں واپس آ چکی تھی۔ اپنے ساتھ لیٹے ہیولے کا بدن پیار سے سہلا رہی تھی۔ سو جاؤ... اس نے کہا، اور خود بھی آنکھیں موند لیں۔

پل کے پل میں ساتھ لیٹے ہیولے کا چہرہ بند آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اب اس کے چہرے پر ایسا لطیف اور حسین تبسم تھا کہ وہ بے خود ہوگئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا کوئی مسکراہٹ اتنی حسین بھی ہوسکتی ہے؟ کسی چہرے پر تھکی ہوئی آنکھیں اتنی پُرسکون ہوسکتی ہیں؟ کیا وہ ان مسکراتے لبوں کو چوم نہیں سکتی؟ اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس چہرے کو کنول کی طرح ہاتھ میں لے لیا۔ مگر اس کے ہاتھ خالی رہ گئے۔ وہ چہرہ پگھل کر گرم پانی میں بہہ گیا۔

محبت تھی... بغیر کسی اجازت کے تھی۔ اپنے ہونے کا اعلان کرتی، ایک درد بن کر اس کے بھنچتے دل میں امنڈتی، پورے بدن میں لہریں لے رہی تھی۔ درد سے اس کا بدن ٹوٹا جا رہا تھا۔

روؤ مت، فہمیدہ ریاض! اس نے خود کو ڈانٹا۔ تم کیا چاہتی ہو؟

اس کے ہاتھوں میں اب دوسرے ہیولے کا چہرہ تھا، جو آج رات اس کے بستر میں سونے نہ جانے کیوں نہ آیا تھا۔ شاید اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کرنل طاہر کے عدالتی بیان کے سلسلے میں اپنا بیان بدلنے والی ہے۔

وہ روتے روتے ہنسنے لگی۔ دیکھو، تم میری جان ہو! ہونا مری جان؟ جان کے ٹکڑے! چندا ... اچھا، تو میرے اندر سما جاؤ۔

دماغ خراب ہوا ہے؟ میں تمھاری جنرلائزیشنز میں کیوں سماؤں؟ اور پھر، وہ بھی تو ہے۔

اس نے گردن موڑ کر دوسرے ہیولے کو دیکھا، جو اسی طرح پتھر کا بنا پڑا تھا۔

تب تمھارا وہ حال ہوگا کہ دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ کا۔

اخاہ! تین دن بعد یہ نام سننے کو ملا۔ مگر وہ مجھے کتا نہیں کہتے، کتیا کہتے ہیں۔ ہندوستانی کتیا۔ بلڈی انڈین بِچ... انگریزی میں کہتے ہیں۔ ہر روز ٹھیک شام کے چار بجے۔ بلاناغہ... جب وہ دفتر سے گھر لوٹتی ہے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔

لیکن اب وہ کسی یاد میں ڈوب چکی تھی، اور مسرت سے بے اختیار رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں پرجاتن ہوٹل کے اندھیرے کمرے میں تکیے میں گھٹ رہی تھیں۔ پہلی بات ہی آخری تھی۔ عورت حسرت سے ہاتھ ملتی رہ گئی۔

پہلی بات ہی آخری تھی
اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ہوئی کوئی بیل تھی جیسے
پورے گھر پر چڑھی نہیں
شام تھی نئی محبت کی
قرب کی ساعتِ حیراں میں

تنکوں کی ٹوپی اوڑھے بنگالی مولانا زور زور سے آیتیں پڑھ رہے تھے اور چار خانے کی لنگی میں بنگالی نما قنوجی عطر فروش، جن کی خشخشی ڈاڑھی تھی اور چہرہ پر ملکوتی تبسم۔ ہے تو... ہے تو... ہے تو... زندہ بہار لین...

یہ تبسم جو اس کے تصور کے اندر پیدا ہونے والے تصور میں، اس کے ساتھ لیٹے ہوئے پیکر کے چہرے پر منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے تمھیں مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا تم اسے جھٹلانا چاہتے ہو؟ میں تمھیں ایسا نہ کرنے دوں گی۔ کیا تم اس تبسم کے امکان کی نفی کرنا چاہتے ہو؟

یا یہ کوئی سراب ہے؟ اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ کوئی مغالطہ؟ نظر کا دھوکا، سراب، ہم جس کے پیچھے ہونکتی ہوئی دوڑ رہی ہیں؟

۱۵ دسمبر

میزبان پروفیسر اپنی پرانی ٹویوٹا میں مجھے ڈھاکہ یونیورسٹی لیے جا رہی تھیں... ڈھاکہ یونیورسٹی۔

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو تم کہاں تھیں؟

میں زندہ بہار لین میں نہیں تھی۔ وہاں سے ہزاروں میل دور لندن میں بی بی سی کی اردو سروس میں خبریں پڑھ رہی تھی۔

نو مہینے پہلے شیخ مجیب نے یک طرفہ آزادی کا اعلان کیا تھا۔ لندن میں رہنے والے پاکستانیوں میں سنسنی پھیل گئی تھی۔

اس رات، پروگرام کے بعد، بش ہاؤس سے چیرنگ کراس کے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے اس

نے ساتھی پروڈیوسر سے پوچھا تھا:

''اب کیا ہوگا؟''

ایک دلچسپ سوال! گویا کہانی سنی جا رہی تھی یا کوئی ڈراؤنی فلم دیکھ رہے تھے۔

''ہوگا کیا؟ اب ہوگا ایک بلڈ باتھ۔''

''نہیں...'' اس نے سہم کر کہا تھا۔

خبردار... آپ خبریں پڑھ رہی ہیں۔ آواز میں لرزش نہیں آنی چاہیے۔ اور نہ ہی بدن میں لرزش آنی چاہیے خبریں سنتے ہوئے۔

''یہ سامنے جو پارک ہے، اسے پہلے ریس کورس کہتے تھے۔ یہاں شیخ مجیب نے تقریریں کی تھیں اور یہیں...''

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو لندن میں اس کے پاکستانی دوست نے ٹیلیفون پر چیخ کر کہا تھا، ''ڈھاکہ فتح نہیں ہوگا۔ ہم ڈھاکہ کو اپنا آخری قلعہ بنا دیں گے۔ آخری چٹان!''

چند مہینے پہلے بنگالیوں کے قتلِ عام پر وہ بہت دکھی ہوا تھا، مگر جنگ کے ہسٹریا میں وہ نسیم حجازی کے ناول کا ہیرو بن چکا تھا۔ یہ کفر اور اسلام کی لڑائی تھی۔ ڈھاکہ دراصل غرناطہ تھا، اور وہ خود لندن میں نہیں بلکہ محاذِ جنگ پر تھا، اور دانتوں میں ڈاڑھیاں دبائے فوجی دستہ بن کر تلواریں سونتے آخری چٹان میں تبدیل ہو گیا تھا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس کی عمر کیا تھی؟ پورے چھبیس سال کی — عورت نما لڑکی، یا لڑکی نما عورت۔

اور پاکستان؟ وہ تو پچیس برس کا بھی نہ تھا۔

ٹھیک نو مہینے پہلے سہم کر ''نہیں'' کہنے کے بعد پھٹی پھٹی آنکھیں ٹیلیویژن پر نیوز ریل دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ڈھاکہ کو غیر ملکی صحافیوں سے خالی کرانے کا حکم جاری کر دیا گیا تھا۔ مگر آتے آتے وہ اپنے ساتھ کسی پیڑ کی اوٹ سے، کسی ہوٹل کی کھڑکی سے چھپ کر بنائی ہوئی فلمیں لیتے آئے تھے۔ اس رات بنگال کی کوکھ میں بیج پڑا تھا۔ نو مہینے بعد بنگلہ دیش نے جنم لیا۔ کیسا عجیب اتفاق!

پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی: پروفیسروں کو کہاں قطار میں کھڑا کر کے شوٹ کیا گیا تھا؟

سب سالے ہندو ہیں!

مگر وہ تو کل کی بات تھی۔ ایک کل جو بہت نزدیک تھا، اور بہت دور تھا۔ ایک ساری کی لمبان جتنا

دور۔ کیمپس پر بنگالی ناریاں شلوار قمیص میں گھوم رہی تھیں۔ آگے چل کر ڈھاکہ کی دکانوں میں اسے یہ سوٹ پنجابی کرتا اور پے زامہ کے نام سے فروخت ہوتے نظر آئیں گے۔

سیڑھیاں چڑھتے وہ انگریزی ادب کے شعبے کی طرف جا رہی تھیں۔ کیمپس کی دیواریں چاکنگ سے بھری پڑی تھیں۔ نہ جانے کیا لکھا ہے! اتنے دن ہندوستان میں رہنے کے بعد میں ہندی تو پڑھ سکتی تھی، لیکن فاصلے سے بالکل ہندی لگنے والی یہ بولی ذرا بھی ہندی نہ تھی۔ کچھ عجب پھول پتیوں کا سا رسم الخط تھا۔

''یہ کیا لکھا ہے؟'' میں نے ایک پوسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جس پر ایک مقتول لڑکے کی تصویر چھپی تھی۔

''لکھا ہے: نذرل کا قاتل کون ہے؟ اس لڑکے کو کیمپس پر گولی ماردی گئی۔ چند ہی دن پہلے کا واقعہ ہے۔ جبکہ یہ بیچارہ کیمپس پر تشدد کے خلاف تقریر کر رہا تھا۔''

''تو اسے کس نے مارا؟ دائیں بازو نے کہ بائیں بازو نے؟''

''کہا نہیں جا سکتا۔ آپ کے وہاں تو اتنا تشدد نہیں ہوتا ہوگا؟''

میں چپکے چپکے مسکرائی۔ ''آپ کے یہاں کلاشنکوف نہیں ہوتے؟''

''نہیں تو۔''

''ہمارے یہاں تو اب طلبا کے پاس کلاشنکوف ہی ہوتے ہیں۔ افغان مجاہدین نے روسیوں سے چھینے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں یہ الجھاؤ نہیں ہوتا کہ مرنے والے اور مارنے والے کا تعلق کس جماعت سے ہے۔ آپ کے یہاں بعض چیزوں پر عجب دھند چھائی ہوئی ہے۔ یہ تک کوئی وثوق سے نہیں بتا پا رہا کہ آخر کرنل طاہر کو کیوں پھانسی دی گئی۔''

''ان پر الزام تھا کہ وہ ایک اور فوجی انقلاب کا منصوبہ بنا رہے تھے۔''

''وہ تو میں جانتی ہوں۔ مگر ضیاء الرحمٰن کو تو وہی لائے تھے۔ ضیاء الرحمٰن سے ان کو کس بات پر اختلاف ہوا؟ کیا یہ الزام درست تھا؟''

''کہا نہیں جا سکتا۔''

بنگالی پروفیسر نہایت خوش خلقی سے میرا استقبال کر رہے تھے: پاکستانی مندوب! ایک پروفیسر کا نام کاشی ناتھ بھی تھا۔

''پروفیسر حق یہیں پڑھاتے ہیں؟''

جس رات میں میزبان پروفیسر کے گھر ٹھہری تھی، اور اپنے بستروں میں دو ہیولوں کی موجودگی کے باعث ساری رات سو نہ سکی تھی، میں نے کتابوں اور رسالوں کا جائزہ لیا تھا۔ لکھنے کی میز پر چند مہینے پرانا لنڈن میگزین پڑا تھا۔ اس میں ڈاکٹر حق کا ایک مضمون تھا: ''جرمن ادیب گنٹر گراس کی بنگلہ دیش آمد پر کچھ خیالات''۔ گنٹر گراس نے بنگالی ادیبوں سے کہا تھا، آپ اپنے چکما قبیلے پر کچھ کیوں نہیں لکھتے؟ ان کا قتل عام کیا گیا۔ یا پھر کیمپوں میں قید بہاریوں کے بارے میں؟

ڈاکٹر حق نے مغربی قارئین کو سمجھانے کے لیے لکھا تھا:

''یہ بہاری جو بنگلہ دیش بننے کے بعد سے ان دوزخ سے بدتر کیمپوں میں مقیم ہیں، دن بھر رینگنے والے کیڑوں کی طرح شہر میں روزگار حاصل کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں، اور رات پڑے جو کچھ مل سکے سمیٹ کر اپنے رہائشی سوراخوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔''

ان بظاہر درشت الفاظ میں دردمندی کا ایک ایسا امکان تھا جو خواہ کتنا ہی دوراز کار تھا لیکن پھر بھی، بس اسی ایک سہارے پر وہ پروفیسر حق سے ملنے کے لیے بیتاب ہو گئی تھی۔

''ابھی کلاس لے کر آتے ہوں گے۔''

تھوڑی دیر تک وہ بنگالی پروفیسروں سے مصنوعی قسم کی باتیں کرتی رہی— کیونکہ یہ سب کچھ ایک ڈراما تھا، گویا وہ کسی دوسرے ملک سے آئی تھی، گویا بنگالیوں کو اس کی مہمانداری بلکہ دلداری کرنی تھی۔ ایسا سب کہاں تھا؟ وہ ساری زندگی سے انھیں جانتی تھی، اور یہ سب ساری زندگی سے اسے جانتے تھے۔ اب تو وقت بس صرف کچھ کھری کھری سنانے کا تھا۔

تھوڑی دیر میں پروفیسر حق آ گئے۔

''میں نے آپ کا مضمون پڑھا تھا، لنڈن میگزین میں۔''

''اوہ!'' وہ کافی دوری کا لہجہ اختیار کر کے بولے۔ پھر خاموشی اور بے نیازی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

فہمیدہ ریاض کافی بور ہوئیں۔ اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہیں۔ خود کو برا بھلا کہا۔

کیا امید تھی تمھیں؟ یہ شخص فوراً کہے گا، کس قدر خوشی کی بات ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ نے

میرا مضمون پڑھا؟ آیئے، جھٹ پٹ مل کر بہاریوں کو نجات دلاتے ہیں۔

لوگ اپنے اپنے خیالوں میں ہیں۔ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیج کر پھر تھوڑی سی تسلی دی۔

لیکن وہ اپنے آپ کو زیادہ دیر تک ایسی گفتگو کرنے میں مصروف نہیں رکھ سکی جس میں اس کا لمحہ بھر کو دل نہیں لگ رہا تھا۔ دراصل ضروری بات پہلے کر لینی چاہیے، اس نے فیصلہ کیا، سو ابھی کیوں نہیں؟ لہٰذا:

''اور بہاری؟ آپ اُن کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟''

سب لوگ کچھ خاموش سے ہو گئے۔ پھر ایک نے کہا:

''اوہ... بات یہ ہے کہ وہ ہمارے معاشرے میں مدغم ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ آخر پاکستان انھیں بلا کیوں نہیں لیتا؟ ان کی حالت تو واقعی خراب ہے۔''

''حال ہی میں آپ کی وزیراعظم نے کوالالمپور میں جو بیان دیا ہے، اس کے بعد سے ان میں بہت غم وغصہ ہے۔ جب وہ یہاں آئیں تو بہاریوں کے لیڈر کو ان سے ملنے بھی نہیں دیا گیا۔''

تمام گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

''آپ وہاں جانا چاہتی ہیں؟ بہاریوں کے کیمپ میں؟''

''سوچ لیجیے۔ وہ مار پیٹ پر اتر سکتے ہیں، گر انھیں پتہ چلا کہ آپ پاکستانی ہیں۔''

ڈھاکہ: ٹویوٹا سے باہر

نرم ہوا، بادلوں بھرا آسمان، جیسے بہت سے اجلے بادبان کھلے ہوں اور ہوا کے زور سے اڑتے جاتے ہوں، اور نیچے سرمئی بہتے ہوئے سیال پر نوکاؤں کا جمگھٹ۔ سجی سجائی نوکائیں، ایک دوسرے کو دھکیلتی، ناز سے ہر سمت بہہ رہی تھیں۔ ان کے سارنگ جلدی جلدی پتواریں چلا رہے تھے۔

کتنا ٹکا؟ چار ٹکا؟ دوشی ٹکا؟ چولبو؟ چولبونا؟

ارے دھیرے دھیرے...

''کہاں چلیے گا؟'' خلیق الرحمٰن مجھ سے انگریزی میں پوچھتے ہیں۔

کیونکہ دراصل یہ نوکائیں نہیں تھیں، ہاتھ رکشائیں تھیں، جیسی ہندوستان میں اب بھی چلتی ہیں، گو بڑے شہروں کی مرکزی شاہراہوں پر نظر نہیں آتیں۔ پر بنگلہ دیش کے دارالحکومت کی سڑکوں پر ہر سمت نظر آ

سکتی تھیں —— سجی سجائی اور صاف ستھری۔ چار خانے کی لنگیوں پر سویٹر پہنے ننگے پاؤں بنگالی اپنی گوشت سے عاری ٹانگوں سے جلدی جلدی چلا رہے تھے۔ بار بار دھونے سے جھینی پڑی لنگیاں ان کی ٹانگوں کی ساخت چھپا نہ پاتی تھیں۔ ایسی ہی زمینی نوکا پر وہ سوار تھے، جو تیرتی جا رہی تھی۔

''کہاں چلیں؟'' خلیق الرحمٰن اس سے پوچھ رہے تھے۔ وہ اس پاکستانی مہمان کو ڈھاکہ گھمانے کے لیے تیار تھے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ادب میں پروفیسر خلیق الرحمٰن ہی نے کہا تھا، ''بہاری... وہ ہمارے معاشرے میں ضم ہو جانے پر تیار نہیں۔''

ڈھاکہ یونیورسٹی پیچھے چھوٹتی جا رہی تھی۔

میں نے ان سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ نیل کھیت کا علاقہ ہے؟ بلڈنگ نمبر ۲۳، اقبال ہال، جگن ناتھ ہال، آزاد ہال، کیا اب بھی موجود ہیں؟ کون سی رات کو یہاں حملہ ہوا تھا؟ اگر میں پوچھتی تو مجھے یقین ہے وہ سب آناً فاناً بول اٹھتے، ''۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات۔''

تاریخیں بنگالیوں کے دماغوں پر کس طرح صاف صاف کھرچی ہوئی ہیں۔ رکشا کا سارنگ بھی اہم واقعات کی تاریخ فوراً بتا سکتا ہے۔

صرف اٹھارہ برس ہی تو گزرے ہیں ابھی!

اٹھارہ طوفانی برس —— اتنے مختصر اور اتنے طویل۔

اس کے لیے اپنے ذہن میں اٹھارہ برس سمٹ رہے تھے۔ جس وقت سے اس نے ڈھاکہ کی زمین پر پیر دھرا تھا، بیتے برس ہوا میں پھڑ پھڑاتے اڑ گئے تھے۔ وہ کہیں بہت دور بی بی سی کی کینٹین میں بیٹھی تھی۔ یادداشت کی گہری قبر سے نکل کر مردے زندہ ہو رہے تھے۔ ایک ایک نیوز بلیٹن صاف یاد آ رہی تھی، ایک ایک نیوز ریل۔

اجتماعی قبریں کہاں کھودی گئی تھیں؟ قبروں سے نکلا ہوا کسی مقتول کا پیر، کسی ہاتھ کی انگلیاں... مدتوں میری فائل میں مختلف رسالوں سے کاٹی ہوئی دو تصویریں پڑی رہی تھیں۔ ان کی تاریخیں بھی الگ الگ تھیں۔

پہلی تصویر ڈھاکہ کے کسی بازار کی تھی، جہاں اچانک فائرنگ کی گئی تھی۔ سڑک پر اِدھر اُدھر لاشیں بکھری تھیں۔ ایک ہاتھ رکشا پر رکشا کا سارنگ مردہ پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ گردن ایک

طرف موڑ رکھی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہا ہے۔ صرف اس کی ٹانگیں اس کی لنگی سے اس طرح باہر نکلی ہوئی تھیں، جیسے کسی سوتے ہوئے آدمی کی نہیں ہوسکتیں۔ کالی کالی، سوکھی ہوئی ٹانگیں، اوپر کی طرف، ایک ناقابلِ بیان جنسی گستاخی سے نکلی تھیں، جیسے ہوا میں گھسیڑ دی گئی ہوں۔

ان سانولے دبلے جسموں میں افزائش کے جرثومے کس قدر بے قرار رہتے رہیں۔ سڑک پر اَن گنت عورتیں پورے دن کا پیٹ لیے گھوم رہی تھیں۔ میزبان پروفیسر کے گھر بھی تو... وہ عورت جو چپاتیاں ڈالنے آئی تھی، سر پر ساری کا پلّو، ننگے پیر...

''تمار نام کی؟''

''مومنہ بیگم۔''

''اور تمار؟'' میں نے دوسرے ننگے پیر سولہ سترہ سالہ لڑکے سے پوچھا تھا۔

''کوبیر حوسن۔''

کتنے لوگوں کا نام یہاں کبیر ہے! ہمارے رکشا والے کا نام بھی کبیر تھا۔ شاید تصویر میں مردہ رکشا والا بھی کبیر تھا۔

اور دوسری تصویر ... دوسری تصویر چند مہینوں بعد کھینچی گئی تھی۔ سفید و سیاہ تصویر سے معلوم نہ ہوسکتا تھا کہ یہ جنگل ہے یا کوئی گاؤں۔ گھنے پیڑوں کے پس منظر میں کچھ بنگالی کھڑے تھے۔ تصویر کھنچوانے کے لیے وہ سب کیمرے کی طرف منھ کیے مسکرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ ایک بہاری کا، یا کسی غیر بنگالی کا، سر تھا۔ جس لڑکے نے یہ سر پکڑ رکھا تھا، اس کے چہرے پر ایسی خوش باشی کی ہنسی تھی جیسے اس کے ہاتھ میں آدمی کا کٹا ہوا سر نہیں، کوئی بڑی سی مچھلی ہو، جسے اس نے ابھی ابھی دریا سے پکڑا ہو۔ بہاری، یا غیر بنگالی، کا بقیہ دھڑ سامنے زمین پر پڑا تھا۔

سڑک پر جگہ جگہ جلسے ہو رہے تھے۔ لڑکوں کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں بنگلہ دیش کا سبز سنہرا پرچم لہراتی نکل رہی تھیں۔ چند ایک کے ساتھ بینڈ بھی تھے۔ بنگالی قومی نغموں کے ٹیپ بج رہے تھے۔ یہ سب کل کی تیاری میں۔

ہماری رکشا ان سے بچتی بچاتی رواں تھی۔

''یہ جو سامنے آپ دیکھ رہی ہیں نا، یونیورسٹی سے ذرا آگے پختہ زمین کا تکونا ٹکڑا، یہ ہمارا چھوٹا موٹا

ہائیڈ پارک ہے۔ یہاں ہر قسم کی سیاسی تقریریں ہوتی ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا،'' کیا کہتے ہیں اسے؟''

'' کچھ خاص نام تو نہیں، سوڑک دیپ کہہ دیتے ہیں۔ دیپ یعنی جزیرہ، جیسے مالدیپ۔''

اسے یاد آ رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ بہاریوں سے بھرا ایک جہاز جو پاکستان پہنچا تو سب کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ کسی نے بتایا تھا، بنگالی ڈاکٹروں نے سرنجوں سے بہاریوں کا خون نکال کر بالٹیاں بھر لی تھیں۔ کہتے تھے، ہمارا خون چوستے تھے شالے!

پتہ نہیں ان سب باتوں میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ تھا؛ لیکن اہم بات یہ تھی کہ ان تمام دعووں میں تھوڑا بہت سچ ہونا ناممکن نہیں تھا... کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔

ہندوستان میں وہ اپنے بہاری دوستوں سے مذاق کرتے تھے: نہ کھپن بہاری... بہاری نہیں چاہییں۔ ہمارے سندھ کی دیواروں پر تو یہی لکھا ہوتا ہے۔

اسے سندھیوں کے پریشان چہرے یاد آئے۔ ارے بابا، یہ کیا جزا ہمارے اوپر نازل ہو رہی ہے؟ الشمس اور البدر کے تربیت یافتہ یہ لوگ اب ہمارے ساتھ بھی وہی کریں گے جو انھوں نے بنگالیوں کے ساتھ کیا۔

اور جو بنگالیوں نے ان کے ساتھ کیا، اس نے چپکے سے اضافہ کیا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بنگال سے آنے والے بہاریوں کے ہاتھوں کراچی میں چند انتہائی سفاکانہ واقعات واقع ہوئے۔ ایک مشہور واقعہ تھا کہ ایک بچی کو اغوا کر کے، یرغمال بنا کے، چند لڑکوں نے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا۔ اخباروں میں کئی دن اس واقعے کا چرچا رہا تھا۔ یہ بہاری لڑکے تھے، اور بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بنگال میں ان کا تعلق الشمس اور البدر کی تنظیموں سے رہا تھا۔

''اور یہ جو آپ کہتے ہیں...'' میں نے چلتی ہوئی رکشا میں سوچتے ہوئے کہا،'' کہ بھئی،، معاشرے میں ضم ہونے پر تیار نہیں، تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ معاشرے میں مختلف اکائیاں وجود کیوں نہیں رکھ سکتیں؟ ضم ہونا کیوں ضروری ہے؟ آپ سب کو ہتھوڑے سے ٹھونک پیٹ کر ایک جیسا بنانے پر آخر کیوں مُصر ہیں؟ آخر معاشرہ تو ایک متنوع چیز کا نام ہے۔''

پروفیسر خلیق دلچسپی سے میری بات سن رہے تھے۔''یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔''

''اب آپ کے یہاں ہندو پروفیسر ہیں مگر ایک بھی بہاری پروفیسر نہیں۔''

یہ تم کہہ رہی ہو فہمیدہ؟ تم؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ اس کے کانوں میں مشین گنوں کی تڑتڑتڑ گونج رہی تھی۔ پروفیسر کاشی ناتھ، فائرنگ اسکواڈ کے سامنے...

''مذہب ایک کافی مضبوط سمبندھ ہوتا ہے پروفیسر خلیق!'' اس نے گردن موڑ کر پروفیسر خلیق کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، اب یہ جو میں اس رکشا میں آپ کے ساتھ ٹھنسی بیٹھی ہوں تو یوں ہی تو نہیں۔ آپ مسلمان ہیں اور میں بھی مسلمان ہوں۔ یہ رکشا والا بھی مسلمان ہے۔ الحمدللہ...

پروفیسر خلیق اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''آف کورس،'' انھوں نے کہا۔ شاید وہ اس کے درد بھرے لہجے سے کافی متاثر ہو گئے تھے۔

فہمیدہ ریاض خاموشی سے سر کھجانے لگیں۔ وہ اپنی کہی ہوئی بات کے اَن کہے مضمرات کی حماقت افروزی پر خاصی شرمندہ تھیں۔ لیکن یہاں صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔

مذہب ایک کافی مضبوط سمبندھ ہوتا ہے پروفیسر خلیق! یہ جملہ اس نے واقعی ٹوٹے ہوئے دل سے کہا تھا۔ بنگالیوں کے لیے بہاریوں کو قابلِ قبول بنانے کی خاطر کوئی بھی جواز جائز ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں تو مذہب جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔

(تنکے کا سہارا! افوہ، اسلام کو تنکے کا سا سہارا کہہ رہی ہیں آپ؟ اس کے دل میں کوئی حیرت سے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ پتہ چل جائے ہمارے اسلام پسندوں کو تو آپ کی کھال ادھیڑ دی جائے!)

تنکے کا سا سہارا بن کر اسے مذہب بالکل ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے مسلم تشخص پر خوش تھی اور مُصر بھی۔ حالانکہ فہمیدہ کسی بنگالن کا نام نہیں ہوتا، کیونکہ یہ فارسی کا لفظ ہے مگر اس کے ساتھ جو 'ریاض' لگا تھا، وہ یہاں عام تھا۔

ہر آتے جاتے کو وہ چھوٹتے ہی 'السلام علیکم' کر رہی تھی۔ پاکستان میں یہی آداب پھاوڑے سے لگتے تھے۔ وہ 'آداب' کہنے کو ترجیح دیتی تھی جو ایک غیر مذہبی سلام تھا۔

مگر بنگالیوں کے ساتھ یہی تو اس کا مضبوط سمبندھ تھا— یا ایسا سمبندھ جسے وہ مضبوط سمجھنا چاہتی تھی۔

اسے فوراً بحث میں الجھ جانے کی عادت تھی۔ اس سے جہاں وہ کافی لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت بور بن چکی تھی، وہاں فائدہ یہ تھا کہ اسے نت نئے نقطۂ نظر معلوم ہوتے تھے۔ اس پر حیرت انگیز انکشافات

ہوتے۔ آدمی ششدر رہ سکتا ہے۔ مختلف مقامات پر کھڑے ہوکر، ایک ہی چیز کو دیکھا جائے تو مختلف زاویوں کے باعث وہ کیا سے کیا نظر آتی ہے!

تو پھر...؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اس کی اصل حقیقت؟

شاید ان زاویوں کا مجموعہ ہی شے کی حقیقت ہے۔ لیکن یہ ایک دوسرے میں جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ مثلاً ہماری عقلمندی اور ناسمجھی، ہماری ہوشمندی اور ہمارے جنون، یا ہماری پوری بینائی اور ہمارا جزوی اندھاپن!

رکشا میں بیٹھے بیٹھے اسے جزوی اندھے پن کا خیال اس بات سے آرہا تھا کہ اسے بہاریوں اور بنگال کے تناظر میں مذہب کے سوا اور کوئی بات سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، صرف ایک پہلو کے سوا دوسرا پہلو سوجھتا تک نہیں۔ جان بچانے کی خاطر۔ محفوظ محسوس کرنے کے لیے۔ ترقی کے لیے۔ دولت کمانے کے لیے۔

''بہاری پروفیسر تو تھے، لیکن وہ تو فوراً ہی پاکستان چلے گئے تھے۔ بس غریب غربا رہ گئے۔ تمام بہاری کیمپوں میں تو نہیں ہیں۔ کافی اِدھر اُدھر بھی رہتے ہیں۔ ان کے خلاف تو اب کوئی تعصب نہیں ہے۔ ان کی نئی نسل تو بنگالی بھی خوب بول لیتی ہے۔ کیمپ میں رہنے والے کافی بہاری دن میں باہر کام کرتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان، جو بنگالی بول سکتے ہیں۔ زیادہ تر رکشا چلاتے ہیں۔

''کیمپ میں رہنے والے بہاریوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو پاکستانی کہتے ہیں۔ انھوں نے بنگلہ دیشی شہریت لینے سے انکار کر دیا ہے۔''

''ان کیمپوں میں کئی بار آگ بھی لگی؟''

''ہاں...'' پروفیسر خلیق نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا، ''لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آگ بھی ان کے لیڈر خود ہی لگا لیتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''بیرونی دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے...'' پھر انھوں نے جلدی سے اضافہ کیا، ''یہ خیال، دراصل اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ ان حادثات میں کوئی جانی نقصان کبھی نہیں ہوا۔ اور مالی نقصان، سو جو چیزیں جل کر راکھ ہو گئیں ان کی مالیت کا تو کچھ بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ آف کورس، یہ خیال

غلط بھی ہوسکتا ہے۔''

جتنی تفصیلات میں جائیں گی، اور تفصیلات جنم لیں گی۔ جتنی باریکیاں دیکھیں گی، مزید باریکیاں نظر آئیں گی۔

جتنا چھانو گی اتنا کرکرا ہوگا، بزرگوں نے قبروں سے سر نکال کر کہا اور پھر غڑاپ سے اپنی قبروں کے لحافوں میں دبک گئے۔

۱۶ دسمبر

صبح کا اعلان سڑکوں پر گزرتے بینڈ باجوں نے کیا۔

لاؤڈ اسپیکر پر قومی ترانہ بج رہا تھا: 'امار شونار بنگلہ دیش'۔

ڈھاکہ اپنا اٹھارواں یومِ آزادی منا رہا تھا۔

وہ ٹھوڑی ہاتھوں کے حلقے میں لیے گم سم بیٹھی تھی۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا۔ سڑک رنگ برنگی جھنڈیوں سے راتوں رات سجا دی گئی تھی۔

وہ کسی خواب میں چلتی ہوئی تیار ہو رہی تھی، جیسے وہ اپنا آپ نہ تھی، کوئی اور تھی۔ برسوں پہلے... برسوں پہلے... انھیں کیا خبر ہوگی! چلو اچھا ہی ہے، یہ سب کچھ یوں دیکھنا، جیسے تم اپنا آپ نہ ہو، کوئی اور ہو۔

پرجاتن ہوٹل کے استقبالیے میں، میز پر تازہ اخبار اور رسالے، یومِ آزادی کے خصوصی ضمیمے پڑے تھے۔ اس نے جھجکتے ہوئے انھیں چھوا، اور ورق پلٹنے لگی۔

''سولہ دسمبر ایک ایسا دن ہے جس نے عالمِ انسانیت کی ابدی آرزو، آزادی، کو ایک نئے سورج کی روشنی دی ہے۔ اٹھارہ برس پہلے آج کے دن ایک خوفناک، ہتھیار بند فوج نے آزادی کے مزاحمتی دستوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ وہ بھیانک مہینے جب پوری قوم نے آزادی کے لیے اپنے خون پسینے اور آنسوؤں کی بے مثال اور لازوال قربانی دی تھی۔ ہمارے یومِ آزادی نے پوری انسانیت کا سر بلند کر دیا ہے۔''

(نیو نیشن کا اداریہ)

وہ یہ سب کچھ پڑھ رہی تھی اور ہر سطر کے ساتھ دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ چوری چوری پڑھ رہی ہے۔ کچھ عجیب سا احساس، جیسے کچھ باتیں صرف پوشیدہ طور پر سوچی

جاتی ہیں، ایسی باتیں کوئی سچ مچ لکھتا تھوڑا ہی ہے۔لیکن یہاں تو سچ مچ... سارا بلیک اور وائٹ میں...
اس نے جلدی سے اخبار بند کر دیا، اور دوسرا اخبار کھولا۔ یہ اداریہ کچھ بہتر تھا، کافی معیاری قسم کا اداریہ، جیسا کہ خود اس کے اپنے ملک میں یوم آزادی پر لکھا جاتا تھا۔

''آج قوم اٹھارواں یوم آزادی منا رہی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی اقتصادی حالت بہتر بنائیں، جمہوری اداروں کو مضبوط کریں، ملک میں سماجی انصاف لائیں، اور جہالت اور پس ماندگی اور آبادی میں بے حد خطرناک شرحِ اضافہ پر قابو پائیں۔ ابھی گذشتہ برس سیلاب نے ملک میں تباہی پھیلا دی تھی۔ بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔''

(بنگلہ دیش ٹائمز کا اداریہ)

ہفت روزہ ہالیڈے کا اداریہ بھی خطرناک تھا۔ بنگلہ دیش کی سیاست پر سخت تنقید بھی تھی۔ رسالوں میں ضمیمے۔ ایک کے سرورق پر صدر ارشاد کی تصویر: 'ارشاد دی پوئٹ'۔ وہ چپکے سے مسکرائی۔ سارا رسالہ ان کی شاعری سے بھرا تھا، جو بہت بُری تھی۔ ایک صفحے پر لکھا تھا: 'دوسرے شاعر'۔ وہ خوب ہنسی۔
پھر اچانک ہفت روزہ ڈھاکہ کورئیر میں دو تصویروں پر اس کی نگاہیں جم گئیں: ایک صاحبہ جو چشمہ لگائے، کسی کالج کی پروفیسر لگ رہی تھیں، اور ایک سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا جس کے بدن سے ابھی بچپن کی چربی بھی نہ چھُٹی تھی، بچوں کی سی معصومیت سے ہنس رہا تھا۔ نیچے لکھا تھا: ''مادام جہاں آرا کی ڈائری۔ یوم آزادی کے موقعے پر ہم شہید ناصر کی ماں کی ڈائری سے اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔''
دوسرے لمحے سب کچھ بھول کر فہمیدہ ریاض اس ڈائری میں ڈوب چکی تھیں۔

اتوار ۲۹ اگست ۱۹۷۱ء:

میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اچانک دروازے پر زور کی دستک اور لوگوں کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یا اللہ! پوری سڑک فوجیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں رومی کے کمرے کی طرف دوڑی۔ چاروں لڑکے دم بخود کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ رومی نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا:
''لگتا ہے ہم بچ کر نکل نہیں سکیں گے۔ کئی سو فوجی ہیں اور روشنی اتنی تیز ہے کہ بلّی بھی بھاگے تو نظر آ جائے۔''

دروازے پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں گھبرائی ہوئی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ رومی کو نکالنے کا کوئی راستہ نظر آ جائے۔ دروازے پر چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے شریف کی طرف دیکھا۔ ''جا کر پوچھتے ہیں، یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔''

ہم دونوں مشرقی برآمدے میں آئے۔ شریف نے بلند آواز سے پوچھا، ''کون ہے؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

کسی نے سخت آواز میں اردو میں کہا، ''دروازہ کھول دو۔''

شریف نے کہا، ''اتنی رات گئے آپ کیا چاہتے ہیں؟''

اس دفعہ کسی نے کچھ نرم لہجے میں کہا، ''مہربانی کر کے دروازہ کھول دیجیے۔ ہم بتا دیں گے کہ ہمیں کیا چاہیے۔''

میں اور شریف نیچے گئے۔ ہم نے دروازہ کھول دیا۔

ایک بالکل نوعمر فوجی افسر چند فوجیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ افسر نے اپنا تعارف کرایا، ''میں کیپٹن قیوم ہوں۔ ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ یہاں کون کون رہتا ہے؟''

میں نے کہا، ''میرے شوہر، خسر، دو بیٹے، میرا بھانجا اور میں۔''

''آپ کے بیٹوں کے نام؟''

''رومی اور جامی۔''

کیپٹن قیوم کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا؛ گورا، دبلا پتلا اور نرم آواز۔ پل بھر میں فوجی سارے گھر میں پھیل چکے تھے، ایک ایک کونا چھان رہے تھے۔ تمام الماریاں، ایک ایک دروازہ کھول کر دیکھ رہے تھے۔ وہ بابا کے کمرے میں دبے پاؤں گئے اور انھیں نہیں جگایا۔

رومی، جامی، چندا اور معصوم سے باتیں کرنے کے بعد انھوں نے چاروں کو نیچے جانے کے لیے کہا۔

میں نے گھبرا کر کیپٹن قیوم سے پوچھا ''کیوں؟ آپ انھیں نیچے کیوں لے جا رہے ہیں؟''

کیپٹن قیوم نے جواب دیا، ''بس تھوڑی سی پوچھ گچھ کریں گے۔''

پھر انھوں نے شریف سے کہا، ''آپ بھی ذرا نیچے آئیں گے۔''

بدھ یکم ستمبر ۱۹۷۱ء:

شریف زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ انھوں نے بہت مختصر لفظوں میں جو کچھ ہوا تھا وہ کہہ سنایا۔ تفصیلات تو میں نے جامی اور معصوم سے معلوم کیں۔

اس رات چاروں کو پہلے بڑی سڑک تک پیدل لایا گیا۔ وہاں کئی جیپیں اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فوجی بھی وہیں جمع ہو گئے تھے۔ کیپٹن قیوم نے ایک جیپ کے پاس جا کر سرگوشی کی۔ واپس آ

کر اس نے رومی سے کہا،''تم میرے ساتھ جیپ میں آ جاؤ۔'' جامی، معصوم اور شریف سے اس نے کہا کہ وہ شریف کی کار میں جیپ کے پیچھے پیچھے آ جائیں۔ شریف کی کار میں ایک فوجی بھی بیٹھ گیا۔ دوسری گاڑیاں ان کے ساتھ تھیں۔ وہ ایم پی اے ہاسٹل گئے، جہاں انھیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا، اور جیپ کی ہیڈ لائٹ روشن کر دی گئی۔ ایک آرمی افسر نے آگے بڑھ کر پوچھا،''رومی کون ہے؟'' جب رومی کی دوبارہ شناخت کرائی گئی تو انھیں برآمدے میں کھڑے ہونے کے لیے کہا گیا۔ ان چند نایاب لمحوں میں رومی نے سرگوشی میں کہا'' تم ہرگز کچھ نہیں بتاؤ گے۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ نہ میں نے تمھیں کچھ بتایا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد رومی کو ان سے علیحدہ کر لیا گیا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے گئے۔ شریف اور دوسرے لڑکوں کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا، جہاں انھیں زمین پر اکڑوں بٹھا دیا گیا۔

پھر اذیت دینی شروع کی گئی۔ ان سے پوچھا جا رہا تھا کہ ہتھیار کہاں چھپائے ہیں، انھوں نے تربیت کہاں سے لی ہے۔ پھر مارنا شروع کیا گیا۔ بوٹوں سے سینے اور پیٹ پر ٹھوکریں لگائی گئیں۔ لکڑی کے ڈنڈوں، رائفل کے دستوں، بانس اور لوہے کی زنجیروں سے ضربیں لگائی گئیں۔ انھیں سینے کے بل لٹایا گیا اور فوجی ان کے اوپر چلنے لگے۔ اذیت دینے والے اس بات میں کافی لطف محسوس کرتے جب ان کی کہنیاں، کلائیاں اور گھٹنے مروڑے جاتے۔ برابر کے کمرے میں اسی طرح کی اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔

چاروں طرف دلخراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ اذیت دینے والے انھیں گالیاں بھی دیتے جا رہے تھے اور لطف لے رہے تھے۔ اگر کوئی بے ہوش ہو جاتا تو اس کے چہرے پر پانی چھڑکتے۔ ہوش میں آتے ہی دوبارہ اذیت دینی شروع کر دیتے۔

دوسری صبح انھیں دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ کوئی چھ فٹ چوڑے اور آٹھ فٹ لمبے کمرے میں بہت سے لوگ فرش پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ جلد ہی انھوں نے ایک دوسرے کو پہچاننا شروع کیا۔ جیسے ہی سنتری نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا، لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ الطاف محمود اور ان کے چاروں نسبتی بھائی، آرٹسٹ علوی، شریف کے دوست منان کے دو نسبتی بھائی رسول اور ناصر، آزاد، جیوئل، حنیف جو ٹی وی کے موسیقار ہیں، مارننگ نیوز کا رپورٹر بشر اللہ اور نیون سائن کمپنی کے مالک قمر اور بہت سے دوسرے لوگ۔

الطاف محمود کی قمیص خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے نتھنوں اور ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا۔ آنکھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ بشر اللہ کی کلائی فریکچر ہو گئی تھی۔ اسے رومال سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ حفیظ کے ہونٹوں کے چاروں طرف بھی خون جما ہوا تھا۔ جیوئل

کی انگلی ٹوٹ گئی تھی۔

بدھ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء:
آج سے پورے تیس دن پہلے وہ رومی کو لے گئے تھے۔ اتنے دنوں میں میرے پاس اس کی کوئی خبر نہیں پہنچی۔ اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔

جمعہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء:
کل جو دوائیں خریدی تھیں آج ان کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنا لیے ہیں۔ آزادی کی جنگ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے لڑکوں کو ان دواؤں کی ضرورت ہے۔ میں پیکٹ تیار رکھتی ہوں۔ جب موقع لگے، کسی نہ کسی کے ہاتھ بھیج دیتی ہوں۔ ممکن ہو تو کچھ رقم بھی۔

جمعہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۱ء:
ساٹھ راتوں پہلے وہ میرے رومی کو لے گئے تھے۔

منگل ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء:
ہندوستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے بار بار یہ خبر پڑھی۔ ۶ دسمبر کے روزنامہ اتفاق میں چھپی ہے۔ آنسو بہہ کر رخساروں سے گرتے جا رہے ہیں۔ اس وقت میرا رومی کہاں ہے؟ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ اسے لے جایا گیا تھا۔ کیا انھوں نے اسے مار ڈالا؟
مامون محمود، عبدالمجید، شمس الحق، الطاف محمود، جہانگیر، بودیز، جیوئل، آزاد، بشر، باقر، سب نے جان کی بازی کھیلی تھی۔ آج وہ کہاں ہیں؟ جہاں بھی ہوں، کیا انھوں نے ریڈیو پر یہ خبر سنی؟ کیا آج کا اخبار دیکھا؟ کیا انھیں معلوم ہے کہ کم از کم دنیا کے ایک ملک نے تو بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا؟ اخبار میرے آنسوؤں سے پورا بھیگ گیا ہے۔

منگل ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء:
آج صبح شریف کو گھر لے آیا گیا۔ منظور اور مکی بہت دشواری سے ایک پک اَپ کا انتظام کر کے نعش کو گھر لائے۔

آج صبح آسمان پر زیادہ جنگی جہاز نظر نہیں آئے۔ کرفیو تو نہیں اٹھایا گیا، لیکن جب پڑوسیوں کو معلوم ہوا کہ شریف نہیں رہے، تو وہ ہمارے گھر آنے لگے۔

جمعرات ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء:
آل انڈیا ریڈیو نے کہا ہے کہ تین بجے تک جنگ بند رہے گی۔ دوپہر سے شہر میں ہلچل مچی ہے۔ کہتے ہیں، پاکستانیوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کرفیو توڑ کر لوگ سڑکوں پر امڈ آئے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں۔ فوجی اور بہاری چھپنے کی جگہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور بھاگتے ہوئے اِدھر اُدھر گولیاں چلا کر بنگالیوں کو مار رہے ہیں۔ منظور اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ گاڑی میں آیا۔ بونیٹ پر بنگلہ دیش کا پرچم لگایا تھا۔ بعد میں بادشاہ بھی آیا۔ بتا رہا تھا کہ عزیز موٹرز کے مالک نے فائرنگ کر کے بہت سے بنگالیوں کو ہلاک کر دیا۔
منظور نے مجھے بھی ایک پرچم دیا۔ ''جیسے ہی ہتھیار ڈالے جائیں، اسے لہرا دینا'' اس نے مجھ سے کہا۔
(ہفت روزہ ڈھاکہ کورئیر میں خصوصی اقتباسات صفحہ ۲۱)

وہ گم سم ورقے پلٹتی رہی۔ ایک اور مضمون کی سرخی نے اس کی توجہ کھینچی،
''۱۹۷۱ء کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟''
اس نے پڑھنا شروع کیا، کسی معمول کی طرح جو کسی عمل کے اثر میں ہو۔

''یوم آزادی کے موقعے پر ہمارے خصوصی سروے میں ۲۲ سے ۱۸ سال تک کے نوجوانوں سے ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے بارے میں سوال کیے گئے جو یونیورسٹی اور کالجوں کے طالب علم ہیں۔ کوئی بھی تمام سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ایسا کوئی سوال نہیں جس کا صحیح جواب سب نے دیا ہو۔
''ایک لڑکے نے بتایا کہ پاکستانی فوج نے ضیاء الرحمٰن کے آگے ہتھیار ڈالے تھے، جبکہ دوسرے نے کہا کہ جنگ کے دوران بھاشانی چین میں رہ رہے تھے۔
''یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ نئی نسل، جسے قوم کا مستقبل کہا جاتا ہے، اپنی تاریخ اور جڑوں کے بارے میں قابلِ رحم حد تک نابلد ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کا ذکر روزانہ پابندی سے کیا جاتا ہے، لیکن اس کی اہمیت محض آرائشی اور سطحی لفظوں سے بڑھ کر نہیں رہ گئی۔''

(ڈھاکہ کورئیر، صفحہ ۱۷)

برٹش کاؤنسل کی لان پر اسے پروفیسر خلیق مل گئے۔

''میں سوچ رہی تھی، پتہ نہیں آپ آئیں کہ نہ آئیں،'' اُس نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں، میں نے تو وعدہ کیا تھا'' وہ مسکرائے۔

''کہاں چلیں؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میرے خیال میں پہلے تو محمد پور کیمپ ہی چلتے ہیں، کیونکہ بعد میں اُدھر جانا مشکل ہو جائے گا۔ جلوس نکل رہے ہیں۔''

وہ جھٹ پٹ ایک نوکا پر سوار ہو گئے۔

ہر طرف جلوس... نوجوانوں کی، بوڑھوں بچوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں پرچم لہراتی ہر طرف رواں دواں تھیں۔ سڑک پر پیاؤ لگے تھے۔ کچھ جلوس ایسے بھی تھے جن میں شامل لوگ شیخ مجیب کی تصویریں اٹھائے ہوئے تھے۔

''یہ عوامی لیگ کے جلوس ہیں،'' پروفیسر خلیق نے بتایا۔

فہمیدہ ریاض نے صاف صاف محسوس کیا، بنگالی نعروں کے اس ریلے میں پروفیسر خلیق کا انگریزی کا جملہ ایک ایسی ڈور تھی جسے وہ مضبوطی سے تھامے رہنا چاہتی تھی۔

ایکا ایکی ان کی رکشا ایک بڑے ازدحام میں پھنس گئی۔ یہ ہجوم، جو دراصل بڑا جلوس تھا، پُرجوش نعرے لگا رہا تھا۔ جلوس کے وسط میں ایک ٹرک پر جنرل یحییٰ کا پتلا نصب تھا۔ خوفناک چہرے پر دو بڑے بڑے ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دانت بھی بنا دیے گئے تھے۔ ٹرک پر سوار ہنستے ہوئے نوجوانوں کا گروہ پتلے کی ایسی جوتا کاری کر رہا تھا کہ وہ بار بار گر جاتا تھا۔ پھر اسے ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا جاتا۔

فہمیدہ ریاض، منھ پر گھبرائی ہوئی مسکراہٹ لیے، کچھ محظوظ، مگر زیادہ خوفزدہ، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک دل کہتا، یا خدا، تو نے مجھے یہ منظر بھی دکھا دیا! اور دوسرا دل کہہ رہا تھا کہ بھاگ چل بچّو! تمھیں پاکستانی شناخت کر کے یہ ہجوم کہیں ابھی تمھاری تکا بوٹی نہ کر دے۔ نہ جانے کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو اس بات سے باز رکھا کہ وہ زور سے اپنے ہم سفر کا ہاتھ تھام لیں۔ رکشا کی پشت پوری طاقت سے تھامے بیٹھی تھیں۔

خدا خدا کر کے بنگالیوں کے جلوس میں سے چیونٹی کی طرح راستہ بناتی ہوئی رکشا کھلی سڑک تک

پہنچی۔ تب کہیں اس کی سانس میں سانس سمائی۔ ذرا سی دیر میں وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ جلوس پیچھے رہ گیا۔ ذرا پرسکون ہوئیں تو دل ہی دل میں گردن موڑ کر انھوں نے اس پُرخروش جلوس کو ہاتھ ہلایا، اور سمجھایا: میں آپ کے خلاف نہیں ہوں۔ بس ذرا ڈر گئی تھی۔ ایک تو زبان کا فرق...

اس کے بعد سڑکوں پر کئی جگہ یحییٰ خان کے پتلے جلتے دیکھ کر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کی منزل کافی دور تھی، مگر ابھی سے وہ سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ جشن مناتے، مسکراتے، ہنستے ہجوم کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی وہ کہاں جا رہی تھیں؟ مگر اب ان کی رکشا ایک نہایت پتلی، سڑی ہوئی گلی میں داخل ہو چکی تھی۔

کیمپ میں

بنگالی پروفیسر کے ساتھ، فہمیدہ ریاض کچھ تھرتھراتی ہوئی محمد پور کے جنیوا کیمپ میں رکشا سے اتر رہی ہیں۔ ان کا پہلا قدم ہی کیچڑ میں پڑا ہے، اور تعفن کے ریلے نے ان کو ناگہانی کی طرح آ لیا ہے۔

یہ بہاریوں کا کیمپ ہے۔ پہلی نظر میں اسے انسانی رہائش سمجھا نہیں جا سکتا۔ چاروں طرف سے بلند احاطے میں سرکنڈوں سے بنائے ہوئے مکعبوں کی ان گنت قطاریں ہیں۔ کیچڑ کی پٹیاں ان کو بمشکل ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ سرکنڈے کے رہائشی مکعب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ اگر آپ کیچڑ اور غلاظت کو کسی طرح نظرانداز کر دیں تو سرکنڈے کے رنگ اور بناوٹ کے باعث یہ کیمپ شہد کی مکھیوں کا ایک بہت بڑا چھتا معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر طرف انسان مکھیوں کی طرح رینگ رہے ہیں اور بھنبھنا رہے ہیں۔

بائیں ہاتھ پر ایک سیدھی قطار کچی کھولیوں کی ہے۔ یہ اصل کیمپ کا حصہ نہیں، بلکہ ایک طرح کیمپ کی باؤنڈری کی دیوار ہے۔ ان ہی کھولیوں میں سے ایک میں بہاریوں کی انجمن کا صدر دفتر ہے۔

میں پروفیسر خلیق کے ساتھ انجمن کے دفتر میں داخل ہوئی۔ نیم تاریک کمرے میں چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ کمرے میں ٹوٹی ہوئی دو تین بنچیں اور ایک میز کرسی پڑی تھی۔ سامنے نظر اٹھائی تو دیکھتی رہ گئی۔

کچی دیوار پر قائداعظم کی تصویر آویزاں تھی، اور اس کے ساتھ قدِآدم سے تین گنا بڑی مرحوم ضیاء الحق کی تصویر چسپاں نظر آئی۔

فہمیدہ ریاض کے دماغ پر جیسے کسی نے ہتھوڑا دے مارا۔

ایک پل کے دسویں حصے میں وہ حیران ہوئی اور پھر سناٹے میں آ گئی۔ برسوں پہلے کا ایک منظر اس

کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ شیخ مجیب کے قتل پر، کراچی میں، سرکاری یا نیم سرکاری ایما پر، مساجد میں نمازِ شکرانہ ادا کی جارہی تھی۔ وہ بھٹو کا زمانہ تھا۔

اور بھٹو کو ختم کرنے والا آج اس دیوار پر!

کہیں بیچ میں کوئی بڑا گھپلا ہے۔ منطق میں نہیں بیٹھتی یہ بات۔

لیکن ہر بات منطقی کہاں ہوتی ہے، اے دل، اے دل!

وہ دروازے سے واپس نہیں لوٹ گئی۔ اس کے دل میں اتنے آنسو بھرے تھے کہ وہ کہیں جانا نہ چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر تک صرف خاموش بیٹھی رہنا چاہتی تھی — خاموش اور سرنگوں — جبکہ اس کے دماغ میں کسی فلم کی طرح، بہاریوں کی اس علی الاعلان وابستگی پر لعنت کی طرح اس کی اپنی جلاوطنی کا پورا دور گردش کر گیا تھا۔

کراچی سے دہلی تک... دو چھوٹے بچوں کو دونوں پہلوؤں میں دبائے، اپنے پیٹ میں خوف کی تھرتھراہٹ محسوس کرتی ہوئی۔ وہ مجھے آدھے راستے سے بھی واپس لے جاسکتے ہیں۔ مسلسل خوف، بے انت خوف، کوڑے اور پھانسیاں۔ گلی کے دہانے پر کھڑے ٹینک، ٹوٹتی ہمتیں۔ گیارہ برس، کہ گیارہ پل، کہ گیارہ صدیاں... اور پھر ایک فضائی حادثہ...

آخر اس نے نظریں اٹھائیں۔ کیمپ کے ایک دو باسی کھولی میں آ گئے تھے۔ تجسّس سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اچھا تو یہ ایک مخالف کیمپ ہے، اس نے سوچا۔ اس کے دل میں کوئی دانت پیس کر کہہ رہا تھا: آخر اس زبوں حالی میں، اس کچی دیوار پر، یہ تصویر کیوں لگائی ہے؟ آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ پاکستان میں یہ تصویر کچی دیواروں پر لگی ہوئی نہیں ملے گی۔

اس دانت پیسنے کی آواز کو دباتا، غصے کے آنسوؤں میں بھیگی اس چیخ کو نظر انداز کرتا کوئی دوسرا شخص، کوئی دوسری ہی تقریر کر رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ بہاری جمہوریت کے حامی کیونکر بن سکتے ہیں؟ جمہوریت میں تو یہ ایک چھوٹی سی اقلیت میں بدل جاتے ہیں۔ جمہوریت کا مطلب اکثریت کی حکومت ہے۔

اس بات کو صاف ہونا چاہیے کہ جمہوریت کا مطلب اکثریت کی اقلیت پر حکومت نہیں ہوتا۔ دراصل اس کا مطلب حکومت تو ہوتا ہی نہیں، یہ تو ایک نظام ہے۔ بعض اصطلاحات سے پیدا ہونے والے

تصورات کتنے خطرناک نتائج لاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر، غیر منقسم ہندوستان میں، مسلمان جمہوریت کے حامی نہیں بن سکے تھے۔ اسی لیے۔ کل آبادی کے لیے قابلِ قبول بننے کی خاطر، ایسے ملکوں میں جہاں اتنا لسانی اور مذہبی تنوع ہو، جیسا کہ ہمارے برصغیر میں، جمہوریت کو اپنی تعریف وضاحت سے کرنی پڑے گی، اور لوگوں کو یقین دلانا ہوگا کہ جمہوریت ایسا نظام ہے جہاں اقلیت میں ہونا جرم نہیں، لسانی یا مذہبی اقلیتی گروہوں کے مفادات روندے نہیں جائیں گے۔ دوسری صورت میں ان گروہوں کے بدترین خوف اور اندیشے جمہوریت کی راہ میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔

میلی کچیلی بنچ پر بیٹھی فہمیدہ ریاض دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھیں، کچی زمین پر نظریں جمائے۔ کون جان سکتا تھا کہ ان چند لمحوں میں انھوں نے اپنے آپ سے کیسی چومکھی جنگ لڑی تھی۔ ذرا سی دیر میں منھ اتر گیا تھا۔

دور کسی مسجد سے ظہر کی نماز کے لیے اذان سنائی دینے لگی۔ میٹھے بنگالی لہجے میں عبادت کا بلاوا۔ اللہ اکبر... اللہ اکبر...

اچھی لگی اسے اذان کی آواز۔ جیسے گرد و پیش کے پُرتشدد جذباتی تصادم کا کسا ہوا شکنجہ ایکا ایکی ڈھیلا پڑ گیا۔ یا چھناکے سے بند کمرے کا شیشہ ٹوٹا اور تازہ ہوا کا جھونکا کمرے میں آ گیا۔ پھر ایک سناٹا، جو کافی طویل لگ رہا تھا، حالانکہ چند سیکنڈ بھی نہ گزرے ہوں گے۔

کیا سوچ رہی ہیں؟ ایک خیال نے پوچھا۔

ہیں؟ دوسرا چونکا۔

پاکستان میں میرے ایک دوست نے عجیب بات کہی تھی ایک دفعہ، کہ جو بات دل میں کسی اندھے جذبے نے پیدا کی ہو وہ بھلا سمجھ بوجھ سے کیسے دور کی جا سکتی ہے۔

جیسے؟

جیسے نفرت کا علاج سمجھ بوجھ نہیں۔

پھر کیا ہے؟

محبت... اندھی محبت۔

دونوں ہنسنے لگے۔

کس نے کہا؟ یہ کہاں لکھا ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے؟

ہونا تو پڑے گا۔ کوئی بھی ہمیشہ بیمار نہیں رہ سکتا۔ علاج ہی کرے گا۔ کم از کم کرنا چاہیے گا تو ضرور۔

نفرت کی تہہ میں تو خوف ہوتا ہے۔

اور خوف کا علاج کیا؟ تسلی۔ آدمی کو تجزیے سے زیادہ تسلی کی ضرورت ہے۔ اس کمبخت کا حال ہی ایسا ہے۔

نہیں، تجزیے کے ساتھ ساتھ تسلی...

ٹھیک ہے۔ ان کا دماغی فارمولا تیار ہو گیا۔

لیکن اس خاص لمحے میں، معلوم ہوتا ہے کہ بہاریوں سے زیادہ آپ کو تسلی کی ضرورت ہے۔

وہ جی بھر کر ہنسی۔ آپ کے اضافے کے مطابق ''بہاریوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی'' زیادہ درست رہے گا۔

کیمپ میں یہ بات آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ایک پاکستانی بہاریوں سے ملنے آئی ہیں۔ اِدھر اُدھر سے لوگ آ کر جمع ہونے لگے۔ دو تین بہاری اپنے لیڈر کی تلاش میں نکل گئے۔ دیوار پر ان کی سہ رنگی تصویر لگی تھی۔ نیچے لکھا تھا: 'تین لاکھ دلوں کی دھڑکن فلاں صاحب'۔ دو چار برمحل اشعار بھی اِدھر اُدھر لکھے تھے۔ اسے پھر ہنسی آ گئی، یہ سوچ کر کہ اردو بولنے والے اشعار کتنی جلدی موزوں کر لیتے ہیں۔ کیچڑ کے گڑھے میں جا پڑیں گے اور جھٹ سے اس حالت پر دو تین شعر لکھ ماریں گے۔ دوسری زبانوں والے اس تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں — ایسا کلچر جو ہر حال میں، اور تقریباً ہر فرد سے تک بندی کرا ہی دیتا ہے، جیسے یہاں سے بیس منٹ کی پرواز کے فاصلے پر واجد علی شاہ نے کلکتہ کے مٹیا برج میں ہائے ہائے کرتے ہوئے، کراہتے جھینکتے، تک بندی میں اس وقت کی تاریخ رقم کی۔

اس حالت میں، اس کیمپ میں جہاں ہر طرف غلاظت کا ڈھیر ہے، جس کے بارے میں باہر شہر میں کہا جا رہا ہے کہ کم قیمت پر رات بھر کے لیے جوان لڑکیاں حاصل کرنے کا سہل ترین ذریعہ بن چکا ہے، گھٹیا جرائم کے اڈے میں بدل چکا ہے، یہ تک بندی کے اشعار جیسے ان انسانوں کی کسی آہنگ سے، تہذیب سے چمٹے رہنے کی کوششیں تھیں۔

فاصلے سے بہاریوں کی زبان اسے کچھ کچھ بنگالی سے ملتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پاکستان میں یہ خیال اس کے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا، مگر اب تک اس کے کان بنگالی کے لہجے سے کافی آشنا ہو چکے تھے،

اور وہ دونوں لہجوں کی مماثلت پہچان سکتی تھی۔ یہ تھا بنگال کا رنگ جو ان کے انجانے میں ہی، چالیس بیالیس برس میں ان کی بولی پر چڑھ گیا تھا۔ اسے ایک گیت یاد آنے لگا:

موری رنگ دے چُنریا
ہری نہ رنگاؤں میں
لال نہ رنگاؤں
اپنے ہی رنگ میں رنگ دے چُنریا
لال پیا موری رنگ دے چُنریا

اتنا ترستے ہیں ہم دوسرے کے رنگ میں رنگنے کے لیے۔ کیا گلے کاٹ کاٹ کر ایک دوجے کو لال رنگنے کے لیے؟

لیڈر صاحب اتفاق سے نہ ملے۔ دو تین آدمی اس سے مخاطب ہوئے۔

''ہمیں سے پوچھ لیجیے جو کچھ پوچھنا ہو۔''

''آپ یہاں کیسے لائے گئے؟'' اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

سب اکٹھے بولنے لگے۔ پھر سوال کے بے تکے پن کو محسوس کر کے خاموش ہو گئے، گویا زبانِ حال سے کہتے ہوں، اب یہ کیا پوچھنا کہ کیسے لائے گئے! یہ بتاؤ کہ پاکستان کیسے پہنچیں گے۔

آخر تفتیش کرنے والے کا بہروپ ترک کر کے میں نے ان سے وہی سوال پوچھا جو میرے منھ پر آ رہا تھا:

''آپ آخر کیوں رہتے ہیں ان کیمپوں میں؟ باہر بھی تو رہتے ہیں بہاری...''

ان کے تیور بدل گئے۔ اچھا! تو یہ ہمیں نصیحت کرنے آئی ہے۔

''کہاں جائیں؟'' انھوں نے لال آنکھوں سے پوچھا۔ ''ہم پاکستانی ہیں۔ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہمیں پاکستان لے جایا جائے گا۔ یہاں آپ دیکھ رہی ہیں کہ ہماری کیا حالت ہے۔''

''یہاں کچھ مدد نہیں ملتی آپ کو؟''

''پہلے ہم انٹرنیشنل ریڈ کراس کے تحت تھے۔ اب بنگلہ دیش ریڈ کراس کے تحت آ گئے ہیں۔ ہم سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال سے کھلا رہے ہیں۔ ان کو بین الاقوامی مدد بھی تو ملتی ہے۔ کیا کھلا رہے ہیں ہمیں؟ ہر مہینے فی آدمی تین سیر اور چار چھٹانک گیہوں ملتا ہے۔''

''کیا یہ کوئی نوکری نہیں کر سکتے؟'' میں نے انگریزی میں پروفیسر خلیق سے پوچھا۔

''ایسا ہے کہ قومیت کے خانے میں تو... یہ... پاکستانی لکھتے ہیں نا۔ نوکری کیسے مل سکتی ہے؟'' انھوں نے اٹک اٹک کر کہا۔ پھر بھی وہ غیر جذباتی اور سنجیدہ لگنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ چیخ پکار کے بغیر میں بہاریوں کی صحیح صورتِ حال سمجھ لوں۔

مگر میں پھر بھی بھونچکا سی رہ گئی۔

''تب تو یہ مکان بھی نہیں خرید سکتے ہوں گے؟''

''جی... میرا تو خیال نہیں ہے کہ انھیں ایسی اجازت مل سکے گی موجودہ صورتِ حال میں۔''

وہ خالی خالی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی۔

''ارے کسی کو کیا پتہ چلتا ہے! کوئی جھگی جھونپڑی ڈالنے لگے تو لوگ اس کا پاسپورٹ تھوڑا ہی دیکھتے ہیں۔''

''ہاں اگر یہ چاہیں تو... مگر،'' انھوں نے ہاتھ پھیلا کر کہا، ''یہ تو ہماری سوسائٹی میں ضم ہونا نہیں چاہتے۔ اگر چاہیں تو اپنی نئی نسل کو بنگالی سکھا سکتے ہیں۔ کچھ یونیورسٹی کے لوگوں نے کئی بار کوشش بھی کی، مگر...''

بہاریوں کے تیور خوفناک ہو گئے۔

''کیوں چاہیں؟ ہم نہیں چاہتے۔ کیوں ملیں ہم ان لوگوں میں؟ ان کا ہمارا کچھ بھی ساجھا نہیں۔''

''آج دیکھ لیجیے،'' دوسرے نے کہا، ''یہ باہر جشن منا رہے ہیں آج کے دن، اور ہم ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا جشن کا دن ہے اور ہمارا کفن کا دن ہے۔''

اب مجھے ڈر لگنا شروع ہو چکا تھا۔ ان کے تیور، ان کا لہجہ پل پل مزید جارحانہ بنتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف بہاری ہیں، میں نے سوچا، اور آج کا جذبات سے مشتعل دن۔ ایک بنگالی پروفیسر کو قتل کر دینا تو کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ میرے دماغ میں پھر تنکے کا سہارا آیا۔

''بھائی، آخر یہ لوگ بھی تو مسلمان...''

''کہاں کے مسلمان...'' اب یہ تیسری آواز تھی۔

''ہم نے... کیا کہتے ہیں اس کو... مسجدوں میں پناہ لی اور انھوں نے ہمیں وہاں سے... کیا کہتے ہیں اس کو... ٹنگیا لیا۔ ایسا تو کیا کہتے ہیں اس کو... کافر بھی نہ کرتے۔''

''ملک تو سنہ سینتالیس میں سب نے مل کر بنایا تھا،'' چوتھی آواز،''اب یہ کوئی شرافت ہے کہ آپ تو رہیں اور ہم سب کو بھگا دیا جائے... '' یہ رسان سے ایک بوڑھا بول رہا تھا۔

پہلے والا، لکنت زدہ لہجے میں، پھر بولنے لگا۔ اس کا مضحکہ خیز تکیۂ کلام، اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کی المناکی، ایک دوسرے سے ٹکرا کر سننے والے کو ذبح سا کر رہے تھے۔

''کس بِرتے پر رہ جائیں؟ کیا کہتے ہیں اس کو... یہاں کسی بھی حکومت نے کبھی، ذرا سی بھی... کیا کہتے ہیں اس کو... دکھائی... کیا کہتے ہیں اس کو... ہمدردی۔ پوچھیے ان سے!'' بہاری نے بنگالی پروفیسر کی طرف انگلی سے خوفناک اشارہ کیا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے پروفیسر خلیق کی طرف دیکھا۔

پاکستان میں اس کا دل پسند موقف یہ رہا تھا کہ بنگالیوں پر دنیا بھر کو یہ اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ بہاریوں کو کیمپوں سے نکال کر بنگالیوں کے برابر شہری حقوق دے۔

''ایسا کیونکر ہوسکتا ہے!'' پروفیسر خلیق نے سنجیدگی سے کہا،''کوئی بھی بنگالی حکومت اگر ان لوگوں کی مدد کرے گی، کھل کر پھر سے یہاں بس جانے کی ہمت افزائی کرے گی، تو اسے شدید عوامی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''کیا ان کے خلاف نفرت اتنی زیادہ ہے؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ ہم لوگ خود اتنے غریب ہیں۔حکومت اگر ان کے لیے جھگیاں تک ڈالنے میں مدد دینے لگے تو آسمان کے نیچے رہنے والے کروڑوں بنگالی چیخ اٹھیں گے: ان کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ہماری نہیں؟''

''اور پھر... '' انھوں نے دوبارہ جھجک کر کہا،''یہ لوگ بنگالیوں کے قتلِ عام میں پاک آرمی کے مددگار بھی رہے ہیں۔ رضا کار، دوسرے الفاظ میں۔ لوگوں کو یہ بات پھر سے یاد آ جائے گی، اگر انھیں مدد دی گئی تو... ''

''جی ہاں... جب امداد بانٹنے کا، خشک دودھ بانٹنے کا، گیہوں چاول بانٹنے کا وقت ہو، تب تو ایک پیکٹ حاصل کرنے کے لیے آدمی کو بہت کچھ یاد آ سکتا ہے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

''کتنے ہیں یہ لوگ کل تعداد میں ان کیمپوں میں؟'' فہمیدہ ریاض نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ انھیں اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہورہی تھی، جیسے کسی کنویں سے بول رہی ہوں۔

''پورے بنگلہ دیش میں ایسے باسٹھ کیمپ ہیں۔ ان سب میں ملا کر کل تعداد ڈھائی لاکھ ہے۔''

ڈھائی لاکھ؟ وہ بدبدائیں۔ اتنی کم! اتنے لوگ تو پاکستان میں یونہی ہر سال بڑھ جاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض ان سب بہاریوں کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانے پر تیار ہورہی تھیں۔

انھیں سندھیوں کے چہرے یاد آرہے تھے۔ گندمی گول چہرے۔ پریشانی اور تلخی سے کشیدہ ابرو۔

اَدی، کوئی حد بھی ہے؟ کوئی حد بھی؟

ادل سومرو... ارشاد شیخ... یہاں آؤ، میرے ساتھ آؤ، یہاں اس کیمپ میں... تم خود دیکھو۔

کیا دیکھیں گے وہ؟ اس کے دل نے پوچھا۔ یہ؟ دل نے سامنے دیوار پر چھائی جنرل ضیا کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس طرح کے فیصلے جذباتی طور پر نہیں کیے جاتے۔ سوچ سمجھ کر۔

وہ تلخی سے دانت نکوس کر ہنسی۔ کون تخمِ حرام کہتا ہے، جذباتی فیصلے نہیں کیے جاتے! یہاں لوگوں نے جذبات میں بہہ کر پورے پورے ملک بنا لیے ہیں۔ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آدمی ایک عقل پرست جانور ہے، یا عقل سے کام لیتا ہے؟ آدمی جذبات میں بہتا ہے، ورنہ کیا پوری تاریخ اس طرح خون میں ڈوبی ہوئی ہوتی؟

آپ کے تمام 'ٹھوس مادّی' تجزیے، جذبات کے عنصر کو نظر انداز کرکے انتہائی گمراہ کن بن جاتے ہیں، اس نے دانت کچکچا کے اپنے سارے مارکسی دوستوں کو زور سے ڈانٹ پلائی۔

کوئی دھیرے دھیرے رسان سے کہہ رہا تھا، کوئی بھی پاکستانی حکومت اگر بہاریوں کو پاکستان لائے گی تو اسے سندھیوں کی جانب سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ضیاء الحق... وہ تو یوں بھی کوئی مسئلہ حل کرنے میں دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اس کا مسئلہ تو اپنے لیے تھوڑا اور... اور پھر کچھ اور وقت خریدنا تھا۔ لیکن وہ بھی بہاریوں کو اسی لیے پاکستان نہ لے گیا۔

تب پھر؟ کیا یہ بس ووٹ بٹورنے کا مسئلہ ہے؟

نہیں! اس کے دل نے مضبوطی سے کہا، یہ انصاف بھی نہیں... ملک کے ایک حصے کی پریشان، خود کو اقلیت میں تبدیل ہونے کے خوف کے باعث نہایت غیر محفوظ محسوس کرتی ہوئی آبادی پر دھوم دھام کے

ساتھ مزید لاکھوں لوگ مسلط کر دینا انصاف نہیں ہوگا۔تم اس کے خلاف خود لڑو گی۔

ہاں...اس نے اکھڑی سانس بھر کر جیسے کسی خواب میں کہا۔

''کیمپوں سے باہر جو غیر بنگالی اردو بولنے والے لوگ رہتے ہیں، جو خاصے خوشحال بھی ہیں، وہ آپ کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ ایک تاجر سے تو میں خود ملی۔وہ قنوج کے ہیں اور عطر کا بیوپار...''

اچانک چند لڑکے زور زور سے بولنے لگے:

''اجی کیسے رہتے ہیں، ہم سے پوچھیے۔ بھتہ دیتے ہیں بھائی بھتہ۔ پولیس کو۔''

ایک ذرا بڑی عمر کے آدمی نے انھیں ڈپٹا،'' چپ رہو کم بختو۔ اتنا پیسہ ان کے پاس کہاں سے آئے گا؟'' وہ مشاہدہ کرنے والی عورت پر ہرگز یہ تاثر نہیں ڈالنا چاہتا تھا کہ کوئی بہاری بنگلہ دیش میں اتنا خوشحال بھی تھا کہ باقاعدہ پولیس کو غنڈہ ٹیکس دے کر بھی آرام سے رہ سکتا تھا۔

ہماری بنیادی کردار، یعنی یہ خاتون، ایک نہایت نفیس چغد کی مانند انھیں پاکستان کی سیاسی مشکلات سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

نیم دلی سے کچھ دیر تک وہ سنتے رہے۔

''ہم سندھ میں نہیں رہنا چاہتے،'' ایک نے ٹوکا۔''کئی بار کہہ چکے ہیں۔لکھ کر بھی دیا ہے۔''

دوسرا بولا،''ہمیں تو کشمیر بھیج دیا جائے۔''

شدید دکھ کی حالت میں بھی وہ دل میں ہنسے بنا نہ رہ سکی۔کشمیر بھیج دیا جائے! خوب گویا ہالیڈے پر جا رہے ہیں۔

''بھائی، آپ لوگوں کو کہیں بھی بھیجا جائے، سب کچھ بیچ کر آپ کراچی ہی آجاتے ہیں۔''

کیوں؟ کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے۔لوگ اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔پھر کراچی میں روزگار ملتا ہے۔

ہم اب جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''آیئے، ذرا ان بلوں کو دیکھیے جن میں ہم رہ رہے ہیں،'' ایک لڑکے نے کہا جس کی اپنی عمر اٹھارہ برس ہی رہی ہوگی۔

کھولی سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھا، میز پر اخبار جنگ پڑا تھا۔یہ انھیں کہاں سے مل جاتا

ہے؟ میں نے حیرت سے سوچا۔

''جناب نواز شریف نے ہمیں پاکستان بلانے کا عزم کیا ہے،'' ایک بہاری کہہ رہا تھا۔

یہ عزم انھوں نے ضیا کے دور میں پورا کیوں نہ کیا؟ ایک عورت خاموشی کی زبان سے پوچھ رہی تھی، جس کے روڑھے چہرے پر زندگی کے انکشافات کی گہری لکیریں پڑ چکی تھیں، حتیٰ کہ وہ عورت معلوم تک نہ ہوتی تھی۔ وہ اس وقت دل میں حساب لگا رہی تھی۔

کراچی میں سندھیوں کا جلوس... ''بہاریوں کو نہ بلایا جائے۔'' اس کے دوسرے دن، لاہور سے پرواز کرتے ہوئے نواز شریف کراچی پہنچتے ہیں اور جلسۂ عام میں کہتے ہیں، ''بہاریوں کو فوراً بلایا جائے۔'' پھر وہ لاہور پرواز کر جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں فسادات شروع ہوجاتے ہیں۔ پندرہ آدمی ہلاک... بیس آدمی ہلاک... تیس آدمی...

لڑکا انھیں شہد کی مکھیوں کے چھتے کی اندرونی سیر کرانے کیچڑ میں لے چلا۔ ایک سوراخ میں دو بیبیاں لکڑی کے اڈوں پر ایک عنابی ریشمی ساری تانے جھپا جھپ زردوزی کا کام کر رہی تھیں۔ کہیں دال بگھارنے کی مہک آ رہی تھی۔ ایک سانولا، گول مٹول، ننگ دھڑنگ بچہ ایک رہائشی سوراخ کی چوکھٹ تک آیا اور مسکراتے ہوئے بڑے انہماک سے پیشاب کی دھار مارنے لگا۔ اس کے گہرے سانولے مکھڑے پر بڑی بڑی آنکھیں، ترشے ہوئے نقوش اور گھنگریالے بال اسے بال کرشن سے مشابہ بنا رہے تھے۔

زندگی کی ہر چہل پہل، جینے کا سارا جھمیلا کیمپ میں تمام آوازوں اور خوشبوؤں اور ذائقوں کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔

لڑکا ڈرامائی انداز میں کہہ رہا تھا، ''دیکھ لیجیے، اب مجھے دیکھیے... میرا دادا پاکستان بناتے ہوئے مارا گیا۔ میرا باپ پاکستان بچاتے ہوئے مارا گیا۔ اور میں... پاکستان کا نام رٹتے رٹتے مر جاؤں گا۔''

پاکستان بچاتے ہوئے مارا گیا؟ یعنی رضا کار؟ بچو! مت بول یہ ڈائیلاگ... کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ بہت پرانا ہوگیا ہے... گھس پٹ گیا ہے۔ اب اس کا کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ سب کچھ ایک جی ہلا دینے والی مبالغہ آرائی معلوم ہوتا ہے... ایک شرمندہ کر دینے والا میلو ڈراما جسے اب کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔ ہال خالی ہو چکا ہے۔ تماشائی اپنے گھر جا چکے ہیں۔ اسٹیج پر تم اکیلے اپنا ڈراما کھیل رہے ہو۔ اور یہ جو تمھیں دور سے تالیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے، یہ دراصل کلاشنکوف کی گولیوں کی آواز ہے۔ کسی دوسرے خطے پر

تمھاری بدحالی، تمھارے خون اور آنسوؤں، تمھارے خوف اور پل پل قدم جماتی مایوسیوں کو کسی اور ہی مقصد کے لیے استعمال کرنے کی خاطر، تم سے ہزاروں میل دور کسی دوسری سرزمین پر، اقتدار کے حصول کے لیے، تمھی جیسے مفلسوں، بدحالوں کے خون سے زمین رنگنے کے لیے۔

کیمپ سے نکلتے ہوئے اسے بہاریوں نے اطلاع دی:

''ہمارے رہنما کا خیال ہے کہ انشاء اللہ اگلے سال تک ہم ایک بحری جہاز کرائے پر لے کر کراچی کی بندرگاہ کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ بس اب تو یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔''

واپسی کے سفر میں میں نے بنگالی پروفیسر سے پوچھا:

''بلوؤں کے دوران بہاریوں کے مکانوں پر بنگالیوں نے قبضہ کر لیا؟''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر انھوں نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا، ''بہاریوں کے مکانوں پر قبضہ کیا گیا تھا۔ بعد میں وہ مکان، یا ان میں سے کچھ، حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیے، کیونکہ مالکان دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن...'' انھوں نے کچھ اٹک اٹک کر، اور شرمندہ سا ہو کر اپنی بات کا آخری حصہ پورا کیا، ''یہ بات، کیمپ میں رہنے والے سب بہاریوں پر صادق نہیں آتی۔ یہ لوگ دراصل بنگلہ دیش بننے سے پہلے بھی بہت غریب ہی تھے۔ ان میں سے غالباً کسی کا مکان پہلے بھی نہیں تھا، گو کہ... اب... یہ لوگ ایسا تاثر نہیں دیتے۔''

جھوٹ بول رہے ہیں! فہمیدہ ریاض نے سوچا، کیچڑ میں پڑے لوٹ رہے ہیں اور جھوٹ بھی بول رہے ہیں!

سفر خاموشی سے جاری رہا... شرمندگی کی خاموشی... شرمندگی، جو آدمی کے دل میں کسی انجانے، بھید بھرے پاتال سے پھوٹ کر نکل آتی ہے۔ آدمی کے دل میں، بھرے بازار میں دوسرے آدمی کا کھلا ستر دیکھ کر اچانک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی نظریں اپنے آپ جھک جاتی ہیں۔ یہ دوسرے آدمی کا کھلا ستر ہے... اس کو ڈھانپ دو... ڈھانپ دو۔ اس پر قہقہہ لگا کر مت ہنسو۔ انگلی سے اشارے مت کرو۔ ہم سب بھی ایسے ہی ہیں اور یہ چار انگل کا کپڑا، کسی بھی تیز جھکڑ سے، کسی بھی وقت اڑ سکتا ہے۔ ہمیں خدا نے ایسا ہی بنایا ہے۔ ہمیں خدا نے...

رکشا والا بہاری لڑکا تھا۔ بنگالی بولنے والا بہاری۔ وہ کیمپ ہی میں رہتا تھا۔ بنگالی پروفیسر اس سے باتیں کر رہے تھے۔

''میں دن بھر رکشا چلاتا ہوں تو روز سوٹکا بھر مل جاتا ہے، جس سے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹی بہن کا پیٹ پالتا ہوں۔ مجھے اور بھی بہت سے کام آتے ہیں۔ میں چوڑیاں بنا سکتا ہوں۔ ہم پاکستان جا کر یہی کام کریں گے۔''

''تو یہاں کیوں نہیں کرتے؟ کوئی روکتا تو نہیں تمھیں۔''

''یہاں لوگوں کے پاس خریدنے کے لیے پیسہ کہاں ہے؟ پاکستان تو امیر ملک ہے۔ وہاں جو بھی جاتا ہے اس کی حالت بہتر ہی ہو جاتی ہے۔ وہاں تو بنگالی بھی جاتے ہیں،'' اس نے گردن موڑ کر کہا۔

میں یہی سوچ رہی تھی۔ ایک لاکھ کے قریب بنگالی تو پاکستان میں یونہی آئے ہوئے ہیں۔ کراچی میں گھریلو ملازمتیں کرتے ہیں۔ مگر میں نے کچھ کہا نہیں۔

''تم کیمپ میں کیوں رہتے ہو؟ اتنی غلاظت اور تنگی میں؟ باہر کیوں نہیں رہتے؟''

سیدھا سادا لڑکا بتانے لگا، ''مکانوں کا کرایہ اتنا زیادہ ہے۔ پندرہ سوٹکا سے تو شروع ہوتا ہے۔ اس لیے باہر نہیں رہتے۔ بس یہیں کیمپ میں پڑے ہیں۔ سر پر چھپر تو ہے، بنا کرائے کے۔''

پروفیسر خلیق نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا کہتے ہوں، دیکھا آپ نے، میری بات کی تصدیق ہو گئی۔

اور عین اسی وقت، ایک پتلی، رکشاؤں بھری گلی سے گزرتے، کسی معجزاتی طریقے سے، سامنے کی رکشا اچانک رک گئی، ایک دھچکے سے ہماری رکشا سامنے والی رکشا سے ٹکرا کر پیچھے ہٹی، اور نہایت سست رفتار سے، رکشا کی سیٹ سے پھسلتے ہوئے پروفیسر خلیق اور فہمیدہ ریاض دسمبر کے نیلے آسمان تلے، بنگلہ دیش کی سانولی دھرتی پر منھ کے بل زمین بوس پڑے تھے۔

قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

دوسرے لمحے میں نوجوان بہاری رکشا والا مشکل سے اپنی الھڑ ہنسی دباتے ہوئے ہمیں اٹھا رہا تھا۔

''بابو جی، کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

میں ہنستے ہنستے اٹھ رہی تھی۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے سوچ رہی تھی، خدا کا شکر ہے کہ میں یہاں ساڑھی پہن کر نہیں آئی!

میں نے رکشا والے کو دیکھا، جو اب صرف ایک شوخ نوجوان تھا۔ اس کی ابھری ہوئی پسلیاں، ستا ہوا چہرہ، کچھ بھی تو اس کی نوجوانی کی زندہ دلی کو ہلاک نہ کر سکے تھے۔

پھر اس نے اپنے وجود کی ساری آس کو اپنی آواز میں بھر کر رکشا والے سے پوچھا:

''یہاں کوئی... زندہ بہار لین ہے؟''

''زندہ بہار لین؟ ہاں ہے تو۔ مگر اس سائیڈ پر محمد پور کے پاس تو نہیں۔ پرانے ڈھاکہ میں ہے۔ بوڑھی گنگا کی طرف۔ وائز گھاٹ کے پاس۔''

''کیا آپ مجھے وہاں لے جائیں گے؟'' میں نے پروفیسر خلیق سے التجائی لہجے میں پوچھا۔

''ضرور...'' وہ محبت اور مہربانی سے مسکرانے لگے۔

''مگر پہلے میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا، کھانا کھلانے۔''

پی ایل فورایٹی

اس رات، پرجاتن ہوٹل کے کمرے کے اندھیرے میں سادہ سے کچھ سخت بستر پر، وہ سونے کے لیے لیٹنے کی بجائے بے دم ہو کر گر پڑی تھی۔ آج رات وہ دونوں اس کمرے کے نزدیک پھٹک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس بستر میں کوئی بھی اس کا شریک نہ تھا۔ بالآخر وہ اکیلی تھی... بالکل اکیلی — اور بالکل خالی۔

سولہ دسمبر کو، ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں، فہمیدہ ریاض اپنے آپ کو پورا خرچ کر آئی تھیں۔ ایک پائی، ایک دھیلا، ایک کوڑی بھی نہ بچی تھی۔

سفید اور سیاہ باریک ڈوریوں کے بیچ بسے ہوئے ان گنت رنگوں کے دھاروں میں بہتی پستی، پلٹے کھاتی، دریا میں ابھری چٹانوں سے ٹکراتی، بہتے درختوں کے تنوں سے الجھتی، کون جانے کہاں رہ گئی اوڑھنی۔ کس جھاڑی میں بال الجھے رہ گئے۔ رانیں، بازو، چھاتی، وجود کا ایک ایک عضو، کس لہر میں کہاں نکل گیا۔

کیا ہوا تھا؟ کیا ہوا تھا پروفیسر خلیق کے گھر؟

بہت سی دوسری بنگالی مسلمان عورتوں کی طرح پروفیسر خلیق کی بیوی بھی ماتھے پر بندیا لگائے اس

سے ملی تھیں۔ ''یہ میری فرسٹ کزن بھی ہیں، میرے چچا کی بیٹی۔ اور یہ میرے دونوں بچے۔'' بارہ تیرہ برس کی لڑکی اور اس سے کچھ چھوٹا لڑکا۔ دونوں اسی وقت جشنِ آزادی کے جلوس میں شرکت کرکے واپس آئے تھے، اور اشتیاق سے بنگالی میں اپنی ماں سے باتیں کررہے تھے۔

''ضیاء الرحمٰن، وہ بھی کودتا کے ذریعے لائے گئے تھے،'' میں نے پروفیسر خلیق سے کہا، ''مگر میں نے محسوس کیا ہے، کافی لوگ ان کو ناپسند نہیں کرتے۔ کل گاڑی میں کسی نے مجھے کافی احترام سے ان کی قبر دکھائی تھی۔''

''وجہ یہ ہے کہ ضیاء الرحمٰن لوگوں کے اچھے خاصے بڑے حصے کو خوش نہیں تو، مطمئن کرسکتے تھے۔ وہ شیخ مجیب کو قتل کرنے والے گروہ میں شامل نہیں تھے۔ اس طرح مجیب کے طرفداروں میں ان کے لیے نفرت نہ تھی۔ دوسری طرف، ضیا ہندوستان کے اس طرح دوست نہ تھے جیسے کہ شیخ مجیب، اس لیے انھیں دوسری جانب کی بھی حمایت حاصل ہوسکتی تھی، یا یوں کہیے کہ دوسری جانب سے بھی شدید مزاحمت کی صورت نہ تھی۔

''انھوں نے سعودی عرب سے بہتر تعلقات قائم کیے۔ بنگالیوں کے لیے سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ میں ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے اور بنگلہ دیش میں انھوں نے نظریاتی خطوط پر بری طرح تقسیم شدہ عوام کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے زمانے میں، بنگلہ دیش بننے کے بعد پہلی بار، جنگِ آزادی کا ساتھ نہ دینے والوں، یا پاک فوج کے ساتھ کسی بھی سطح پر تعاون کرنے والوں کو حقارت سے مطعون کرنا ختم کردیا گیا، یا ایسا کرنے کی کوشش کی گئی۔

''انھوں نے بیچ کا راستہ اپنایا اور اس طرح اپنی حمایت کے دائرے کو وسیع رکھا۔''

''پھر بھی،'' میں نے کہا— غالباً یہ ایک بلند آواز سے سوچنا تھا —''اتنے کم عرصے میں کتنی بڑی تبدیلیاں آئیں، لوگوں کے جذباتی اتار چڑھاؤ میں۔ صرف اٹھارہ برس... یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔''

''بہت ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو اس وقت لگ رہا ہے، گویا تھوڑا سا عرصہ بیتا۔''

محمد پور کا جنیوا کیمپ پھر آنکھوں میں سما گیا۔

اٹھارہ برس گزر گئے۔

اٹھارہ برس پہلے گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔ اس گھر سے کچھ فاصلے پر تو وقت بالکل نہیں بیتا۔ وقت رکا کھڑا ہے۔

بہت وقت گزر گیا۔ یہ آپ کو اس وقت لگ رہا ہے جیسے یہ عرصہ کم ہوتا ہے۔

کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

''میں نے آپ کے لیے خالص بنگالی کھانا بنوایا ہے،'' پروفیسر خلیق نے مجھ سے کہا۔

بنگالی پروفیسر اپنے بیوی بچوں سے بنگالی میں اور مجھ سے تمام تر گفتگو انگریزی میں کر رہے تھے۔ وہ ایک نرم مزاج، ذہین اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے جواں سال پروفیسر تھے: یونیورسٹی اساتذہ کی نئی کھیپ۔ ان سے پرانی کتابوں کی مہک نہ آتی تھی۔ برٹش کاؤنسل میں لسانیات پڑھانے کے لیے وہ کمپیوٹر استعمال کرتے تھے۔ محمد پور کیمپ جانے میں انھوں نے میرے ساتھ اتنا تعاون کیا تھا کہ میں خود کو ان کی بہت ممنون محسوس کر رہی تھی۔

ان کا چھوٹا سا، سادگی سے سجا گھر نیل کھیت کے علاقے کے پاس ہی تھا۔ باہر بڑے احاطے میں آم اور کٹھل کے درخت۔ مختصر ڈرائنگ روم میں مختصر سامانِ آرائش۔ میز پر امریکہ سے لائے ہوئے سووینیر رکھے تھے۔ پروفیسر خلیق فل برائٹ فیلوشپ پر دو برس امریکہ رہ آئے تھے۔ یونیورسٹی میں وہ انگریزی ادب پڑھاتے تھے۔ مگر ان کی سیاست میں گہری دلچسپی معلوم ہو رہی تھی۔

میں اس پر تبصرہ کرتی ہوں۔

وہ ہنستے ہیں۔ ''بنگال میں ہر شخص سیاسی ہے،'' وہ کہتے ہیں۔

''بنگلہ دیش بنتے وقت تو آپ کم سن رہے ہوں گے؟'' میں کہتی ہوں۔

''کالج میں پڑھتا تھا۔ اپنے طریقے پر ہم نے بھی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ ایک بار میں پمفلٹ بانٹنے نکلا تھا۔ راستے میں ایک فوجی نے روک لیا۔ اس دن تو بال بال بچا۔ جان بچانے کی خاطر مجھے کلمہ سنانا پڑا تھا اور اسلام پر تقریر بھی کرنی پڑی تھی۔''

میرے دماغ میں ایک نامناسب خیال آتا ہے (افسوس، زندگی کے تجربے اتنے واہیات رہے ہیں کہ نامناسب خیال آتے رہتے ہیں): جس دن سے میں ڈھاکہ پہنچی ہوں، آج تک مجھے ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا ہے جس نے مجاہدِ آزادی ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہو۔ اس صورت میں تو یہ کئی کروڑ کی فوج ہونی چاہیے تھی!

فرض کیجیے، ایسا نہ ہو۔

فرض کیجیے، ایسا ہی ہو۔

''کیا آپ نے بھی محسوس کیا، آج کے تمام اخباروں میں جنگِ آزادی اور اس کامیابی پر طویل

مضمونوں میں ہندوستان کا ذکر تک نہیں؟ ایسا لگتا ہے جیسے اس بات کو بالکل بھلا دینا چاہتے ہیں کہ یہ دراصل ہندوستانی فوج کی فتح تھی۔ فوجی مہمات کے تعلق سے بھی ہندوستانی فوج کا ذکر تک نہیں ہے۔ صرف متحدہ فوج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔"

پروفیسر خلیق مسکرانے لگے۔ "ایک تو... ہندوستان سے اب ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہیں۔ لیکن ایک اور بھی حقیقت ہے۔ بنگالی اس فتح کو، بنیادی طور پر اپنے ہی مسلح جوانوں کی فتح سمجھتے ہیں۔ جبکہ غالباً آپ اسے بنیادی طور پر ہندوستانی فوج کی فتح سمجھتے ہیں۔ یہ کسی وقوعے کے سمجھنے میں آپ کی اور ہماری ترجیحات کا نازک سا فرق ہے۔"

"شیخ مجیب کا بھی خاص ذکر نہیں کیا جا رہا، جو کہ آپ کی اس ریاست کے نظریاتی باپ تھے،" فہمیدہ ریاض نے تاریخ کے اس مختصر ترین دور کی بوالعجبیوں پر حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"بنگلہ دیش جب بنا، تب تو ان کی مقبولیت پر سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ وہ ہر دلعزیز ہیرو تھے۔ مگر بعد میں..."

"دیکھیے بھئی..." میں نے ان کی بات کاٹی، "مجھے تو مرحوم سے کوئی عقیدت ہے نہیں۔ اس لیے نہیں کہ میں بنگلہ دیش کی مخالف تھی (یہ ذرا جلدی میں وضاحت کے لیے ضروری اضافہ تھا)، ہرگز نہیں! لیکن بعد میں وہ کافی نااہل ثابت ہوئے۔ انگلینڈ میں میں نے ان کی رہائی کے بعد ٹی وی پر ان کا ایک انٹرویو دیکھا تھا۔ بالکل متاثر نہیں کر رہے تھے۔"

زیادہ بولنے کی عادت کے باعث فہمیدہ ریاض اپنے اصلی خیالات کا جا و بے جا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ لیکن اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ کہیں گی کہ اس طرح ان کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کے ساتھ اپنے خیالات بتا دینے سے وہ کسی کے دل کا بھید لینے والی کا کردار ادا نہیں کرتیں بلکہ اپنے آپ کو اور دوسرے کو ایک سطح پر لے آتی ہیں۔ یہ ان کا کوئی ذاتی حساب ہوگا۔

لیکن پروفیسر خلیق سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ "ہاں... نہیں..." انھوں نے عجیب طرح سے بات کا آغاز کیا۔ "دراصل شیخ مجیب کے زمانے میں ایک بھیانک قحط پڑا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔" مجھے پھر ٹی وی کی فلمیں یاد آئیں۔ ہڈیوں کے ڈھانچوں کی قطاریں۔ ننگے بدنوں میں بھی عورت اور مرد کی شناخت مشکل سے ہو سکتی تھی۔ جلے ہوئے کھیتوں میں مویشیوں کی لاشیں اور ان پر منڈلاتے کوے اور گدھ۔ اس سرزمین نے کیا کچھ بھوگا ہے... کیا کچھ!

''دراصل... یہ... وہ ایک مصنوعی قحط تھا۔''

تھوڑی دیر حیرت زدہ خاموشی رہی۔ پھر انھوں نے پوچھا، ''کیا مطلب؟''

پروفیسر خلیق نے مطلب سمجھانا شروع کیا، ''اس بات کے کافی شواہد ہیں۔ دیکھیے، بنگلہ دیش میں خوراک کی قلت ہمیشہ سے تھی اور آج بھی ہے۔ ہر سال باہر سے امداد لینی پڑتی ہے۔ اگر امداد نہ ملے تو ہر سال قحط پڑ جائے۔ یہ ایک طبعی حقیقت ہے کہ بنگلہ دیش اپنی آبادی کے لیے پوری خوراک پیدا نہیں کرتا۔ بنگلہ دیش بننے کے فوراً بعد یہ امداد امریکہ سے ایک خاص معاہدے کے تحت آنی تھی۔''

''پی ایل فور ایٹ؟''

''جی ہاں، پی ایل فور ایٹ۔ امریکہ نے معاہدے کے مطابق خوراک وقت پر نہ بھیجی۔ جان بوجھ کر امداد روک لی گئی۔ اس طرح ملک میں قحط پڑ گیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد، عوامی لیگ کی نا اہلی اور لوٹ کھسوٹ نے یوں بھی پارٹی کی مقبولیت تیزی سے کم کی تھی، لیکن قحط نے مجیب حکومت کی تقدیر پر مہر لگا دی۔''

فہمیدہ ریاض ہیبت زدہ ہوکر یہ باتیں سن رہی تھیں۔ ان کے دماغ میں ٹی وی کی فلم الٹی چل رہی تھی۔ دبلے، ہڈی سے چمڑی لگے ہوئے مویشیوں کی لاشیں لڑکھڑاتی ہوئی دوبارہ کھڑی ہو رہی تھیں۔ ننگے، سوکھے بھکاریوں کے غول آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی بجائے تیزی سے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک سوکھی ماری بنگالی بڑھیا جس کا چہرہ جھریوں کی بھرمار سے تڑخی ہوئی زمین جیسا تھا... جس کی شاید پچاس برس سے تصویریں کھینچی جا رہی تھیں، کیونکہ ہر تصویر میں وہی نظر آتی محسوس ہوتی تھی، بھیک کے لیے پتلی لکڑی جیسی دونوں بانہیں پھیلانے کی بجاے تیزی سے بانہوں کو نیچے گرا رہی تھی۔

میرے سامنے میز پر پرجاتن ہوٹل کا دیا ہوا محکمۂ سیاحت کا کتابچہ رکھا تھا۔ سرورق پر سات گنبد کے دریچے سے بوڑھی گنگا نظر آ رہی تھی، ڈوبتے سورج کی شفق میں نہایا ہوا منظر! دریا پر دور سے نظر آتی ہوئی نوکا اور پانی میں اس کی مرتعش تصویر۔

''کہیں یوں ہی تو نہیں کہتے لوگ یہ بات، کہ بس امریکہ نے ایسا کیا ہوگا؟'' میں نے پھر بے خیالی میں ایک تبصرہ سا کیا۔

''جب میں امریکہ میں تھا،'' پروفیسر خلیق نے کہا، ''تو میں نے ایسی دستاویزات خود دیکھی تھیں، جن سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد سے اب تک بنگلہ دیش میں قحط نہیں پڑا۔ خوراک کی قلت

تو پہلے جیسی ہی ہے۔''

کمرے میں خاموشی کا پریت گھوم گیا۔

ایسے دم سادھے کیوں بیٹھی ہیں؟ ارے بھائی، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔کون بڑی انوکھی بات سن لی ہے آپ نے؟ کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں کہ بڑی طاقتیں یہ سب کچھ کرتی ہیں۔

پھر بھی... کیسا لگ رہا ہے اس گھڑی؟ ذرا سچ سچ بتایئے گا۔کیسا لگ رہا ہے؟ کیسا لگ رہا ہے؟ کیسا...؟

اسے اچانک یاد آیا۔''یہ بات تو بھٹو صاحب نے بھی نہیں لکھی تھی، یہی والی۔''

''کہاں؟ کیا؟ کیا لکھ دیا تھا انھوں نے؟'' پروفیسر خلیق پوچھ رہے تھے۔

''وہ ان کی ایک کتاب تھی نا، متھ آف انڈیپنڈنس، تو اس میں انھوں نے لکھا کہ بڑی طاقتیں — اصل میں تو زیادہ تر امریکہ — جب چاہے غریب ملکوں کو جنگ کی آگ میں جھونک سکتا ہے، وغیرہ۔مگر انھوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ قحط بھی پڑوا سکتا ہے۔''

''آپ بھٹو صاحب کی شیدائی ہیں؟'' پروفیسر خلیق مسکرائے۔''بنگلہ دیش میں انھیں زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔''

''نہیں نہیں... ہم نے زیادہ تر یہ کتابیں ان کے انتقال کے بعد پڑھیں۔ ویسے گرفتاری سے کچھ دن قبل انھوں نے ٹی وی پر بھی کہا تھا۔یہی کہ سفید ہاتھی میرے پیچھے پڑا ہے۔''

اب پروفیسر خلیق چپ تھے اور کوئی دوسرا ہی بول رہا تھا۔

اور ان کا حشر بھی دیکھ لیا...؟ ان کا حشر... ان کا حشر... چوہے کی طرح مار دیا...

اسے پھر مجیب کے قتل پر مساجد میں شکرانے کی نمازیں یاد آئیں۔اگر آپ دو متضاد راستوں پر چلیں تو کتنی دور جا سکتے ہیں؟ اپنی قبر تک! اگر ناک کی سیدھ میں چلیں تب بھی وہیں تک جائیں گے۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ قحط کسی صورت حال کو وجود میں لانے کے لیے نہیں، صرف اسے تھوڑا سا آگے بڑھانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ایک چیز ہوتی ہے جسے فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں یعنی کہ تاریخ کیسے بنتی ہے، اس کے کیا محرکات ہوتے ہیں۔اور ایک چیز ہوتی ہے جسے مٹھیوں کا بھنچ جانا کہتے ہیں، آنکھوں میں گرم پانی کا آجانا کہتے ہیں۔بے بس غصہ بہت مضحکہ خیز ہوتا ہوگا، لیکن ایسے ہی تو بنتی ہے تاریخ۔

بھنچے ہوئے جبڑے کو ڈھیلا کرنے کے لیے اس نے سگریٹ سلگایا، اور ماچس گھسنے سے جو مغلیہ

گلکاریوں سے مشابہہ شعلہ بل کھا کر بلند ہوا اور پھر ماتھے کے تلک سا ساکت ہو گیا، اسے غور سے دیکھتی رہی۔ اسے دیکھ کر ہر بار اسے بےنظیر بھٹو کا خیال آتا ہے۔

یہ کتنا چھوٹا سا شعلہ ہے! اس نے دل سے کہا۔

اسی لیے تو اتنا خوبصورت ہے، دل نے بتایا۔

لیکن اے دل! ایک بات عجیب ہے، فہمیدہ ریاض نے دل سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، عجیب اور حیران کن! آدمی کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ طاقتور کمزوروں کو کچل ڈالتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود آج تک — منہ سے کوئی کچھ کہے ڈر کے مارے — مگر دل سے کمزوروں کو نہ طاقت کی عزت کرنا آیا اور نہ اس کے آگے ہار ماننا۔ رٹے جا رہا ہے آدمی کا دل کہ بھئی، کمزور کی جے، کمزور کی فتح، کمزور زندہ باد! ایک لاحاصل نعرہ کیوں لگائے جا رہا ہے؟ تجربے میں تو تمام تر اس کا الٹ ہے۔

میں نے ٹورسٹ بیورو کا چھاپا ہوا ڈھاکہ کا نقشہ اٹھایا اور زندہ بہار لین ڈھونڈنے لگی۔

''کہاں ہے؟ اس نقشے میں تو نظر نہیں آ رہی۔''

''رکشا والے کو پتہ ہوگا۔''

رکشا والے کو پتہ ہوگا کہ زندہ بہار لین کہاں ہے۔ اور لاحاصل نعرے کا تعلق غالباً خدا سے ہوگا۔ دستوئیفسکی کا یہی خیال تھا۔ یاد نہیں کرامزوف برادران کیسے اپنے باپ کے دائیں بائیں بیٹھے ایک دوسرے کے الٹ باتیں کرتے تھے؟

خدا ہے... خدا نہیں ہے... ہے... نہیں ہے۔
محبت ہے... نہیں ہے... ہے... نہیں ہے۔
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

زندہ بہار

ایک معمولی سی، پتلی گلی تھی۔

اس کا فرش پرانی اینٹوں کا بنا تھا۔ اس کے دو طرفہ مکانات زردی مائل تھے۔ پرانے، گمنام سے

مکان۔ کسی مکان پر کلونچ کے نشان تھے، جیسے کبھی جلایا گیا ہو، یا کسی نے جلانے کی کوشش کی ہو۔
ان مکانوں پر میری آنکھیں سفیدی کی طرح پھر رہی تھیں۔

''کون رہتا ہے یہاں؟''

''اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔''

''نہیں، لوگ تو رہتے ہیں۔''

''یہ نئے لوگ ہوں گے۔''

''کون رہتا تھا یہاں؟''

''میرے لیے یہ بتانا بالکل ناممکن ہے۔ آپ سمجھیں گے کہ میں پاگل ہوں۔ آپ جانتے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں ایک اچھی خاصی سمجھدار عورت ہوں۔ پھر بھی، فرض کیجیے میں بتاؤں، یہاں کچھ لوگ رہتے تھے۔''

''کہاں چلے گئے یہاں سے؟''

''یہاں سے وہ کہاں گئے، کن حالات میں گئے، میں ٹھیک سے نہیں جانتی۔ وہ بنگالی نہیں تھے۔''

''اردو اسپیکنگ؟''

ہاں۔ وہ اسی گلی میں رہتے تھے۔ اٹھارہ برس پہلے وہ چلے گئے۔ مگر اٹھارہ برس پہلے تک ان کی ساری زندگی اسی شہر میں گزری، شاید اسی گلی میں۔ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ یہیں، اسی شہر میں دفن ہیں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک کڑوی یاد نے اس کا گلا دبانا شروع کیا۔ نہیں، نہیں، نہیں! اس نے ہاتھ جوڑ کر، آنکھیں بند کر کے التجائیں کیں۔ شاید آنکھیں موند کر وہ کوئی منتر پڑھ رہی تھی، کڑوے شبدوں کو بھگانے کے لیے کوئی اپنے ہی شبد دہرا رہی تھی۔

آنکھیں کھلیں تو گلی کی جگہ ایک پھیلا بازو سامنے تھا۔ بنگال کا سانولا بازو، مٹی سے بنا، سانولا، چکنا، سوندھا۔ اس پھیلے بازو پر اس نے اپنی کھردری زبان پھیری اور نمکین ذائقہ چکھا۔ آنسوؤں کا، پسینے کا اور خون کا۔

وہ ایک سوچ میں ڈوب کر ساکت ہو گئی۔ کتنا عجیب دائرہ ہے، ہر چیز مٹی سے پیدا ہوتی ہے اور پھر اسی میں واپس چلی جاتی ہے، آدمی نے جیسے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کہا۔ پھر اسے نروان نہیں ملا۔ وہ ایک جہنم میں جلنے لگا۔ تیاگ کی کوشش میں آدمی مسکرا سکتا ہے۔ اس کے روئیں جاگ سے گئے۔ آدمی اس

طرح بھی مسکرا سکتا ہے جیسے کائی چھٹ جائے، اور تالاب میں پورا چاند نظر آ جائے... بس ایک چھن کے لیے... مٹی میں جان پڑ جاتی ہے... جمے ہوئے خون کے لوتھڑے میں جان پڑ جاتی ہے۔ ایک زبان اس کے دہن میں داخل ہوگئی... گرم، نوکیلی اور بے قرار۔ بے قرار زبان... بے صبری سے پوشیدہ راستے کھوجتی، دستک دیتی ہوئی نسوانی رحم پر... بس گھڑی بھر کے لیے... دوبارہ مٹی بن جانے سے پہلے۔

بند آنکھوں سے اس نے آنسو روک لیے۔

''آپ کیا سوچنے لگیں؟''

''سوچتی ہوں، مٹی بھی حسرت کرتی ہوگی زندہ ہو جانے کے لیے۔''

کرتی ہوگی... مر جائے گی حسرت میں۔

ہاں۔ مگر مٹی تو نہیں مرتی۔ باقی کے سب عناصر تو مر جاتے ہیں۔ آگ، ہوا اور پانی... لیکن مٹی نہ مرتی ہے، نہ گلتی سڑتی ہے۔

کیوں نہیں مرتی... اس نے اپنے آپ کو تلخی سے کہتے ہوئے سنا۔ کیوں نہیں مرتی کمبخت...

''آپ شاعر ہیں؟ میں نے سنا ہے'' پروفیسر خلیق اس کے انہماک کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''نہیں تو،'' اس نے کہا اور دل میں یہ سوچ کر ہنسی کہ پاکستان میں اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔

''مگر میں نے سنا ہے آپ لکھتی ہیں۔''

''لکھتی تو میں ہوں، کبھی کبھی، لیکن لکھنے سے زیادہ سمجھنا...''

''سمجھنا؟''

''ہاں، یہ ایک عجیب و غریب خواہش ہے انسان کی۔ آپ نے کبھی الفاظ پر غور کیا ہے؟ مثلاً سمجھنے کے لیے انگریزی میں ایک لفظ ہے 'گراسپ' کرنا۔ اس کا مطلب دراصل گرفت میں لانا یا لے آنا ہے۔ اصل بات شاید ہے بھی یہی۔ سمجھنا وغیرہ کچھ نہیں۔ اصل چیز زندگی کو مضبوطی سے گرفت میں لے آنے کی آرزو ہے۔ یہ آرزو ظاہر ہے پوری نہیں ہو سکتی۔''

یہ مکالمہ زندہ بہار لین کے وسط میں کھڑے ہو کر کیا گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ وہ رکشا چھوڑ چکے تھے۔

اسی گلی میں شاید کچھ گھبرائے ہوئے قدم پڑے ہوں گے۔

''پتہ نہیں... '' وہ ٹھیک سے نہیں جانتی۔'' وہ لوگ وہاں سے خود گئے، یا لے جائے گئے؟ کیا وہ کسی کیمپ میں رہے؟ یا کہیں اور؟ چند دن، یا چند راتیں، ان پر کیسی گزریں؟'' وہ آہستہ آہستہ پروفیسر خلیق سے کہہ رہی تھی۔

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے۔

دماغ میں جیسے کوئی کمرہ کسی آواز سے گونج رہا تھا۔

آج کی رات...

آج کی رات...

اس میں بھی ایک لطف تھا، جیسے کسی نے بہت نزدیک سے کہا، مرگِ انبوہ جشنے دارد۔

دہشت سے اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ وہ جلدی جلدی ٹٹول کر دو انسانی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی۔

سو جاؤ... سو جاؤ... اس نے کہنا چاہا۔ اِدھر... میرے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر سو جاؤ... میں صبح تک تمھیں بوسے دیتی رہوں گی۔ یہاں کوئی بھی نہیں آسکتا، کوئی بھی تو نہیں...

میں نے کسی سے سنا تھا... لندن میں کسی ہندوستانی نے بتایا تھا شاید... ڈھاکہ فتح ہونے کے بعد چند بہاریوں نے ایک تھانے میں پناہ لی۔ بنگالیوں کا ہجوم ان کے ٹکڑے اڑانے کے لیے تھانے کے باہر جمع تھا۔ اس تھانے پر اس وقت چند ہندوستانی فوجی موجود تھے۔ ہجوم کا اشتعال اتنا بڑھ رہا تھا کہ فوجیوں کے لیے بہاریوں کو پناہ دینا ناممکن ہوگیا تھا۔ مجبور ہوکر انھوں نے بہاریوں سے کہا کہ وہ پچھلے راستے سے بھاگ جائیں۔ وہ بنگالیوں کو دس منٹ تک روک سکیں گے، اب یہ ان کی قسمت ہوگی کہ وہ دس منٹ میں جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

وہ آہستہ آہستہ گلی کے آخری سرے تک پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنے کسی خواب میں چل رہی تھی۔

''چلیے، اس طرف سے رکشا لیتے ہیں،'' اس نے گلی کے دوسرے سرے کی جانب اشارہ کیا۔

اب وہ پھر زندہ بہار لین پار کر رہے تھے۔ وہ کبھی رک کر کھڑی ہو جاتی اور در و دیوار پر نظر ڈالتی۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں۔ نہیں، آخری نظر حسرت کی نہیں، شاید نفرت کی ہوگی۔

نفرت... آدمی کی نس نس میں کھولتی ہوئی، اتنی تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے... لب پہ لاؤں تو مرے

ہونٹ سیے ہو جائیں...

وہ اس گلی سے کیوں جانا نہیں چاہتی؟ یہ بتانا مشکل ہے۔آپ سمجھیں گے کہ میں پاگل ہوں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے،آپ جانتے ہیں۔لیکن اب کس بہانے سے وہ یہاں تھوڑا وقت اور گذار سکتی ہے؟ کس بہانے سے؟

وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔وہ یہاں اپنا گھر بنانا چاہتی ہے۔جیسے یہ گلی کسی آدمی کا دل ہو۔

مجھے یہاں سے مت نکالو۔ وہ گلی کے کنارے کھڑی ایک ضد سے روتی رہی۔

ذرا آپ خود تجزیہ کیجیے۔ یہ سب کیا پاگل پن ہے؟

کیسا تجزیہ؟ اس نے آنسو پونچھتے ، کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔کون کمبخت کچھ سمجھنا چاہتا ہے؟ آدمی آدمی کو گلے لگانا چاہتا ہے، اسے بوسہ دینا چاہتا ہے،ایک گرم بوسہ، نر اور ناری کا، جادو بھرا۔ آدمی کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔

میرے آد جگاد...

اے میرے آد جگاد...

آدمی آدمی کے پیچھے غول بنا کر دوڑنا نہیں چاہتا، اس کے اعضا الگ الگ کرنے کے لیے۔

آدمی دوسرے آدمی کی آنکھیں نکالنا چاہتا ہے۔ بدن سے سوئی کے ذریعے سارا خون کھینچنا چاہتا ہے۔آدمی عورت کو مار مار کر نیل ڈالنا چاہتا ہے۔

نہیں، نہیں، نہیں... وہ تو بس غصے میں... غصے میں اندھا ہو کر... کوئی ہمیشہ تھوڑا ہی... پھر وہی روتی دھوتی التجائیں۔

آپ اپنے آپ کو فرشتہ سمجھتی ہیں؟

نہیں، اس نے پریشان ہو کر کہا۔ میں تو اپنے بچوں تک کو مارتی ہوں۔ بس پہلا طمانچہ مشکل ہوتا ہے... اس کے بعد تو جیسے ہاتھ اپنے آپ اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر نیا طمانچہ اور زیادہ بے دردی سے پڑتا ہے۔ اس وقت میں اپنی طرف دیکھنا ختم کر دیتی ہوں... سارا دھیان بچے کو زیادہ سے زیادہ زور سے مارنے میں لگا ہوتا ہے۔

اس نے اپنی وہ کیفیت یاد کی اور شرمندگی سے مر جانا چاہا ... شرمندگی اور افسوس...

بچوں کو... سنا آپ نے؟ جو چھوٹے ہوتے ہیں، اپنے آپ کو بچا بھی نہیں سکتے۔ جیسے نہتے شکار اپنے آپ کو بلوائیوں سے نہیں بچا سکتے۔ جیسے شہید اللہ قیصر، ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو، اپنے دفاع میں

کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ الشّمس اور البدر کے کارکن انھیں گھر سے لے گئے تھے۔ پھر انھیں رات کے اندھیرے میں، کسی خفیہ مقام پر، دوسرے بنگالی دانشوروں کے ساتھ، اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا گیا۔ وہ ایک خوفناک رات تھی۔ ان کی چیخیں شاید کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ یا ان کے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا ہوگا۔ یا ہوسکتا ہے وہ چیخے چلائے ہوں۔ لوگوں نے اپنے گھروں میں لرزتے ہوئے ان کی چیخ و پکار سنی ہو، اور باہر نکلنے کی ہمت نہ کی ہو، یہاں تک کہ ان کی چیخوں کی آواز آنی بند ہوگئی ہو۔ وہ ۱۴ دسمبر کی رات تھی۔ ڈھاکہ کا محاصرہ ہو چکا تھا اور مخالف کی فتح یقینی تھی۔ اس عالم میں یہ سوچا گیا کہ چلو، کیوں نہ شکست سے پہلے اپنی پیاس بجھائیں۔ خون کی پیاس... ذلت اور مایوسی کی حالت میں خون کی پیاس بڑے زور سے بھڑکتی ہے۔

اور غصے میں، اور بے بسی کی جھنجھلاہٹ میں، میں اپنے بچوں کو سفاکی سے مار سکتی ہوں۔

سنو، سنو، سب مائیں اپنے بچوں کو مارتی ہیں۔ بعد میں تم روتی دھوتی بھی تو ہو... اس نے اپنے کو گھبرا کر سمجھایا۔

ہاں، ظاہر ہے! مجھ سے زیادہ ان سے کون پیار کرسکتا ہے۔ اور یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ میں انھیں کب مارتی ہوں۔ صرف اس وقت جب وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں، ایک دوسرے کو مار رہے ہوں۔ میں ان کے لیے اتنی پریشان ہوجاتی ہوں کہ انھیں خود مارنا شروع کر دیتی ہوں۔

یہ تو عقل کی بات نہیں... اس نے غور سے اپنے آپ کو دیکھا۔

نہیں، بالکل نہیں۔ شہید اللہ قیصر کو مارنا بھی عقل کی بات کہاں تھی؟ اس سے ڈھاکہ کی فتح رک تھوڑا ہی جاتی۔ لیکن آدمی کا چوبیس گھنٹے عقل سے واسطہ نہیں ہوتا۔

ہم اتنے مکروہ ہیں؟ اتنے ہولناک ہوجاتے ہیں؟

ہاں۔

تو پھر کیا ہوسکتا ہے؟

کچھ تو ضرور ہوسکتا ہوگا، اس نے کہا۔

پھر وہ زمین پر بیٹھ گئی، اور محمد پور کے جنیوا کیمپ کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ایک سو کھے مارے، بنگالی رکشا والے کو

پیش کیا۔

''کیا تم انھیں معاف نہیں کر سکتے؟''

رکشا والا ہنس پڑا۔ سانولے چہرے میں اس کے دانت چمکے۔ اس کی آنکھیں، سیاہ، بڑی بڑی، روشن آنکھیں بھی ہنس پڑیں۔

''اب کیا؟ مجھے تو یاد بھی نہیں۔ بس وہ تو... ایک بات ہونی تھی، ہوگئی۔''

''پھر تو کبھی یاد نہ کرو گے؟'' اس نے امید سے رکشا والے کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔

''یوں تو نہیں۔ ہاں، اگر تم گیہوں چاول بانٹنے لگیں، تب تو یاد آئے گا۔ پھر تو سب کچھ یاد آئے گا نا؟''

ایک دائرہ اس طرح مکمل ہوگیا۔

پھر وہ دل میں یہ سوچ کر ہنسی کہ محمد پور کیمپ کے بہاری، اس طرح بنگالیوں سے انھیں معافی دلوانے کی کوشش پر اس کی کیا گت بنا سکتے ہیں۔

اب اسے جانا ہے۔ اسے یہاں سے جانا ہے۔ اب وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔

''کون سے مکان میں رہتے تھے آپ کے شناسا لوگ؟''

''یہ تو پتہ نہیں،'' اس نے بے بسی سے کہا۔

پروفیسر خلیق کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر انھوں نے جھجک کر پوچھا، ''کیا کرتے تھے وہ لوگ یہاں؟ رضا کار بن گئے تھے؟''

وہ سوچتی رہ گئی۔ وہ کیا جواب دے سکتی تھی؟ حقیقت تو یہی تھی کہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

''پتہ نہیں،'' اس نے کہا۔

ہوسکتا ہے... کچھ بھی تو ہوسکتا ہے... کہ وہ بنگالیوں کی مخبری کرتے ہوں! الشّمس یا البدر میں شامل ہوگئے ہوں! ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات، ہوسکتا ہے، وہ شہید اللہ قیصر کے گھر جانے والوں میں سے ہوں!

یا ہوسکتا ہے ایسا کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

''وہ ایک معمولی خاندان تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ...'' اب وہ رک رک کر کہہ رہی تھی، ''پاک فوج کے ملٹری ایکشن سے لے کر نو مہینے تک انھوں نے جو کچھ بھی کیا، وہ... وہ بالکل غیر حقیقی ہے۔''

''غیر حقیقی؟''

''ہاں،'' اس نے پورے یقین سے کہا۔ ''اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، جو بنگالیوں نے کیا وہ بھی۔ اور جو بھیونڈی میں ہوا، اور میرٹھ میں، اور مراد آباد میں، اور علی گڑھ کالونی کراچی میں، وہ بھی بالکل، سراسر غیر حقیقی ہے۔ یہ آدمی کی مستقل صورتِ حال نہیں ہے۔''

یہ محض ایک رومانی خواہش ہے کہ آدمی کی صورت حال یہ نہ ہو...

رومانی خواہشوں کا، جسے آپ حقیقت کہتے ہیں نا، اس میں دخل ہے۔

اس نے مڑ کر زندہ بہار لین کی طرف دیکھا جو اب پیچھے چھوٹتی جا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ کہاں چھوٹتی ہے کوئی گلی... ایک بار دیکھ لی جائے تو۔

تم نے اسے کہاں دیکھا؟

اپنے دل میں... ہاں، اپنے ہی تو دل میں۔ میں اسے کیسے جھٹلاؤں! وہ ایک لمبی بحث میں الجھ گئی۔ محبت ہے۔ ہاں، میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے آدمی کو مسکراتے دیکھا ہے۔

دیکھیے، آپ کو غلط فہمی...

چپ ہو جایئے۔ فضول کی باتیں نہ کیجیے۔

کہاں دیکھ لیا مسکراتے ہوئے آدمی کو؟ ٹیکسلا میں؟

ٹیکسلا؟ نہیں۔ وہاں تو میں برسوں سے گئی نہیں۔ نہیں، میں نے ترک کی کوشش میں نہیں، آدمی کو خواہش میں، خواہش کے حصول کے امکان میں مسکراتے دیکھا ہے۔ اپنے دل میں، اپنے دل میں... میں نے آدمی کو محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

دریا کی ہوا میں بھیگی سانولی شام پرانے ڈھاکہ پر اتر رہی تھی۔

پرانا ڈھاکہ... انیسویں صدی میں بنا ہوا ڈھاکہ۔ پتلی پتلی گلیوں کے اینٹوں کے فرش، جہاں اب رکشائیں چلتی ہیں۔ پیچھے ہی تو بستی ہے۔ بوڑھی گنگا ہے۔ پاس گھاٹ ہے، وائز گھاٹ۔ ایک انگریز افسر مسٹر وائز کے نام پر گھاٹ کا نام پڑا۔ وہاں ان کی کوٹھی بھی ہے۔

''یہاں تک آ گئے ہیں تو آپ کو نواب سلیم اللہ کی کوٹھی بھی دکھا دیں۔''

یہ شہر کا شمال مشرقی حصہ ہے۔ یہ اتنا پرانا ہے کہ چند گلیاں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی ابھی تک جوں کی توں موجود ہیں۔

''اور انھی پیچ دار گلیوں میں ہے بلبل آرٹ اکیڈمی۔'' پروفیسر خلیق نے ایک اونچی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ چلیے، آج آپ کی وجہ سے ان سے بھی مل لیتے ہیں۔''

ان کی رکشا ایک حویلی جیسی عمارت کے پاس رکی۔ کچھ تہہ خانے نما سیڑھیاں چڑھتے وہ اوپر پہنچے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے ابتدا کے زمانے کی بنی ہوئی یہاں ایسی کئی کوٹھیاں ہیں جو نیل کی کاشت کروانے والے انگریزوں نے بنوائی تھیں۔ ان کے بھاری بھرکم منقش چوبی دروازے اتنے مضبوط تھے کہ اب تک انھیں وقت سے گزند نہ پہنچی تھی۔

مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا — جیسے وقت میں پیچھے کی جانب سفر کرتے ہوں۔

یہ ایک دوسرا بنگالی گھرانہ تھا۔ دیوار پر کعبہ شریف کی تصویر، اور ایک سو برس پرانا وال کلاک۔ محرابی دریچوں پر سوتی پردے شام کی ہوا کے جھونکوں میں لہرا رہے تھے۔ صاحبِ خانہ لنگی پر بش شرٹ پہنے وسیع و عریض دالان میں بے حد معمولی فرنیچر کے درمیان ٹہل رہے تھے۔ یہ ریٹائرڈ جج تھے۔ بی بی اندر کمرے میں مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ بیٹی اور داماد، دونوں ڈھاکہ یونیورسٹی میں علمِ کیمیا کے استاد، اس وقت ملنے آئے ہوئے تھے۔ معمولی تنگیل کی سوتی ساری میں، بیٹی ماتھے پر چمکدار بندی لگائے بیٹھی تھیں۔

میں اب تک بہت تھک گئی تھی۔ ہاتھ منھ دھونے کمرے میں گئی۔ تخت پر خوب کڑھا ہوا تخت پوش پڑا تھا۔ غور سے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ کسی بحری سفر کی پوری کہانی تخت پوش پر کشیدہ تھی۔

''یہ کانتھا ہے، نقشی کانتھا۔ بنگلہ دیش کی خاص کشیدہ کاری،'' کیمیا کی استاد رونق جہاں بیگم نے مجھے بتایا۔ ''یہ بہت پرانا نقشی کانتھا ہے۔ کوئی ساٹھ ستر برس پرانا ہوگا۔ اب تو اس فن میں وہ صفائی نہیں رہی۔''

میں حیرت سے بحری بیڑوں پر سوار انگریزوں اور میموں کی شکلیں دیکھتی رہی۔ کتنی صفائی اور مشاقی سے کشیدہ کی گئی تھیں۔ ''انھیں بنگال کی جادوگرنیوں نے کاڑھا ہے،'' میں نے کہا۔

رونق جہاں بیگم ہنسنے لگیں۔ ''یہاں جب انگریز آئے، اور انھوں نے یہاں کے دستکاروں کا ہنر دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔''

''میں نے ڈھاکہ کی ململ تو ابھی تک دیکھی ہی نہیں،'' میں نے تاسف سے کہا۔

''وہ تو اب آپ کو میوزیم میں ملے گی۔ ہاں وہی جسے بنانے والوں کے انگوٹھے کٹوا دیے جاتے تھے۔ اٹھارھویں صدی میں جب انگریزی غلبہ مکمل ہو چکا تھا، تو انھوں نے شوق میں ہماری سلک اور بھاری تنگیل کی ساریوں پر ہمارے دستکاروں سے اپنی تصویریں بنوائیں۔''

رونق جہاں بیگم نے اپنی ماں سے بنگالی میں کچھ کہا۔ وہ کمرے سے ملحق کوٹھڑی میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک بھاری، سوتی تنگیل کی ساری لائی۔ اور میرے سامنے اس کی پرتیں کھول دیں۔

جیسے کوئی حیرت کا باب کھل جائے!

پلّو پر ساری کی بُنت میں ایک دخانی انجن۔ سایہ پہنے ایک میم چھتری کھولے کھڑی تھیں۔ ایک صاحب بہادر سولا ہیٹ پہنے، منھ میں پائپ۔ یہ کسی نیل کوٹھی کے رہنے والے صاحب تھے۔

میں اس نادر پلو کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ انگلیاں پھیر پھیر کر دیکھ رہی تھی۔ یہ ساری ہاتھ کی بنائی تھی، ہتھ کرگھے کا کام، مگر کتنا دلچسپ، جیسے تاریخ کے کسی باب کو ان ہنرمند انگلیوں نے سوت میں محفوظ کرلیا تھا۔

''لاجواب!'' میں نے کہا۔

''بس ایک کسر رہ گئی تھی،'' رونق جہاں بیگم نے مجھے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''جب آپ یہ ساری پہن کر پلّو ڈالیں تو صاحب، میم اور انجن، سب الٹے لٹک جاتے ہیں۔''

ہم ہنسنے لگے۔ شاید انگوٹھے کٹوانے والوں نے، ان کی بیویوں نے انھیں جان بوجھ کر الٹا لٹکایا تھا۔

''آیئے چھت پر چلیں۔ وہاں سے گھاٹ نظر آتا ہے۔ اور دریا بھی۔''

اس نیل کوٹھی کے عقب میں ایک وسیع احاطے میں پھوس کی جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ فاصلے پر اچانک گنگا۔

فہمیدہ نے سوچا تھا، بوڑھی گنگا سفید بال کھولے لیٹی ہوگی۔ بالکل بوڑھی ہوگی۔ سامنے وہی گنگا سانولا بدن آسمان کے سامنے عریاں کیے لیٹی ہولے ہولے سانس بھر رہی تھی۔

وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

کب دیکھا تھا آخری بار؟ الہ آباد میں... ہے نا؟ وہیں تو... سنگم پر... میں نے کہاں سوچا تھا، تمھیں پھر دیکھ لوں گی۔

وائز گھاٹ پر ایک دونو کائیں بندھی تھیں۔

اور گنگا پر تیرتے آرہے تھے اس کے دوستوں کے مکھڑے: کرن، سوشیلا، مشرا جی، ورما۔

میں تمھیں خط نہیں لکھتی نا! جب سے آئی ہوں، تمھیں خط نہیں لکھا۔ میں ڈرتی ہوں، پھر پولیس نہ پیچھے لگ جائے۔

وہ آنسو پیتی کھڑی رہی۔گنگا کو پرنام بھی نہ کیا۔

پھراسے کچھ سوچ کر ہنسی آئی۔وہ کہتے ہیں: ہم نہیں لیتے، ہندوستان رہ کر آئی ہے، جھوٹی ہوگئی۔

ارے واہ! دھوبی کے طعنے پر رام جی نے اپنی پتنی واپس نہ لی۔

کیا وہ جھوٹی ہوگئی ہے؟

ہاں۔ جھوٹی تو وہ ہوگئی ہے اوپر سے نیچے تک... کسی کا منھ لگایا پیالہ، خوب پیا ہوا۔کوری تو وہ نہیں۔ اچھا اے زندگی، اے زندگی، تو نے مجھ پر خوب گہرے گہرے رنگ چڑھائے۔ مجھے تو نے کورا نہ چھوڑا۔نکلی نہ میں ایک عاشق جیوڑا۔سندھی میں کیا کہتے ہیں، عاشق زہر پیاک!

فہمیدہ ریاض نے نیل کوٹھی کی چھت پر بوڑھی گنگا کے سامنے ایک عدالت لگا لی۔

یہ ہندوستان سے پیار کرتی ہے—الزام۔

جی ہاں—اقبالِ جرم۔

آخر کیوں؟

اس نے کوئی مناسب وجہ سوچنی چاہی۔ ایک بھی نہ سوجھی۔ آخر اس نے اصلی وجہ بتا دی۔ دل سے مجبور ہوں۔

گنگا پر سورج نارنجی ہونے لگا تھا۔ دسمبر کا نرم سورج۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے یہاں آئے تین دن ہو چکے تھے۔ وقت کیسے گزرا، پتہ ہی نہیں چلا۔ تین دن میں پہلی بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ ارے، اس میں تو ابھی تک پاکستانی وقت ہے۔ اس نے ابھی تک بنگلہ دیش کے وقت کے مطابق سوئیاں سیٹ نہ کی تھیں۔ پورے ایک گھنٹے کا فرق تھا۔ اسے پھر ہندوستان یاد آیا۔ وہاں آدھے گھنٹے کا فرق ہے۔

پولیس تو آپ کے پیچھے اب بھی ہے۔ آپ کی فائلیں بند تھوڑا ہی ہوئی ہوں گی۔

نہ ہوں۔ بعض لوگوں کو فائلیں چلانے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ شوق پورا ہوتا رہنا چاہیے۔

آپ کو پروا نہیں؟

ہے۔ مگر میں کر کیا سکتی ہوں؟

چھت کے بالکل نیچے، تقریباً ساتھ لگے ہوئے میدان میں، سرکنڈوں کی جھونپڑیوں میں خستہ حال بنگالی یومِ آزادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اونچی آواز سے قومی ترانوں کا ٹیپ چلا کر ناچ رہے تھے۔ شاید کچھ پیے ہوئے بھی ہوں گے۔

کون ہیں یہ؟ بنکر، جلاہے، انگوٹھے کٹوانے والے لوگ۔

''اب دیکھیے، ان میں اور محمد پور کیمپ کے باسیوں میں، سچ پوچھیے تو ان کی حالت میں کوئی فرق ہے نہیں،'' پروفیسر خلیق آہستگی سے کہہ رہے تھے۔

ہے، دل نے کہا۔ غربت کے ساتھ ایک اور بھی احساس، کہ اس زمین نے انھیں تھوک دیا ہے، یہ زمین ان پر تنگ ہے۔ یہ نفسیاتی دباؤ آدمی کو پاگل کر سکتا ہے۔

محمد پور کیمپ میں اس نے کہا تھا، ''تو بھائی، اب تو یہاں مذہبی تحریک زور پر ہے۔ آپ مقامی جماعت اسلامی سے مدد کیوں نہیں...'' ایک شدید بخار جیسے ذہنی تشنج میں وہ جماعت اسلامی تک سے ان کی مدد کرانے کو تیار تھی۔ سوچ رہی تھی، موقع ملا تو کسی سے ملتی ہوں۔

''ارے کہاں کی جماعت صاحب! یہ سب بنگالی پہلے ہیں، پھر کچھ اور۔ کوئی نہیں آئے گا مدد کو۔ کوئی نہیں...''

وہ نزدیک ترین جھونپڑی کا انتہائی نفاست سے بنا ہوا چھپر دیکھنے لگی۔ یا خدا! سوکھے پتوں کو ریشم کے دھاگوں کی طرح بنا ہے۔ دوہرا چھپر، اوپر کا نمونہ کچھ اور، نیچے کوئی دوسرا۔ یہ جادوگروں کی بنائی ہوئی دستکاریاں ہیں۔

پھر کچھ ہوا۔ ایک پانچ چھ برس کی بچی، بال بکھرائے، پرانی بدرنگ فراک میں، ننگے پیر اور ننگی ٹانگوں چھپر پر چڑھتی آ رہی تھی۔ اوپر پہنچ کر اس نے بغل میں دبایا چھوٹا سا پرچم کھولا — بنگلہ دیش کا سبز اور سنہرا پرچم — اور جھونپڑی پر لہرا دیا۔ وہ سانس روکے بچی کا کرتب دیکھ رہی تھی۔ پرچم دائیں بائیں ڈولتا آخر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تب اس نے سانس لی۔ آنکھ میں یہ منظر ایک تصویر کی طرح کھنچا تھا، جیسے پانی میں تیرتی تصویر۔

بچی سرکنڈوں کی دیوار سے نیچے اتر گئی۔

نیچے، گول کمرے میں بنگالی مٹھائیاں۔

''یہ لیجیے لال موہن،'' کسی نے اسے گلاب جامن دیتے ہوئے کہا۔اور یہ میٹھا دہی، ڈھاکہ کا میٹھا دہی، مٹی کے کونڈے میں۔ اور یہ کھیر ہے۔ یہ کیسی کھیر ہے؟ بالکل نئے ذائقے کی۔ اسے کھجور کے گڑ سے بناتے ہیں۔اور ناریل کی مٹھائیاں۔

وہ بھوکوں کی طرح کھائے جا رہی تھی۔

دماغ میں گھنٹی بجی۔ بھوکے بنگالی! بچپن سے اس نے یہ لفظ سنے تھے۔ بھوکے بنگالیوں کی طرح کھا رہی ہو... بھوکے بنگالی... بھوکے بنگالی... بنگلہ دیش میں بنگالیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اسے یہ توہین آمیز الفاظ یاد آئے۔

یہاں قحط بہت پڑتا ہے نا،اس نے خود کو سمجھایا۔

ریٹائرڈ جج صاحب، پروفیسر خلیق کے برعکس، بالکل ''ٹائپ'' نکلے۔

''آپ انھیں غریب نہ سمجھیے گا،'' انھوں نے جھگیوں کی طرف اشارہ کیا۔''ارے پیسہ تو ان کے پاس ہم سے زیادہ نکلے گا۔''

''کیا بُنتے ہیں یہ؟ ساریاں؟''

''آج کل تو شالیں بُنتے ہیں۔اور جانتی ہیں، اون بڑا سستا ملتا ہے انھیں۔ ارے وہی جو امریکن کپڑا آتا ہے۔ پرانا لنڈے بازار کا۔'' کراچی میں معزز خواتین اسے 'ایل بی' کہتی ہیں: چلو ایل بی سے شاپنگ کر کے آتے ہیں۔''تو پرانے امریکی سویٹروں کو ادھیڑ کر اون کات کر اونی دھاگا بناتے ہیں،اور بن دیتے ہیں شالیں۔ آپ نے نہیں دیکھیں؟ یونیورسٹی روڈ پر زمین پر ڈھیر لگا کر بیٹھتے ہیں۔ یہ ڈھیر کی ڈھیر شالیں۔ بہت خوبصورت۔ ساٹھ ٹکا کی ایک شال۔ دن میں کتنی بیچ دیتے ہوں گے!''

کتنے کاریگر ہیں بنگالی... کمال کے کاریگر۔

''بہاری تو ان سے بڑھ کر! ہم یہ بات آپ کو بتا رہے ہیں۔ کرسی پلنگ بنوانا ہو تو، یا دوسرا بجلی وِجلی ٹھیک کرانی ہو تب،ہم تو بہاری کو بلائیں گے۔ وہ بات بھی کم کرتے ہیں۔ پالیٹکس پر تو بولتے ہی نہیں۔''

کس نے سوچا ہوگا، امریکن پرانے سویٹر،امداد میں دی گئی یہ بھیک، یہ بدصورت اترن، بنگلہ دیش

کے فنکار، صناع ہاتھوں میں جا کر، اتنی خوبصورت شالوں میں بدل جائیں گے۔ ساٹھ ٹکا کی ایک شال۔ ان ہاتھوں کے سامنے تو دنیا بھر کے لوگ اپنے انگوٹھے کاٹ کر پھینک دیں!

جج صاحب اسے بنگلہ دیش کی عدلیہ کی اہمیت بتا رہے تھے۔ ''شیخ مجیب کے پہلے دور میں بنگلہ دیش کا صدر کون تھا؟ ایک جسٹس۔ جسٹس سعید چودھری۔ مجیب قتل ہو گئے تو مشتاق کھونڈکر نے دوسرے ہی دن پھر انھیں بلا لیا، کابینہ کا ممبر بنا دیا۔ خالد مشرف نے کھونڈکر کا تختہ الٹا تو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صائم کو ملک کا صدر بنا دیا۔ خالد مشرف کا تختہ الٹا، تب بھی جسٹس صائم صدر بنے، بلکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔''

فہمیدہ ریاض سن رہی تھیں۔

انھیں صبح کے ایک اخبار کا اداریہ یاد آ رہا تھا: ''آج کا دن یہ سوچنے کا نہیں کہ کس طرح شیخ مجیب کے وفادار سیاست دانوں نے ان کے قاتلوں کا ساتھ دیا، پھر قاتلوں کے قاتلوں کی کابینہ میں بھی شامل ہو گئے...''

اتنی بہادری میں، اتنی ننگی موقع پرستی گندھی ہے۔ چوٹی کے بل کی طرح نہیں جسے کھولا جا سکے... گوشت میں ناخن کی طرح پیوست، جسے اکھاڑو تو ہاتھ خونم خون ہو جائے۔

''لیکن...'' اس نے پوچھا۔ ریٹائرڈ جج بنگلہ دیش کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف معلوم ہو رہے تھے۔ کیوں نہ ان سے پوچھو۔ ''لیکن کرنل ابو طاہر کو کیوں پھانسی دے دی گئی؟''

''وہ...'' جج صاحب ٹہلتے ٹہلتے بینت کی بنی ایک پرانی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''سچ تو یہ ہے کہ بات کچھ صاف نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے زچ ہو کر سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

''اچھا دیکھو، ہم بتاتے ہیں،'' انھوں نے لنگی سنبھال، کرسی پر پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے شروع کیا۔ ''بھئی، بات یہ ہے کہ فوج میں جاتیو سماج تنترک دَل کا کچھ اثر تھا۔ یہ ایک طرح کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ سات نومبر کے انقلاب میں کچھ دستے اسی پارٹی کے سنگ تھے۔ شروع میں ضیاء الرحمٰن نے ان کی باتیں بھی مانیں؛ اس پارٹی کے صدر ایم اے جلیل اور جنرل سیکرٹری اے ایس ایم اے رب کو جیل سے رہا کر دیا۔ انھیں شیخ مجیب کے ٹائم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پھر چھوٹتے ہی انھوں نے کیا کیا؟ ضیا کی اصلاحات کا مذاق اڑایا، اور جے ایس ڈی کے جھنڈے تلے 'انقلابِ مسلسل' کا نعرہ دیا۔''

یہ ۱۹۷۵ء کی بات تھی اور ابھی ماوزے تنگ کے افکار کا اثر کافی تھا، میں نے سوچا۔

''ان کا خیال تھا، فوج اس مسلسل انقلاب کی رہنمائی کرے۔ فوج میں اپنے سیل بنائے تھے۔ ان کا نام رکھا تھا، بپلوبی گنو باہنی۔ فوج میں راتوں رات اتنے پمفلٹ بانٹے گئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور انقلابی سپاہیوں کی کاؤنسل بنالی، بپلوبی سینک پریشد۔ چار نکاتی عملی پروگرام پہلے بنایا۔ نمبر ایک، فوج میں آفیسر اور سپاہی کا فرق ختم کر دیا جائے۔ نمبر دو، سپاہیوں سے بیرے اور اردلی کا کام لینا بھی ختم کیا جائے۔ نمبر تین، جو جونیئر کمیشنڈ آفیسر سینئر آفیسروں کے ساتھ تعاون کریں گے وہ انقلاب کے دشمن ہیں۔ اور چوتھا نکتہ یہ تھا کہ جب تک پہلے تین مطالبے پورے نہیں ہو جاتے، سپاہی ہتھیار بند رہیں گے۔ اب ہوا یہ کہ ان خفیہ میٹنگوں اور پمفلٹ بازی سے فوج میں تو ڈسپلن کا بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ پمفلٹوں میں کھلم کھلا لکھا تھا کہ میجر جنرل ضیاء الرحمٰن عوام کے مفادات کے خلاف راستہ لے رہے ہیں اور امریکہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔''

''یہ لوگ امریکہ کے بھی خلاف تھے اور روس کے بھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں روس کے، ہندوستان کے، سب کے خلاف تھے۔ چینی اثر تھا،'' جج صاحب نے بتایا۔

''یہی تو وہ فوجی تھے جو ۶ نومبر کی رات سڑکوں پر 'عوام سپاہی، ایک ہو جاؤ' کے نعرے لگاتے انقلاب لائے تھے۔ لوگ بھاگ دوڑ کے ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس رات ڈھاکہ فوجیوں اور عام لوگوں کے ملے جلے نعروں سے گونج رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں جاتیو سماج تنترک دل کا کام تھا۔''

بالکل انقلابِ روس کا سا سماں ہوگا، میں نے دل میں سوچا۔

جلیل اور رب نے طبقاتی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن فوج کے اندر سپاہیوں نے اس کا یہی مطلب نکالا تھا کہ یہ افسروں اور سپاہیوں کی طبقاتی جنگ ہے۔ آخر ان میں بھی تو طبقے تھے۔ اس لیے کئی مقامات پر جوش اور غصے میں بھرے سپاہیوں نے افسروں اور ان کے پورے پورے خاندانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

''اب یہ تھی صورت،'' جج صاحب نے کہا۔ ''یہ افواہ بھی نہایت سرعت سے گشت کر رہی تھی کہ انقلابی فوجی کاؤنسل کے سربراہ، لیفٹیننٹ کرنل ابو طاہر ایک دوسرا انقلاب لایا ہی چاہتے ہیں۔

''دیکھیے، یہ بات مت بھلایئے کہ...'' جج صاحب نے اسے یاد دلایا۔ ''مجیب کے زمانے میں جو ہمارے ہندوستان کے ساتھ پچیس سالہ معاہدۂ دوستی پر دستخط ہوئے تھے، اس کے مطابق، اس قدر حالتِ انتشار میں ہندوستانی فوجیں بالکل دخل اندازی کر سکتی تھیں۔ یہ خطرہ موجود تھا۔ حالت یہ تھی...'' انھوں نے ہاتھ

پھیلا کر کہا، ''آرمی کا ڈسپلن اسی حد تک بکھر چکا تھا، اور غیر یقینی تھا کہ جے ایس ڈی کے لیڈروں کو گرفتار کرنے کے لیے نئی نئی بنائی گئی کومبیٹ پولیس فورس کو استعمال کرنا پڑا۔ آرمی افسروں کو پولیس نے گرفتار کیا۔''

فہمیدہ ریاض استعجاب سے سوچ رہی تھیں۔ بنگلہ دیش میں پولیس نے بھی کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پولیس کے بارے میں ہمارے یہاں تو ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن پاکستانی فوج سے سب سے پہلے بھڑ جانے والے بھی بنگالی پولیس کے دستے تھے۔ مختلف حالات میں اس طرح کی تنظیموں تک کا کردار کس طرح بدل جاتا ہے! کسی تجزیے میں کوئی حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان میں تو ہم تلخ مذاق کرتے تھے: بہت ہوگئی فوجی کو دِتا، اب کی بار پولیس کو موقع ملنا چاہیے۔ ہم تو بھائی، ہر قسم کے یونیفارم کو سلام کرتے ہیں۔

''تو اس شدید کشمکش میں ضیا جیت گئے، جے ایس ڈی ہار گئی۔ کوئی پچیس نومبر تک فوج کا ڈسپلن بحال ہوگیا۔''

''اور لوگ؟ عوام؟''

''عوام یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ شدید مایوسی اور غم کے عالم میں عوام اس کشمکش کو دیکھ رہے تھے۔ پچیس نومبر کو جب ضیا نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا، اور یہ کہا کہ انقلابی بنگلہ دیش کی فوج کو کمزور کرکے پورے ملک کو بھیانک خطرے میں ڈال رہے ہیں، تو عوام اس کے ساتھ تھے۔''

''اور کرنل ابو طاہر کی حمایت؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ اس وقت تک ختم ہو چکی تھی،'' یہ پروفیسر خلیق کہہ رہے تھے۔

''اور یہ سب... صرف چند دنوں میں ہوگیا؟''

''ہاں، صرف چند دنوں میں۔ وہ وقت ہی ایسا تھا۔''

''اس طرح،'' ریٹائرڈ جج نے مجھے نتیجہ بتایا، ''ابو طاہر کے زوال کی وجہ وہی تھی جو شیخ مجیب اور خالد مشرف کے زوال کی وجہ تھی۔ بنگال کے عوام نے شیخ مجیب کا ہندوستان کے ہاتھ کٹھ پتلی بن جانا پسند نہیں کیا۔ خالد مشرف کا کسی بیرونی ملک کے اشارے پر کچھ کرنا پسند نہیں کیا۔ اور یہ بات ان کے دل کو لگی کہ ابو طاہر بھی بنگلہ دیش کے ملکی اور قومی مفاد کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔

''اس طرح بظاہر خاموش تماشائی نظر آنے والے عوام نے تین مرحلوں پر ہر قیمت پر بنگلہ دیش کی آزادی اور قومی خودمختاری کے حق میں فیصلہ دیا۔''

اتنا طاقتور ہوتا ہے یہ جذبہ؟ ہاں... اتنا طاقتور!

لیکن، اس نے سوچا، ابو طاہر کے ارادے تو اس کی سچی سوچ کے مطابق بنگال کے عوام کے مفاد ہی میں تھے۔ لوگوں نے یہ کیوں نہ سوچا؟

ارادے تو شیخ مجیب کے بھی ان کے مطابق اچھے ہی تھے، کسی نے اسے جواب دیا۔ لیکن ہو کیا رہا تھا؟ لوگ صرف ارادے تو نہیں دیکھتے، جو کچھ اصل میں ہو رہا ہوتا ہے اسے بھی تو دیکھتے ہیں۔ ارادے حالات پر محیط تو نہیں ہوتے۔ حالات اور واقعات اپنے طور پر رونما ہوتے ہیں۔ ہاں، اگر کبھی حالات اور ارادوں کا اتصال ہو جائے تب بات بن جاتی ہے۔

''یہ ایک قبل از وقت انقلاب تھا،'' میں نے سوچ سے نکل کر نتیجہ اخذ کرنا چاہا۔

''اب آپ اس کا جو چاہیں مطلب نکالیں۔ جو حقیقت تھی میں نے آپ کو بتا دی۔''

اسے پھر دستوئیفسکی یاد آنے لگا۔ اس کی ایک تحریر، نوٹس فرام دی انڈر گراؤنڈ۔

''آدمی اپنے مفاد میں کام کرنا چاہتا ہے۔''

''ہونہہ! چاہتا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر، مفاد سے بڑھ کر، آدمی اپنی مرضی سے کام کرنا چاہتا ہے۔ اپنی مرضی سے... سنا آپ نے؟''

آدمی کی طرح قومیں بھی، وہ سوچ رہی تھی، فائدے سے بھی بڑھ کر اپنی مرضی۔ جمہوریت کی تہہ میں اور ہے کیا؟

اس نے پرانی نیل کوٹھی کے دالان میں بیٹھ کر دستوئیفسکی کو داد دی، اور سوچا کہ فی الحال اسے جدید نفسیات کا جدِ امجد مان لیا گیا ہے، ایک دن جدید سیاست سے اس کا رشتہ بھی لوگوں پر کھلے گا۔ اور مزے دار بات یہ ہے کہ اس کی ان تحریروں کو نی ہلزم سمجھا جاتا ہے۔ نوٹس فرام دی انڈر گراؤنڈ اس نے نی ہلسٹ تحریروں کے مجموعے ہی میں پڑھا تھا۔

''تو اس طرح کرنل ابو طاہر کو پھانسی دے دی گئی،'' میں نے سانس بھر کر کہا۔ ''پھر لوگ کیوں کہتے ہیں کہ بات صاف نہیں؟''

''وہ تو اس لیے،'' جج صاحب مجھے بتانے لگے، ''کہ کرنل طاہر کو جب گرفتار کیا گیا، انھوں نے اپنے بیان میں اس ارادے سے انکار کیا تھا کہ وہ دوسرا انقلاب لانے کی تیاری میں تھے۔ اور اس لیے بھی کہ...

'' وہ رک رک کر بتانے لگے، '' جے ایس ڈی کا موقف یہی رہا کہ ضیا کو اقتدار میں لانے والے تھے ہی کرنل طاہر۔ تین نومبر کو جب بریگیڈیر خالد مشرف اور بریگیڈیر شفاعت جمیل نے حکومت سنبھالی تو انھوں نے ضیاء الرحمٰن کو چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدے سے برخاست کر دیا تھا۔ پھر انھیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ جے ایس ڈی کا کہنا ہے کہ اس وقت ضیاء الرحمٰن نے ابو طاہر سے فون پر رابطہ کیا۔ ضیاء الرحمٰن کا کہنا تھا کہ گھر کا فون ہی کٹا ہوا تھا، یہ بات بالکل غلط ہے کہ ابو طاہر سے میں نے رابطہ کیا۔''

میں کچھ حیرانی سے یہ سب سنتی رہی۔ اچھا خاصا گورکھ دھندا تھا۔ لیکن یہ سب تفصیلات بنگالیوں کے لیے کتنی اہم تھیں — یہ جو مجھے اپنے فاصلے سے ایک قطعی غیر عقلی، لاحاصل، بے مقصد خونیں ڈراما نظر آتا تھا۔

اب ہم واپس پروفیسر خلیق کے گھر جا رہے تھے۔

'' آج کا دن آپ کے نام، '' انھوں نے کہا تھا۔ رات کے کھانے سے پہلے کتابوں کے شیلف پر مجھے بنگالی ادب کا انگریزی ترجمہ نظر آیا۔ میں کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی۔ پھر میں نے کہا، '' دل چاہتا ہے بنگالی کا ترجمہ براہِ راست اردو میں کیا جائے۔ کئی لفظ مشترک ہیں۔ بعض میں تو صرف تلفظ کا فرق ہے۔ آپ تو اردو شاید پڑھ نہ سکتے ہوں گے؟'' میں نے تقریباً بے خیالی میں کہا۔

'' میں اردو پڑھ بھی سکتا ہوں اور لکھ بھی سکتا ہوں۔''

'' کیا؟'' میں نے انھیں غور سے دیکھا۔

'' ہاں، '' پروفیسر خلیق نے رسان سے اردو میں کہا۔ '' میری والدہ بہار کی ہیں۔''

اور اس کے بعد جیسے کسی جادو سے اس بنگالی گھرانے کی زمین پھٹی اور کسی پاتال سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ زمین کی دراڑ پھر بند ہوگئی۔ دو معمر بہاری خواتین، تانت کی سپید پھولدار کناری کی ساریاں پہنے میرے سامنے تخت پر بیٹھی تھیں۔ پروفیسر خلیق کی والدہ اور بیوہ خالہ۔

'' بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، '' بہار کی شہری نفیس اردو میں وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

پروفیسر خلیق انھیں بتا رہے تھے کہ میں کون ہوں، آج کہاں کہاں گئی۔ پاکستان کا نام سن کر دونوں کے بوڑھے چہرے کھل گئے۔ سب کے قریبی رشتے دار تو وہیں تھے۔

پروفیسر خلیق اب اپنی مادری زبان بول رہے تھے۔ '' امی، ہم آج محمد پور کیمپ گئے۔'' دونوں

خواتین تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔

میں ششدر بیٹھی یہ کایا کلپ دیکھ رہی تھی۔ یا مظہر العجائب!

تب ہی تیر کی طرح سن سے ایک خیال اس کے دل سے گزر گیا۔ خلیق چھپاتا ہے... چھپاتا ہے کہ اس کی ماں بہاری ہے... اردو اسپیکنگ۔

دن کے معمولی واقعات تصویروں کی طرح اوپر تلے ذہن میں آ رہے تھے۔ یونیورسٹی میں بنگالی پروفیسروں کے سامنے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ ''جی ہاں، مگر بہاری تو ہماری سوسائٹی میں ضم ہونا نہیں چاہتے!'' محمد پور کیمپ میں اس کا ہمدردانہ رویہ۔ کسی اور بنگالی نے تو ذرہ برابر دلچسپی کا اظہار نہ کیا تھا۔

''ارے بھتہ دیتے ہیں بھتہ، پولیس کو۔ ایسے رہتے ہیں یہاں بہاری!'' کیمپ میں لڑکے ہاتھ ہلا ہلا کر اس کے سر پر چڑھے آ رہے تھے۔ اور پورا کمرہ جیسے کسی دبی سرگوشی سے سنسنا سا رہا تھا۔ یا شاید خود اس کا ذہن اس اچانک انکشاف پر سنسنا گیا تھا۔

تو ایسے ہوتے ہیں ضم؟ وہ سوچ رہی تھی۔ اور اسی وقت اس کے ذہن میں ایک اور خیال آ رہا تھا، پہلے کی طرح صاف اور تیر کی طرح دل پر لگنے والا خیال۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بنگال میں بہاریوں کے حال سے بہتر ہے۔ وہ بھی اپنی اصل چھپاتے ہیں، مگر صرف بلووں کے دوران، اکیلے دکیلے ہوکر۔ عام حالات میں تو نہیں۔

کھانے کے بعد پرجاتن ہوٹل جاتے ہوئے اس بار انھوں نے اسکوٹر رکشا لی، جیسی کراچی میں چلتی ہیں۔ کرایہ پھر بھی طے کرنا پڑا۔ بیس ٹکا، نہیں پندرہ، نہیں بیس۔ ڈھاکہ میں ایک ایک ٹکے پر سودے بازی کرنا دن کے روزمرہ کا ضروری حصہ ہے۔ کوئی دو بار سوچتا بھی نہیں۔ پر یہ ہے زندگی کا انداز۔ ہر آدمی صبح سے شام تک جینے کی قیمت میں کتنے ٹکے کم کراتا ہے؟

بھری پُری شاہراہ پر اچانک بتیاں گل ہوگئیں۔ ڈھاکہ پاور ہاؤس فیل ہوگیا تھا۔ وہ بھی عام ہے۔ اس طرح سودے بازی ختم ہوئی۔ اسکوٹر رکشا میں بیٹھ کر وہ ایک اندھیری سڑک پر چل پڑے۔

اب وہ پھر اکیلی تھی۔ اور گنگا کنارے کھڑی تھی۔ مہندر ناتھ مشرا: وہ تو وہاں نہ تھے۔ لہروں پر بہتی آ رہی تھی ان کی کویتا، سطر سطر:

املتاسی شام

برگد کی جٹائیں تھام
جھولی
نیم کے نکھ شتر پھولوں کی
مہک سے
راہ بھولی
گنگا میں سورج کا نارنجی تھال ڈوبتے ڈوبتے جیسے تھم سا گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔
گنگنی یہ گھام
پیڑاتی چڑیا سانجھ کی
دِیوس کی اس آخری مسکان میں
چھتری
تمھارے انگ کی ہلدی
سناٹے میں خزاں کے بھورے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے چاروں طرف اڑ رہے تھے۔
توڑسم موہن اچانک
اُڑے پھیکی روشنی میں
کاگ دَل کے دَل
شادیانوں کے اڈتے شور میں
دب گھُٹ گیا
وِدا کا وہ اتھرو گیلا
ایک نازک پل

پرجاتن ہوٹل میں وہ بستر پر لیٹتے ہی ایک بھاری نیند میں داخل ہوگئی تھی اور خواب دیکھ رہی تھی۔ خواب میں اسے کسی شخص کا باپ نظر آرہا تھا۔ وہ چار خانے کی لنگی پر بنیان پہنے زندہ بہار لین کے فرش پر سر پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ خواب میں وہ بہاری نہیں بلکہ بنگالی تھا۔ لیکن عورت خواب میں بھی اس بات کو اچھی طرح

سمجھ رہی تھی کہ وہ بہاری ہے اور دراصل ڈھاکہ میں کہیں دفن ہے۔

پھر ہوٹل کے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

فہمیدہ ریاض چونک کر اٹھی۔ گھنٹی نہ جانے کب سے بج رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رسیور اٹھایا۔ اس کی میزبان پروفیسر ہوٹل کے استقبالیے سے بول رہی تھیں۔

''آپ کے کمرے کے ساتھی آ گئی ہیں، ہندوستان سے۔ خوشبیر جین۔ معاف کیجیے آپ کو سوتے سے اٹھایا۔ دراصل فلائٹ...''

ہندوستان سے! سوتے دماغ نے گھبرا کر سوچا۔ میرے کمرے میں ہندوستانی!

دماغ کا دوسرا حصہ حساب لگا رہا تھا: سکھ ہے، اس کے نمبر بڑھیں گے۔ پاکستانی حساب دانوں کے لیے آج کل ہندوستانی سکھ خطرناک نہیں۔

تقریباً سوتے ہوئے، میں نے دروازے کا تالا کھول دیا، کمرے میں روشنی کر دی، اور واپس بستر میں لیٹ کر گہری بے خواب نیند سو گئی۔

۱۷ دسمبر

آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ اس نے جلدی سے بے خیالی میں دراز سے گھڑی نکال کر پھر دیکھی۔ وہی پرانا وقت تھا۔ استقبالیہ فون کر کے وقت معلوم کیا۔ اوہو، اتنی دیر ہو گئی!

جلدی سے دو لوٹے پانی بدن پر ڈال کر، بالوں میں برش کرتی وہ ناشتے کے لیے پہنچی۔ نیچے تو پورا ہندوستانی ڈیلی گیشن وفد براجمان تھا۔ مسز صمد اس کا سب سے تعارف کرا رہی تھیں۔

''ڈاکٹر کول۔ دلی یونیورسٹی سے۔''

ڈاکٹر کول نے اسے پہچان لیا۔ ''ارے آپ تو فہمیدہ...'' انھوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ پھر جلدی جلدی سب حال احوال۔

ذرا دیر میں پتہ چلا، وفد کے آدھے سے زیادہ رکن تو بنگالی ہی تھے۔ اور سب کے سب مشرقی بنگال ہی کے رہنے والے تھے جو اب مغربی بنگال سے آ رہے تھے۔

خوش شکل بنگلہ دیشی پروفیسر مغربی بنگال کی جادوپور یونیورسٹی کی ایک خاتون لیکچرر کے ساتھ بیٹھے

تھے۔ یہ ایسی تھیں جیسے شرمیلا ٹیگور کوئی دس پندرہ برس پہلے۔ دونوں میٹھی بنگالی میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ کومیلا کے تھے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے ایک خاتون پروفیسر بالکل فلم ایکٹریس راکھی کی ہم شکل، جیسی وہ اب ہے۔ ان کے والدین راجشاہی سے گئے تھے۔

راجشاہی یونیورسٹی سے دو خواتین پروفیسر۔ ایک تو بنیائن دکھائی پڑ رہی تھیں اور دوسری سردارنی، خوشبیر۔ چاندی کے تار جیسے بال، کشمیری کڑھائی کا کرتا شلوار پہنے، اس کی روم میٹ شفقت سے مسکرا رہی تھیں۔

رنگ برنگی جادو بھری ساریاں پہنے بیٹھی تھیں ہندوستانی مہیلائیں، فہمیدہ ریاض کو شدت سے ہندوستان کی یاد دلاتی۔ یہ خواتین نہیں جانتی ہوں گی کہ وہ ان کی ساریوں کو سمجھتی ہے۔ ان میں گندھی زبانیں اور تہذیبیں۔ مراٹھی اور ملیالم اور تلگو۔ جیسے نقشے پر ہاتھ پھیر کر دکن کی کھردری سطح مرتفع کو محسوس کرو۔

تھوڑی دیر میں اس نے سب سے دوستی کی اور کسی کو اپنی گھسی پٹی کہانی نہ سنائی۔

سات برس وہاں بتائے، مٹھی میں بند رکھے سات برس کی پونجی۔ لیکن یہ ڈھاکہ تھا... ان کے لیے بھی اسی طرح اجنبی اور آشنا۔

شرمیلا ٹیگور کہہ رہی تھی، ''ڈھاکہ مجھے ہندوستان کے کسی چھوٹے شہر جیسا لگ رہا ہے۔'' راکھی پوچھ رہی تھیں کہ کیا ایک دن میں راجشاہی جا کر واپس آ سکتے ہیں۔ دونوں ٹھاٹھ سے بنگلہ بھاشا بول رہی تھیں۔ خوشبیر اور مایا ان کا منھ تک رہی تھیں، فہمیدہ ریاض کی طرح۔ مگر فہمیدہ ریاض سوچ رہی تھیں کہ ان کی طرح کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو پاکستانی تھیں، اور یہ... یہ مشرقی پاکستان تھا۔ جی جناب!

مگر مر بھکے بنگالیوں کو تو دیکھو! عاشق ہوئے جا رہے ہیں دونوں ہندوستانی بنگالنوں پر۔ دادا پردادا کی جنم بھومیاں دکھانے کے وعدے کر رہے ہیں۔

فہمیدہ ریاض، سردارنی خوشبیر اور مارواڑی مایا دیوی نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ ذرا سی دیر میں یہ اتحاد ٹوٹ گیا۔ سب ہندوستانی اب مہذب خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھے زرِ مبادلہ کا حساب لگا رہے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی سب کی رقم دگنی ہو گئی تھی۔

کیوں دگنی ہو گئی رقم؟ ٹکے کی قیمت کم ہے۔ اتنی کم؟ ہندوستانی روپے سے اتنی کم؟

اتنا غریب ہے بنگلہ دیش؟ اپنے خون پسینے میں نہا کر اتنا غریب؟

بہت دن پہلے وہ کھوج لگاتی پھرتی تھی دہلی میں۔ آخر ہندوستان کے تعلقات کیوں خراب ہو گئے بنگلہ دیش سے؟ ہفت روزہ سیمینار کے مدیر نے اسے اپنے دفتر میں بیٹھ کر پائپ میں تمبا کو بھرتے ہوئے بتایا تھا۔

''بھائی، یہ بمبئی کے مارواڑی سیٹھوں کی لالچ... ساریوں کے بدلے ڈسٹر بھجواتے تھے بنگلہ دیش۔''

''اچھا تو کیا بس یہی؟''

''بنگالی ہر بات میں برابری چاہتے ہیں۔ برابری کے پیچھے مرے جا رہے ہیں۔''

آدمی برابری چاہتا ہے۔ نہیں رہ سکتا اس کے بنا۔ اور برابری ہے نہیں دنیا میں۔

میرے پاس چند اردو کے رسالے تھے۔ کسی نے آتے ہوئے تھما دیے تھے۔ ''ڈھاکہ میں اردو کے ایک ادیب رہتے ہیں۔ انھیں دے دیجیے گا۔'' میں ان تک کیسے پہنچ سکتی تھی؟ میزبان پروفیسر نے کہا تھا، ''ارے انھیں کبیر سے ملا دو۔ وہ اردو کے مشاعرے کراتے ہیں۔''

''کیا؟ اردو کے ابھی ہوتے ہیں مشاعرے؟''

''ہاں ہاں۔ واہ، کیوں نہیں! ڈھاکہ یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ لے جاؤ ان کو۔''

وہ ایسی جگہوں پر جانے کے لیے آئی تھی جہاں لے جانے میں کسی مقامی کو دلچسپی نہ ہو۔ مگر اردو ڈپارٹمنٹ کا سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ چلو اچھا ہوا، بہت وقت گزر گیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو ڈپارٹمنٹ قائم ہے، اور پھر سے آباد ہو گیا۔

''تو کیا اردو بولنے والے لوگ پڑھاتے ہیں وہاں؟''

''نہیں، ہیں تو سب بنگالی۔''

ایک طالبہ کو پکڑ کر وہ جدید زبانوں کے کمپلیکس میں آئی۔ اردو اور فارسی کا مشترکہ شعبہ تھا۔ بہت اشتیاق سے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک بھولی بھالی بنگالن چشمہ لگائے بیٹھی تھیں۔

''آپ نے اردو کہاں سے سیکھ لی؟''

''میں کئی برس پاکستان میں تھی۔ فادر کی پوسٹنگ وہاں تھی۔ گورڈن کالج پنڈی سے ایم اے کیا۔ اردو میں۔ ویسے مدر، وہ تو اردو اسپیکنگ ہیں۔''

تھوڑی دیر میں دوسری پروفیسر داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ طباق سا روشن، رنگ میدہ اور شہاب، رخساروں سے جیسے ابھی خون ٹپکا۔ سوتی ساری پر انھوں نے چادر اوڑھ رکھی تھی، اور سر ایسے ڈھانپا تھا کہ ایک بال بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ان کا طویل نام تھا: امت الخادم العلی۔

''آپ کی زبان بھی اردو ہے؟''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔''

''آپ کی والدہ ہندوستان سے آئی ہوں گی؟''

''جی نہیں،'' وہ مسکرائی۔ ''ہمارا خاندان چار سو برس سے یہیں آباد ہے، یہیں پرانے ڈھاکہ میں۔ آپ ہمارا گھر دیکھیں گی؟''

ذرا دیر میں میں ان کے سنگ نو کے پر سوار پھر پرانے ڈھاکہ جا رہی تھی۔ چوری چوری ان کو بہت دلچسپی سے دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ سوچ کر دل میں مسکرا رہی تھی، خوشی اور حیرت سے، کہ میں ایک چار سو برس پرانی خاتون کو دیکھ رہی ہوں۔

''آپ اہلِ سنت ہیں یا اہلِ تشیع؟'' انھوں نے بہت نفاست سے دریافت کیا۔ اوہو! تو اسی لیے یہ چادر وغیرہ۔ امام خمینی کا اسلامی انقلاب! میں گڑبڑا گئی۔ کیا کہوں؟ آخر بولی، ''اہلِ سنت۔'' پھر مزید گھبرا کر اضافہ کیا، ''حنفی بریلوی،'' جو کہ ایک حقیقت ہے۔ خدا جانے یہاں شیعہ سنیوں کے کیسے تعلقات ہیں! اس لیے میں نے اپنے دفاع میں کچھ اور اضافہ کیا۔

''بریلوی شیعوں کو اتنا برا، یعنی غلط نہیں سمجھتے۔ ہم تو محرم بہت اہتمام سے مناتے ہیں۔ کھچڑا پکتا ہے۔ سبیل لگتی ہے۔ ہاں وہابی... وہابی... دوسری قسم کے ہوتے ہوں گے۔''

''جی!'' انھوں نے نہایت متانت سے کہا۔

فہمیدہ ریاض اپنی ہرزہ سرائی پر مزید شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئیں۔

''میں آپ کو حسینی دالان لے جا رہی ہوں،'' امتل بیگم نے اسے بتایا۔ ''پرانے ڈھاکہ کی ایک زبان اردو بھی ہے۔''

''جی؟''

''جی ہاں۔''

اب وہ ایک بڑی سی حویلی میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے بھائی بند برآمدے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ سب نے چار خانوں کی لنگیاں اور بش شرٹیں پہن رکھی تھیں۔

''دراصل یہ شادی کا گھر ہے۔ میری بھانجی کی کل شادی ہے۔''

باغیچے میں دلہن کے لیے ایک منڈپ سجا تھا، جیسا انڈیا میں ہندوؤں کے گھر سجایا جاتا ہے۔ کیلے کے پتوں سے ڈھانپ کر گل مہر کے سرخ پھولوں سے آرائش کی گئی تھی۔ منڈپ پہ کچھ لڑکے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ایک گول چکر میں بجلی کے ذریعے گھومتے ہوئے جلتے بجھتے بلبوں سے نام لکھے اور مٹائے جا رہے تھے۔ نام انگریزی میں تھے: شہلا اور سراج۔ یہ دلہن اور دولہا کے نام تھے۔

انھوں نے مجھے حویلی دکھائی۔ پورا خاندان بڑے کمرے میں جمع ہو گیا۔ ''یہ بی بی پاکستان سے آئی ہیں۔'' تھوڑی دیر میں مجھے سو برس پہلے لکھا ہوا سہرا دکھایا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں، نہایت صاف ستھری اردو میں سہرا لکھا گیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں اس برس مولانا محمد حسین آزاد نے لسانیات پر اردو کی پہلی کتاب تصنیف کی تھی، سخندانِ فارس۔ ان کا خیال تھا کہ ژند، پاژند وغیرہ دراصل پراکرتی بولیاں تھیں۔

''آپ لوگ پاکستان نہیں گئے؟''

''لو، واہ، ہم کیوں جاتے؟''

''آپ کو کسی نے کچھ کہا نہیں، فسادات میں؟''

''نہیں تو۔ حسینی دالان، اور ڈھاکہ میں بسے قدیم خاندانوں کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ سب جانتے ہیں۔ ایک بار بازار میں ہم اردو بول رہے تھے۔ کوئی کہنے لگا، یہ بہاری ہیں، اردو بولتے ہیں۔ ہم نے کہا، واہ، اب اگر کوئی سلہٹیا بولے تو وہ بنگالی نہیں کہلائے گا کیا؟ سب چپ ہو گئے۔''

''سلہٹ کی زبان کچھ اور ہے؟''

''ارے بنگالی کی بہت سی بولیاں ہیں۔ وہ بالکل فرق ہے۔''

''بنگال میں اسلام کیسے آیا؟''

''خلجیوں کے ذریعے۔ ۱۲۰۴ء میں۔ وہ شمالی ہندوستان والے خلجی نہیں۔ یہ دوسرے تھے، ترک، پیشہ ور سپاہی۔ لیکن ہمیں تو مغلوں نے بسایا۔ جہانگیر نے۔''

''آپ لوگوں کے نام اتنے عربی کیسے ہیں؟ یہ تو ترک یا مغل اثر نہیں لگتا۔''

''وہ دراصل سمندر کے راستے تجارت ہوتی تھی نا عربوں سے۔ سو وہی اثر ہے۔ اصل میں تو اسلام سمندر کے راستے سے آیا۔ بڑے بڑے بزرگانِ دین سمندر کے راستے آ کر بس گئے۔''

''یہ عمارتیں ساری اینٹوں کی ہی بنی ہیں؟''

''ہاں۔ مٹی ہی تو ہے بنگال میں۔ مٹی اور پانی۔ پتھر نہیں ہوتے یہاں۔ اینٹیں بناتے ہیں۔ لال اینٹ۔ اسی لیے ہماری محرابیں عربی وضع کی ہیں۔ ایک خم نہیں ہوتا، وہ تو پتھر کاٹ کر بناتے ہیں۔ اینٹوں سے محراب کو پھول کی پتیوں جیسے کئی کٹاؤ دے کر بنائے ہیں۔''

میں دیواروں پر لگے آرائشی ٹائل دیکھتی رہی۔ امتل کے بڑے بھائی آرکیٹیکٹ ہیں۔ نام محمد الحسین۔ مجھے بتانے لگے، ''ہمارے آرائشی ٹائل پورے ہندوستان سے الگ ہیں۔ مسجدوں میں زنجیروں اور گھنٹیوں کے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ یہ سلطانی فنِ تعمیر ہے، مغلوں سے پہلے کا۔''

''زنجیریں اور گھنٹیاں تو مندروں میں بناتے ہیں،'' میں نے کہا۔

''بناتے ہوں گے۔ اسلام میں منع تھوڑا ہی ہے۔ بس جاندار کی شکل نہیں بناتے۔ حضرت پانڈوا جامی اور چھوٹا سونا مسجد کے گل بوٹوں کی تعریف تو کننگھم نے بھی کی ہے۔ الیاس شاہی اور حسین شاہی زمانے کی ہیں۔''

''میں نے سنا ہے، یہاں مشاعرے بھی ہوتے ہیں۔''

''اردو میں تو کچھ لوگ کر کرا لیتے ہیں۔ غزلوں کا شوق تو ہے نا یہاں بھی۔''

''بنگالیوں کو؟''

''جی ہاں۔ نذرالاسلام نے بھی غزلیں لکھی تھیں۔''

''بنگالی میں؟''

''جی ہاں، بنگالی میں غزلیں۔''

امتل کے دوسرے بھائی ہاکی کے کوچ ہیں۔ بنگلہ دیش ٹیم کے ساتھ دو بار پاکستان ہو آئے ہیں۔

''آپ لوگ ماشاءاللہ خوشحال ہیں۔ یہ کیمپ والے بہاریوں کی کچھ مدد کیوں نہیں کرتے؟''

''ارے، کیا بتائیں! اصل مسئلہ تو کچھ ہے ہی نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ حکومت نے خود مسئلہ بنا رکھا ہے۔ اس بہانے امداد امدو مل جاتی ہے نا۔ تو آدھا مال خود کھا بجاتے ہیں، آدھا بہاریوں کو دے دیتے

ہیں،'' انھوں نے کافی بیزاری سے کہا۔

واپسی پر امتل بیگم نے مجھ سے تقریباً درخواست کی۔

''ایک صاحبہ (ان کا نام اور پتہ) کراچی میں بہت اچھی مجلس پڑھتی ہیں۔ پہلے ہر سال آتی تھیں۔ دو برس سے نہیں آئیں۔ اگر آپ ان سے...''

میں نے ان سے پکا وعدہ کیا کہ میں ان صاحبہ کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کروں گی۔ لوگ اپنے اپنے خیالوں میں رہتے ہیں اے میری جان! میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔

''ان گلی کوچوں میں بے شمار اردو بولنے والے مل جائیں گے،'' پیچ در پیچ، سرخ اینٹوں کے فرش والے گلیاروں سے گزرتے ہوئے مجھے امتل نے بتایا۔ اس پر مجھے خیال آیا، اردو ادیب کا پتہ یا فون نمبر، مجھے کچھ بھی نہ مل سکا تھا۔

''میں پھر آپ کے پاس آؤں گی،'' میں نے انھیں وارننگ دی۔

برٹش کاؤنسل میں بے شمار خواتین اور حضرات کا اصرار تھا:'' کراچی میں فلاں صاحب سے ملیے گا... پنڈی میں فلاں... لاہور میں...''

انگریزی ادب پڑھنے اور پڑھانے والے یہ تمام لوگ، جواں سال نسل، کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھنے والا طبقہ، سول سرونٹس کی اولادیں؛ سب کے والدین برسوں مغربی پاکستان میں ملازمتوں پر رہ چکے ہیں۔

اس کے بھوت نے پھر اسے ستانا شروع کیا۔

''ارے بھئی، یہ کیمپوں میں کچھ سوشل ورک کیوں نہیں کرتے؟'' شام تک بے شمار خواتین اور حضرات بور ہو چکے تھے۔ شدت سے بیزار۔

''اب کیا کیا کریں؟ ہمارے اپنے مسائل کچھ کم ہیں۔ کبھی سائیکلون آجاتا ہے، کبھی قحط کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے...'' شام تک سب اس سے کترا کر نکل رہے تھے؛ ایک تو یہ خاتون نہ جانے کہاں جانے کی خواہش کریں گی۔

شام تک جا کر کہیں اس کی سمجھ میں آیا کہ بنگالی اس سے بیزار ہو چکے ہیں۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔

بہاری۔ وہ بنگال کے ورق کے حاشیے میں ہیں۔لیکن یہ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں یہاں صرف بہاریوں کا ذکر کرنے، ان سے ملنے، انھیں دیکھنے کے لیے نہیں آئی ہوں۔

لیکن لگ تو بالکل ایسا ہی رہا ہے۔

یہ سچ نہیں ہے۔ بات دراصل کچھ اور ہے۔

کیا بات ہے؟

اس نے اپنے خیالوں کو باقاعدہ دعوت دے کر بلایا۔

وہ اس وقت اپنے بستر میں تو تھی نہیں جو بے بس ہوتی۔ اسے یہ عجیب سا احساس ہوا، جس پر وہ کافی حیران بھی ہوئی، کہ ایک ناقابلِ فہم دماغی عادت کے باعث سونے کے لیے لیٹتے وقت آدمی اپنے آپ پر گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے، اور طرح طرح کے خیالوں کے ریلوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ گویا وہ اس کے پسپا وجود پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ بیٹھے ہوئے انھی خیالات کا مقابلہ زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے ایک آدمی کے لبوں پر ایک نہایت حسین اور لطیف مسکراہٹ کے بارے میں صاف ذہن سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ہرگز کسی آرزو کے شکنجے میں نہ تھی، مگر بیٹھے ہوئے ہونے کے باوجود اس کا دل پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بے خیالی ہی میں اس نے مٹھی میں گھاس کو بھینچ لیا — جیسے بی بی مریم نے دردِ زہ میں گھاس کو پکڑا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہی اس نے مٹھیاں ڈھیلی کر دیں۔

کیسی ہے یہ مسکراہٹ؟ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟

شاید، شاید کسی نوزائیدہ بچے کے لبوں پر۔ یہ اتنی معصوم اور حسین مسکراہٹ، جس کے منھ سے ابھی ماں نے چھاتی جدا کی ہو، جس کے ہونٹوں پر دودھ کا ایک آدھ قطرہ لرز رہا ہو، اس نے سوچا۔ پھر خوب ہنسی۔ یہ تبسم وہ ایک پورے سارے آدمی کے لبوں پر کس طرح منتقل کر پائی تھی؟ لیکن پھر اسے چپ سی لگ گئی۔ ہاں، مسکراہٹ تھی تو ایسی ہی، ایک پورے آدمی کے لبوں پر نوزائیدہ کا تبسم۔ اسی لیے تو... اسی لیے تو اس کی سانس رک گئی تھی۔ بس ایک بار... ایک بار... ایک بار اور یہ مسکراہٹ دیکھ لے... ایک بار اسے چھو لے... یا صرف دیکھ ہی لے۔ کیوں؟ یقین کرنے کے لیے؟ نہیں، اس کے یقین میں تو کوئی کمی نہ تھی۔ یہ تو بے قراری تھی، کسی ممکن کو وجود میں لانے کی بے قراری...

مگر میری جان، نوزائیدہ کا تبسم تو بے دانتوں کا ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا؟

بچے کے بھی دانت نکل آتے ہیں تو وہ ماں کی چھاتی میں کاٹنے لگتا ہے۔ پھر ماں دودھ چھڑا دیتی ہے۔مگر نہیں۔یہ تبسم... یہ تو ایک پورے آدمی کے لبوں پر تھا جس کے منھ میں دانت تھے اور وہ کاٹ سکتا تھا، گوشت میں دانت گاڑ کر خون کا فوارہ نکال سکتا تھا،لیکن کسی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر رہا تھا۔ابھی چند لمحے پہلے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس تیز چل رہی تھی۔کچھ دیر پہلے اس نے ایک آدمی کا ہاتھ نرمی سے تھاما تھا،اپنے دونوں ہاتھوں میں، جیسے وہ ہاتھ نہ ہو،کوئی نرم دھڑکتا ہوا پرندہ ہو۔دو ہاتھوں کے انتہائی نرم حلقے میں یہ تیسرا ہاتھ، جو کسی اور بانہہ سے جڑا تھا،ایک مکمل ہستی بن گیا تھا... ایسی مسرت سے کانپتا ہوا جس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا،گویا وہ دو ہاتھوں کی پناہ میں چلا گیا ہو،قطعی محفوظ۔اسے انگلیاں بریدہ کرنے یا سوئیاں چبھانے یا انگاروں پر رکھ دیے جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔یہ ایک ایسی مسرت تھی جس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا اور جو صرف حقیقت ہی ہوسکتی ہے۔

جس طرح فہمیدہ ریاض اچھی طرح جانتی تھیں کہ آدمی کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تخیل سے بعید تھی، کیونکہ وہ صرف حقیقت ہی ہوسکتی تھی اور اسی لیے انھوں نے اسے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا ہے۔

لیکن وہ اسے چوم نہ سکی تھی۔شاید... کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے چوما نہ جاسکتا ہو؟

اس نے آنکھیں کھولیں۔برٹش کاؤنسل کا لان تقریباً خالی ہو چکا تھا۔وہ سراسیمہ ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ارے! یہ تو سب لوگ جا رہے ہیں۔میں اپنے ہوٹل کیسے پہنچوں گی؟ گھبرا کر نیم اندھیرے میں کوئی جانا پہچانا چہرہ تلاش کرنے لگی۔خوش قسمتی سے مسز محیط ابھی گئی نہیں تھیں۔وہ اسی کو تلاش کر رہی تھیں۔خوشبیر ان کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

مسز محیط خوش ہوکر بولیں، لیجیے آپ دونوں روم میٹ اب ساتھ ہی چلے جایئے گا۔"

فہمیدہ ریاض اور خوشبیر رکشے میں بیٹھ کر پرجاتن ہوٹل کی جانب چل پڑے۔فہمیدہ ریاض نے سڑک کے اندھیرے میں اپنی ہمسفر کی جانب دیکھا (پاور ہاؤس پھر فیل ہو چکا تھا) اور اندھیرے میں جی کھول کر مسکرائی۔وہ ایک ہندوستانی کے ساتھ اندھیرے میں اکیلی چلی جا رہی تھی،اور کسی کو پتہ بھی نہ تھا!

جسبیر سنگھ

تو آج وہ اکیلی نہیں تھی۔

فہمیدہ ریاض دل ہی دل میں خوب ہنسی۔آج رات روز کی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کرنی پڑیں گی جن کے باعث ہوٹل کے بیرے انھیں اگر دیوانی نہیں تو خبطی ضرور سمجھنے لگے تھے۔مثلاً یہ کہ رات کو بیرا جب پانی رکھنے آتا، یا اگر وہ چائے منگاتیں اور بیرا چائے لے ہی آتا، تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس وقت تک کے لیے کمرے سے باہر چلی جاتیں جب تک وہ خود باہر نہ نکل آتا۔پہلی رات تو بے حد آزمائش کی تھی۔ایک آدمی ہاتھ میں مچھر مار دوا کی فلش گن لیے آیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اور دوڑ کر دروازے میں اڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا کرتے ہو؟''

''فلِٹ میم صاحب۔یہاں مچھر بہت ہوتے ہیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔''

''مگر... مچھر... میم صاحب...''

''کوئی بات نہیں... مجھے ایسے ہی پسند ہے۔آئی لائیک اٹ دِس وے۔''

''واٹ؟ یو لائیک موسکیٹوز؟''

فہمیدہ ریاض کو مارے گھبراہٹ کے ہنسی نہ آئی۔جب تک انتظامیہ کا مشتبہ فرد واپس نہ چلا گیا، ان کی سانس درست نہ ہوئی۔پھر بھی وہ مطمئن تھیں کہ یکے بعد دیگرے کئی راتیں انھوں نے مشتبہ افراد کی انھیں قتل کرنے کی کوشش کسی نہ کسی ترکیب سے ناکام بنا دی تھی۔ورنہ دروازہ مضبوطی سے بند کر کے وہ تمام کھڑکیاں کھول دیتی تھیں۔اگر کوئی سمجھے کہ اس طرح رات کو کوئی ان کے کمرے میں داخل ہوسکتا تھا، تو اس کا جواب یہ تھا کہ اس صورت میں دوسری کھڑکی سے وہ بھی باہر چھلانگ لگا سکتی تھیں۔

لیکن آج تو وہ ٹھاٹھ سے بستر پر نیم دراز اپنی روم میٹ کو دیکھ رہی تھیں جو اب اپنا سامان الماری میں لگا رہی تھیں۔خوشبیر جی کی پشت ان کی طرف تھی۔اور وہ چپکے چپکے مسکرا رہی تھیں۔آخر ان سے رہا نہ گیا، کہہ ہی دیا:

''کیسا لگ رہا ہے ہندوستان راجیو کے بغیر؟''

خوشبیر چونک کر مڑیں۔پھر بڑی احتیاط سے بولیں، ''ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔'' وہ کافی حیران تھیں۔پکی ہندوستانی سردارنی پاکستانی عورت کے ساتھ نروس محسوس کر رہی تھیں۔آخر جلدی جلدی فہمیدہ

نے انھیں اپنی گھسی پٹی داستان سنا دی۔ڈاکٹر خوشبیر سب کچھ بھلا کر پوری آنکھیں کھولے بیٹھی سنتی رہیں۔ پھر انھوں نے کہا، ''میں نے آپ کے بارے میں پڑھا تھا۔'' پھر وہ نرمی سے اس سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ بتانا چاہتی تھیں کہ وہ ایک فرقہ پرست سردارنی نہیں تھیں، بلکہ گاندھی کے فلسفے پر یقین رکھتی تھیں۔

لیکن وہ تو ہندوستان رہنے کے باوجود کسی فرقہ پرست سکھ کو نہ جانتی تھی۔

وہ تو جسبیر سنگھ کو جانتی تھی۔ جسبیر لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر اپنی ماں کے ہاتھ کا ڈالا اچار لیے کھڑا تھا۔

''دیدی، آپ بتایئے دیدی...''

تین دن اور تین راتیں اس نے ہندوستان کو تشنج زدہ دل کی طرح سکڑتے ہوئے دیکھا۔

تین دن اور تین راتیں... سکھوں کا قتل عام... بسوں سے کھینچ کر... اسکوٹروں سے اتار کر... ریل گاڑی کے ڈبوں سے باہر گھسیٹ کر...

صبح سے آسمان پر کالے دھویں کے بادل پھیلنے لگے تھے۔ اس کے گھر کے پاس ایک گردوارہ تھا۔ اسے بھی جلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اناڑی بلوائیوں سے مضبوط، قلعے جیسا گردوارہ جل نہ سکا تھا۔ تین سرداروں نے گردوارے کی چھت پر پناہ لی تھی۔ جب آگ کے شعلے اوپر تک پہنچے تو انھوں نے چھت سے چھلانگ لگا دی۔ بلوائیوں کے ہجوم نے پل بھر میں ان کے سینے چھید دیے۔

سردار چھت پر کھڑے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ ان کی پگڑیاں کھل کر ان کے سینوں پر جھول رہی تھیں۔

اس کے بعد وہ جسبیر سے کیا کہہ سکتی تھی؟ وہ جو لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا:

''آپ بتائیں دیدی، آپ بتائیں۔ میں کیا کروں؟ گھر بار چھوڑ کر پنجاب چلا جاؤں؟ لوگ کہتے ہیں، ایسا ہی کوئی دوسرا جھٹکا ہم سہہ نہ سکیں گے۔''

گنگ سی وہ اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ سورج کے ٹکڑے سا جسبیر۔ سنہرا، حسین سردار، جو لکھنؤ میں جنما، اور اپنے پریس میں اردو ہندی کی کویتائیں چھاپتا تھا۔ وہ اس سے کیا کہہ سکتی تھی؟ شرمندگی کے باعث اس کے لیے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ جسبیر جیسے پانی میں کرنوں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ڈول رہا تھا۔

تین دن میں امن کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ رات کو سب مرد اور عورتیں گشت کے لیے نکلتے۔ اسے بھی ساتھ لے لیتے تھے۔ کیمپوں میں سرداروں کے لیے کپڑے جمع ہو رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو پریشان تھے اور بہت خوفزدہ۔ بلوے کرنے والے دلّی کے پرانے باسی نہ تھے! دور دراز سے آئے مشرقی یوپی اور بہار

کے مزدور، یا ہریانوی جاٹ، جن کی زیادہ دلچسپی لوٹنے میں تھی۔

بلووں کے زمانے میں روپ وہار میں، جہاں وہ رہتی تھی، ہندوؤں نے اپنے گھروں میں سرداروں کے خاندانوں کو چھپا رکھا تھا۔

''یہاں کوئی سردار ہے؟'' بلوائیوں کا ہجوم پوچھتا۔قتل کرنے کی ہمت پیدا کرنے کے لیے محنت کش طبقے کے یہ لوگ دارو پی پلا کر آتے تھے۔

''نہیں، کوئی نہیں،'' وہ گھروں سے نکل کر جواب دیتے۔

''جھوٹ! ہمیں پتا ہے اس گھر میں سردار رہتے ہیں۔''

''وہ چلے گئے۔ بھاگ گئے۔''

''اچھا تو ہم اس مکان کو آگ لگا دیتے ہیں۔''

''کیسے آگ لگانے دیں تم کو؟ دیوار سے دیوار جڑی ہے۔ ہمارا گھر بھی جل جائے گا۔''

''تو پھر لوٹیں گے۔''

گھر لٹنے سے وہ نہ بچا سکتے تھے۔ پل کے پل میں قاتلوں کا ہجوم ہنستے مذاق کرتے کھلنڈروں میں بدل جاتا۔ خستہ حال بھک مرے مزدور سامان کو اپنے میلے کچیلے ہاتھوں سے چھوتے اور سمیٹ کر اپنی جھونپڑ پٹیوں کی طرف بھاگتے۔

''ارے بڑا مال نکلا سرداروں کنے!'' وہ آنکھیں پھاڑ کر کہتے۔''ایک ایک گھر میں تین چار ٹیلی وژن، وِڈیو...''

ایک بہاری سڑک پر دو سلائی مشینیں گھسیٹے لے جا رہا تھا۔ کھڑکی سے جھانکتی پڑوسن سے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا،''ماتا جی، ایک چادر دے دو۔ مشینیں باندھ کر گھسیٹ لوں گا۔''

''ارے چل!'' اس نے کھڑکی کھٹاک سے بند کر دی۔

''ارے ماتا جی! ماتا جی!'' بہاری مزدور التجا کرتا رہا''۔ اچھا ایک مشین تم لے لو۔''

وہ مشین اس کے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔

جھونپڑ پٹیوں میں قیمتی سامان کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ پھر راتوں رات خاموشی سے سودے ہونے لگے۔ روپ

وِہار کے چھوٹے بڑے مکانوں میں رہنے والے سفید پوش اونے پونے قیمتی سامان خرید رہے تھے۔ راتوں رات سرداروں کا لوٹا ہوا سامان ان کے پڑوسیوں کے گھروں میں منتقل ہو رہا تھا۔ یعنی یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں: سرداروں کی جان بچانا اور ان کے سامان کی خریداری۔

تین دن بعد حکومت نے مطالبہ کیا کہ لوٹا ہوا سامان واپس کیا جائے۔ جھونپڑ پٹیوں کی تلاشیاں ہونے لگیں۔ اب وہاں غصہ پھیل گیا۔ ''حرام جادے! پہلے تو آپ ہی کہا کہ لوٹو۔ اب کہہ رہے ہیں، پھیر دو۔ اب کہاں رکھا رہ گیا ہے ہمارے پاس سامان!''

بلووں کے فوراً بعد اس کا ایک سکھ پڑوسی ملا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی رہ گئی۔

''ارے آپ کیسے ہو گئے مان جی؟''

ڈاڑھی کیس منڈا کر بالکل چھلا آلو بن گئے تھے مان جی۔

''ارے سنگھوں کی سنگھی نکل گئی تین دناں میں!'' سویابین کے دودھ کی قطار میں کھڑی عورتیں چپکے چپکے ہنستیں، منہ دبا کر ساڑھیوں کے پلّو میں منہ چھپا کر۔ ''اب کا کریں، آدمی کو ہنسی تو آوے ہی ہے۔ ہائے ہائے! ہے رام! جلم تو بہت ہوا۔''

اور سچ مچ تین دنوں اور تین راتوں میں، ایک اکیلے دلّی میں اتنے بال کٹے تھے کہ کوئی سمیٹتا تو بال ہی بال منوں کے حساب سے نکلتے۔ سرداروں کے کٹے ہوئے بالوں کا سوچتے سوچتے جنھیں، ان کے انجانے میں، ان کے تصور نے ایک آسمان سے باتیں کرتے نرم سیاہ پہاڑ میں بدل دیا تھا، انھیں اپنے منہ میں کسی خیالی بال کا احساس ہوا۔ آہستہ سے انھوں نے زبان پر ہاتھ کی پشت سے خیالی بال ہٹا دیا۔

فہمیدہ ریاض آہستہ آہستہ نیند میں ڈوبنے لگی تھیں۔ ان کے تھکے ہوئے دماغ میں ہندوستان اور پاکستان گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ اور سوتے ہوئے انھیں ایک ایسے خطے کا خیال آیا تھا جہاں پتھر نہ ہوتے تھے، جو صرف مٹی اور پانی کا بنا تھا۔ گیلی گیلی مٹی، انھوں نے سوچا اور تینوں جگہوں کے سیال دھاروں کو ایک دوسرے سے مل کر مکمل تصویر بناتے دیکھا۔ اور ایک خواب میں محسوس کیا کہ اس کمرے میں ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہے ہیں۔

تربینی! اس نے ایک سانس میں کہا اور سو گئی۔

۱۸ دسمبر

ہن نکلے گا چن
تو نئیں ہونا سجن
جند ڈگمگائی اے
تیری یاد آئی اے
(ایک گیت)

بوڑھی گنگا پر سویرے کے نرم اجالے میں ایک نوکا ڈگمگاتی جا رہی تھی۔ اس نوکا میں پانچ عورتیں اور دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ۱۸ دسمبر کی صبح کو انھوں نے بوڑھی گنگا پر نوکا میں سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ شعبۂ انگریزی کے دو لڑکے انھیں لے جانے پر مقرر کیے گئے تھے۔ سو جس وقت ڈھاکہ کی مساجد میں صبح کی اذان ہو رہی تھی، مایا، خوشبیر، شرمیلا ٹیگور، راکھی اور میں، دونوں لڑکوں ہارون الرشید اور منظور الاسلام کے ساتھ، دسمبر کی سردی میں تھرتھراتے صدر گھاٹ کی طرف رواں تھے۔ فہمیدہ ریاض رکشا میں ہارون الرشید کے ساتھ بیٹھی تھیں جو انگریزی ادب میں فائنل میں تھا، اور بس ایسا ہی تھا جیسا ہندوستان یا پاکستان کا ایم اے انگریزی کا طالب علم ہوتا ہے۔ راستے میں اس نے ان سے پوچھا تھا کہ انھیں ڈھاکہ کیسا لگ رہا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے کہا تھا کہ بنگلہ دیش میں بہت غربت ہے، اسے دیکھنا صرف نہایت تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ بنگالی لڑکے نے برا مناکر اس کی طرف دیکھا تھا، لیکن پھر گم سم ہوگیا تھا۔ اس نے یہ انداز اختیار کرنا چھوڑ دیا تھا گویا وہ غیر ملکی عورت تھی۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ ابھی عمر میں بہت چھوٹا تھا، اور یہ بات دونوں جانتے تھے۔ اس نے بنگالی لڑکے کو اپنے ساتھ رکشا میں اکیلے پاکر اسے کوری آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کم از کم تم میرے ساتھ یہ ڈرامانہیں کر سکتے! فارنر فارنر کا یہ بیہودہ کھیل۔ کچی عمر کا لڑکا مغلوب ہوگیا تھا اور اسے پہچاننے پر مجبور۔ اس نے اداس ہوکر کہا، ''ہاں!'' باقی کا راستہ انھوں نے خاموشی سے طے کیا، جس میں وہ ایک دوسرے کے لیے غیر نہ تھے۔ لڑکا اور بھی چھوٹا ہوکر اس کی انگلی سے لگا بیٹھا رہا تھا، جیسے وہ اسے اسکول لیے جاتی ہو۔

اب وہ توازن قائم رکھنے کے لیے نوکا کی بالکل نوک پر بیٹھا تھا۔

راجستھانی مایا گنگا کو جلدی جلدی پرنام کر رہی تھی۔ پانی میں ہاتھ ڈبو کر ماتھے پر لگا رہی تھی۔ گنگا جی کو تو دیکھو، ہمالیہ پر براجے شِو جی کی جٹاؤں سے نکل کر، سب پوتر استھانوں پر بہتی، کہاں مسلمانوں کے بیچ

ساگر میں سمائی تھیں۔ جہاں یہ پنرملن ہوا، سات سو مسجدیں کنارے پر کھڑی تھیں۔ اذانوں کی گونجار میں گنگا جی سمندر کی آغوش میں گر رہی تھیں۔ اور نہ گزریں تو راجستھان سے۔ درشن کا پیاسا چھوڑ آئیں مایا جی کے پردیش کو۔

بیچ دھارے میں پہنچ کر نوکا مزے میں آ کر رفتار پکڑنے لگی تو عورتیں مست ہونے لگیں۔ ''بھٹیالی گاؤ بھٹیالی،'' انھوں نے دونوں لڑکوں سے کہا۔ دونوں بری طرح شرما گئے۔ ''نہیں آتی، ہمیں گانا نہیں آتا۔'' مگر انھوں نے لہجہ بدل کر سختی سے کہا۔ ان میں چار بہرحال پروفیسر تھیں اور طالب علموں کو ہدایت دینے کی عادی۔ آخر منظورالاسلام نے ہمت کی۔ گلا صاف کیا اور شرمیلے نوجوان نے اپنی جادو بھری بنگالی آواز میں تان لگائی... جیسی آواز صرف بنگالی کی ہو سکتی ہے اور دنیا بھر میں کسی اور کے گلے سے نہیں نکل سکتی۔ دریا پر اڑتی ہوا میں گیت بادبان کی طرح لہرا رہا تھا۔ آس پاس کی نوکاؤں سے لوگ جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

گیت ختم ہوا تو سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے تالیاں بجائیں۔ لڑکے کو شاباش دینے سے زیادہ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ شرمیلا ٹیگور نے مسکرا کر کہا، ''یہ تو ایک ہندوستانی بنگالی فلم کا گانا تھا۔''

وہ سب ہنس پڑیں۔ ''تم نے ہمیں دھوکا دیا،'' انھوں نے منظور سے کہا۔

وہ شرمندہ ہو کر ہنسنے لگا۔ ''مجھے یہی آتا ہے۔ مگر یہ بھٹیالی ہی ہے۔''

عورتیں پھر خاموش ہو گئیں۔ پانی پر نوکا کی جنبش اور گیت نے ان زندگیوں کو ڈگمگا دیا تھا۔ وہ اپنے اپنے مردوں کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ کسی محبوب کی یاد ان کے دلوں میں چٹکی لے چکی تھی، اور اب وہ نوکا پر ہجر زدہ سی بیٹھی تھیں۔ جب منظور گیت گا رہا تھا تو انھوں نے چشمِ تصور سے اپنے محبوبوں کے دہن اشتیاق سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھے تھے، خود کو محبت بھری آغوش میں پایا تھا، اور آنکھیں کھول کر ایسا کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔ انھیں یاد آیا تھا کہ ان کے مرد برسوں پہلے اکتا کر کروٹ بدل کر سو چکے ہیں، اور یہ ایک ایسی مردود اور منحوس صورتِ حال تھی جس پر کوئی گیت نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ دریا پر صبح آنکھیں ملتی ہوئی جاگنے لگی تھی۔ صدر گھاٹ کا دریائی کاروبار بیدار ہو رہا تھا۔ گھاٹ کے پاس لنگر انداز دو منزلہ اسٹیمروں میں سارنگ نہا رہے تھے، اسٹیمر کا فرش دھو رہے تھے۔ ایک ایک اور دو دو کی ٹولیوں میں نوکاؤں پر سامان لادا جا رہا تھا۔ نوکائیں شپ شپ پتواریں مارتی گھاٹ چھوڑ رہی تھیں، آس پاس کے گاؤوں کے لیے۔ آنے والی نوکاؤں سے سامان اتر رہا تھا۔ تانت اور تنگیل کی ساریوں کے گٹھے، جوٹ کا بنا سامان۔

سنہری ریشہ، جیسا کہ مغربی پاکستان کی نصابی کتابوں میں لکھا ہوتا تھا۔

نوکاؤں اور اسٹیمروں پر نہاتے دھوتے، بدن خشک کرتے سارنگوں کے سانولے برہنہ بدن، جیسے اسی گیلی مٹی سے بنائے پتلے تھے۔ ہمارے چاروں طرف کسی جیون بانی کی دھن پر ان بدنوں کا ایک ٹیبلو یا ناچ ہو رہا تھا۔ ایک اسٹیمر کے بالکل نزدیک سے گزرتے ہوئے صبح کی سرد ہوا میں چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ نظر آئی۔ پرندے اپنا ناشتہ ڈھونڈتے، پر مارتے، نوکاؤں کے عین اوپر چکر لگانے لگے تھے، اور ان کی قاؤں قاؤں اور سیٹیاں، پانی کی آواز اور انسانی آوازوں میں ابھر اور ڈوب رہی تھیں۔ ایک اسٹیمر نے زور کی سیٹی ماری اور دھڑ دھڑاتا ہوا، تیزی سے پانی کاٹتا، بیچ دھار میں آنے کے لیے مڑنے لگا۔ دوسری منزل سے سارنگ ''ہٹو بچو'' کے نعرے لگاتے نوکاؤں کو خبردار کر رہے تھے۔ اسٹیمر پر پیلا گاڑھا رنگ تھپا تھا جس پر بڑے بڑے سیاہ حروف میں ''کھلنا'' لکھا تھا۔ اوپر کی منزل سے، مسافر کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ عورتیں اور مرد اور بوڑھے اور بچے جو کسی وجہ سے اتنی صبح کھلنا جا رہے تھے... سستے ٹکٹ کے باعث ان حسین راستوں پر رواں۔ ایک لمبی چونچ اور فیروزی اور سبز پروں والے پنچھی نے غور سے پانی میں دیکھا اور پھر اپنے ننھے سے بدن کو ایک چھوٹی سخت گیند میں بدل کر پانی میں گر پڑا۔

میں نے بھی پہلی بار ندی کے پانی میں احتیاط سے ہاتھ ڈالا۔ یہ گنگا کا پانی تھا۔ نہیں، یہ تو ڈھاکہ کا پانی تھا۔ اس ندی کا نام کچھ بھی ہو مگر اب یہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ چلو میں پانی بند کرنے اور کھولنے لگی، اور ایک لمبے سفر کے بارے میں سوچنے لگی جو پانی کے راستے کیا جا سکتا تھا۔ کسی نوکا، یا موٹر بوٹ یا اسٹیمر میں بیٹھ کر وہ صدر گھاٹ سے کھلنا یا باریسال جا سکتی تھی۔ وہ کئی بار آ جا سکتی تھی، یہاں تک کہ اس کی زندگی ختم ہو جائے۔ کیونکہ سفر کا کہیں نہ کہیں اختتام ضروری تھا، ہندوستان یا پاکستان کی بجائے، اس کے سفر کا اختتام یہاں کیوں نہ ہو! اسٹیمر کی دوسری منزل پر اسے بھات اور 'موشلی' کھانے کو ملے گی۔ اور چائے۔ اب وہ کہیں اور نہیں جانا چاہتی تھی۔

نوکا پر انھیں چائے نہیں مل سکتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کتنی دیر سے سگریٹ نہیں پیا ہے۔ اور اس کی خفیہ بے قراری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ سگریٹ نکالا اور ماچس ڈھونڈنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے تعارفی کارڈ آئے۔ یہ کون لوگ تھے اور کہاں کہاں اس سے ملتے رہے تھے؟ اس نے انھیں ہینڈ بیگ میں واپس ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ میں اپنا پاسپورٹ آیا اور اپنی وزارت کا دیا ہوا 'کوئی اعتراض نہیں' کا

سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔ تمام ضروری کاغذات ہینڈ بیگ سے برآمد ہو گئے۔ مگر ماچس نہیں تھی۔

نوکا کے سارنگ نے اس کی پریشانی دیکھی اور مسکرایا، ''امی بیڑی کھینچے نا،'' یا اس قسم کی کوئی بات کہہ کر وہ تیزی سے نوکا کو دوسری طرف لے چلا۔

یہ ایک سرخ چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا۔ اس کا اندرونی حصہ بھی بالکل سرخ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھتی رہی۔ یہ بیگ ایک کھلے شکم کی طرح تھا، جسے کسی نے چاقو سے چاک کر دیا ہو۔ اسے ایک عجیب خیال آیا کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہاتھ بھی اس کی گہری سرخ تاریکی میں اسی طرح گھوم چکا ہے۔ اندھیرے میں انگلیوں سے چیزوں کی صورت سے اپنی شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہوا... کہنی تک لہو سے بھرا ہوا ہاتھ جو اس کے چاک شکم یا سینے کے اندر گردش کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک نرم اور غیر ارادی عضو کو شناخت کر کے اس نے اسے سفاکی سے بھینچ دیا تھا، اور پھر پھسلتی ہوئی مچھلی کی طرح ہینڈ بیگ سے باہر نکل گیا تھا۔

دریا پر ایک نوکے میں کچھ سارنگ بیٹھے تھے۔ یہ ایک بڑی نوکا تھی جس پر جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی۔ پانی کے چھینٹوں سے نوکا کا فرش بھیگا ہوا تھا، یا شاید اسے دھویا گیا ہو۔ چھپر کے سہارے کی لکڑی سے ٹیک لگائے ایک دو آدمی بیٹھے تھے۔ منہ پر جھاڑ جھنکاڑ سی کھچڑی ڈاڑھی تھی۔ وہ کنول کے آسن میں بیٹھے تھے، اور چار خانے کی لنگی سے ان کی متناسب پُر گوشت ٹانگیں صاف نظر آسکتی تھیں۔ ماچس مانگنے پر انھوں نے جیبیں ٹٹولنی شروع کیں۔ ایک نے ایک بھیگی نوکا سے، اپنے بھیگے ہاتھ میں کسی معجزے سے خشک رہ جانے والی ماچس بڑھائی۔

ان کی نوکا دوسری نوکا سے جا لگی۔ فہمیدہ ریاض نے سگریٹ سلگا کر ماچس واپس کرنے کو ہاتھ بڑھایا اور نگاہ اٹھائی۔ یا خدا، یہ کیا! اس کی سانس رک کر رہ گئی۔ ایک پل کے لیے ان کی نظریں مل چکی تھیں۔ ماچس دینے والے ادھروٹ سارنگ کا چہرہ اسے صاف نظر آ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا، اور اس کے لبوں پر ایک ایسا لطیف تبسم تھا، جو تبسم کا گمان یا شائبہ سا تھا۔ اتنی حسین مسکراہٹ، اس سارنگ کے لبوں پر... اس کا دل ٹھٹک گیا تھا۔ تیزی سے پیچھے جاتی نوکا میں دم بخود بیٹھی فہمیدہ ریاض دوسری نوکا میں مسکراتے ہوئے سارنگ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں، جو پل پل دور ہو رہا تھا۔ دونوں نوکاؤں کے بیچ بوڑھی گنگا کا پانی سرعت سے بہہ رہا تھا اور سرّاٹے بھرتا ہوا وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

تم خود اس طرح کیوں نہیں مسکراتیں؟ اس رات پرجاتن ہوٹل کے کمرہ میں اس کی ہمزاد نے اسے

سمجھایا تھا۔

میں؟ میں خود؟

ہاں۔ کہاں ڈھونڈتی پھرتی ہو وہ تبسم؟ ادھر وٹ سارنگوں کے لبوں پر نظر آجائے تو پانی میں چھلانگ لگانے کو تیار۔ تم خود اسی طرح مسکراؤ۔ آئینے میں دیکھ کر مشق کرو۔ بس، وہ تبسم تمھارے ہاتھ میں آجائے گا۔

میں بولتی زیادہ ہوں نا... وہ اِدھر اُدھر کے بہانے کرنے لگی۔ وہ اس بات پر غور کر رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر سوچ رہی تھی۔ لیکن وہ اس تبسم کو دیکھ کیسے سکے گی؟ آئینے میں؟ اور بوسہ؟ اس نے گہری تاریکی میں دل سے پوچھا۔ کیا تم آئینے میں اپنے عکس کو چومنا چاہو گی؟ دل نے سرد آہ بھری اور ''نہیں'' کہا۔

۱۹ دسمبر: ڈھاکہ پریس کلب

آج کے نیو نیشن میں یہ خبر ہے کہ دیہاتوں میں اچانک سردی بڑھنے سے لوگ مر رہے ہیں۔ وہ چوپالوں میں جمع ہو کر نعرے لگا رہے ہیں کہ حکومت انھیں گرم کپڑے دے۔

بھوکے بنگالی اب سردی سے مر رہے ہیں۔

''کیوں اتنی غربت ہے؟'' میں نے ڈھاکہ پریس کلب میں ایک صحافی کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ہر سال بڑھ رہی ہے یہ دیکھنے والوں کو تڑپا دینے والی مفلسی؟ اور امیروں کی بے حسی؟ یہ رعونت! جس طرح آپ لوگ اپنے مزدور سے بات کرتے ہیں۔ آپ ہم سے الگ ہو گئے، مبارک ہو! مگر سن لیجیے کہ ہمارے یہاں مزدور سے کوئی ایسے بات نہیں کرسکتا۔ وہ آپ کے منھ پر الٹا تھپڑ رسید کرے گا۔ اور پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی نینس، یاد ہے، اکٹھا لگا تھا مشرقی مغربی پاکستان میں؟ اس کے خلاف تحریکیں بھی ہم نے اکٹھی چلائی تھیں! تو سن لیجیے، ہمارے یہاں وہ ختم ہو گیا اور آپ کے یہاں مزید پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں جمہوریت آ گئی، اور آپ کے سر پر جنرل تو چھوڑیے، میجر اور کرنل سوار ہیں۔''

بنگالی صحافی نے جھنجھوڑے جاتے ہوئے کہا، ''دراصل ہمارے غیر ملکی انحصار کا دائرہ وسیع ہے۔ بنگلہ دیش صرف امریکی امداد پر انحصار نہیں کرتا۔ جاپانی پیسہ بھی لگا ہے۔ دوسرے بھی امدادی ملک ہیں۔ یہ ٹوٹی پھوٹی فوج نسبتاً زیادہ خودمختار ہے۔ علاوہ ازیں آج کی دنیا کے جنگی اور نیم جنگی نقشے میں بنگلہ دیش کی فوجی اہمیت وہ نہیں ہے جو پاکستان کی ہے۔ اس لیے جمہوریت نہیں آسکی ابھی تک...''

دونوں آنکھیں پھاڑے اس صورتِ حال پر غور کرتے رہے، اس کی بوالعجبی پر سوچتے رہے۔

''گیارہ برس کے مارشل لا میں آپ تو بالکل بک گئے تھے نا — مکمل غلامی۔'' بنگالی تلخی سے ہنسا۔ ''ہم تھوڑے سے بچے ہوئے ہیں... بیرونی غلامی کی ناقابلِ تنسیخ تکمیل سے بال برابر بچے ہوئے ہیں۔ ہماری سیاسی آمری قوتیں زیادہ خودمختار ہیں، لہٰذا ہمیں کچلے جا رہی ہیں۔''

''قومی آزادی کا مطلب ہے قومی استحصالی طبقے کی خودمختاری؟ پھر اس کے لیے کیوں تیس لاکھ بنگالیوں نے جان دی؟ کیا اسی کے لیے؟ اس لیے لوگوں نے جان کی بازی لگائی؟''

''ہاں، یہی مطلب ہے۔ مگر یہ پورا مطلب نہیں ... اسے یوں کہیے ''، اس نے جملہ از سرِ نو بنایا، ''قومی آزادی کا مطلب ہے قوم کے استحصالی طبقے کی بھی آزادی اور خودمختاری۔ کیونکہ وہ سب سے طاقتور ہے، اس لیے دوسرے طبقات کو بلا روک ٹوک کچل سکتا ہے۔ لیکن بیرونی تسلط پوری قوم پر سے بھی ختم ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں غیر ملکی تسلط بلاواسطہ ٹیکس کی طرح ہوتا ہے، جو نظر نہیں آتا۔ آپ کیا پسند کریں گی؟ بڑی طاقت سے مکمل آزادی اور اپنے پلے ہوئے دنبوں جیسے فسطائیوں کی طاقت کا بلا روک ٹوک راج؟''

''ہرگز نہیں!'' فہمیدہ ریاض نے کہا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

''اور آپ؟'' اس نے لمحہ بھر ٹھہر کر بنگالی صحافی سے پوچھا، ''بیرونی مداخلت اور جمہوریت؟''

وہ ہنسنے لگا، سر کھجانے لگا۔ پھر بولا، ''پتہ نہیں۔ اب دیکھیے چین تک ہماری اس فوج کو امداد دیے جا رہا ہے۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔''

فہمیدہ ریاض کو اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا۔ وہ کس طرح تلملاتے تھے۔ چین کو دیکھو، ایک فوجی آمر (جنرل ایوب) سے دوستی گانٹھی ہے اور فوجی امداد دیے جا رہا ہے۔

''لیکن یہ تو ایک چھوٹی سی فوج ہے،'' انھوں نے کہا۔

''چھوٹی سی ہو مگر ہے مسلح۔ اور لوگ مسلح نہیں ہیں۔''

''لوگوں کو مسلح ہونا چاہیے کیا؟''

وہ اس کے امکانات پر غور کر کے کانپ گئے۔ سب ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیں گے... منصوبہ بنا کر... یا بس یونہی، غصے میں۔ فوجی کوئی شیطان تھوڑا ہی ہوتے ہیں، انسان ہی تو ہوتے ہیں، ہم سب جیسے۔ اگر ہتھیاروں کی طاقت سے لوگوں کا ایک ٹکڑا باقی سب پر حکومت کرنے لگتا ہے تو ہتھیار پا کر

دوسرے بھی ایسا ہی کرنے کی کیوں نہ سوچیں گے؟

''مگر اپنے دفاع کے لیے! طاقت کے خلاف دفاع۔''

ہاں، دفاع! سب ملکوں کے وزیرِ دفاع ہوتے ہیں۔ وزیرِ جنگ نہیں ہوتا نا کسی کا بھی۔

انھیں ایک غیر ملکی کلچرل اتاشی سے اپنی گفتگو یاد آئی۔

''دنیا تخفیفِ اسلحہ کی طرف جارہی ہے، گورباچیف کی وجہ سے،'' انھوں نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف گورباچیف نہیں،'' اس نے اضافہ کیا تھا،'' گورباچیف اور ہمارے جدید ترین نیوکلیئر میزائل ہتھیاروں کی وجہ سے۔''

اس کا کیا مطلب ہوا؟ طاقت کا توازن امن کی ضمانت نہیں؟ کتنی عجیب بات، کتنی عجیب! اس طرح تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ جب پلڑا اچانک ایک طرف جھک جاتا ہے، تو دوسرا فریق امن اور محبت اور انسانیت کی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ کمزوروں کی خواہشِ امن!

شاید یہ بات غلط تھی۔ کمزور امن کی خواہش نہیں کرتے۔ زمین پر رینگتے ہوئے وہ امن کی آرزو نہیں کرتے۔ صبر وشکر سے گزارہ کرتے ہوئے وہ صرف نظر آتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں نقصِ امن کے ہیولے گردش کرتے رہتے ہیں۔

کینٹین والا سرکنڈوں کے چھینکے میں چائے لے آیا۔ اوپر کی منزل پر صحافیوں کی ٹریڈ یونین کی میٹنگ ختم ہوگئی تھی۔ ان کے انتخابات ہونے والے تھے۔ اب وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔

وہ انھیں دیکھتی رہی۔ اسے کراچی پریس کلب یاد آرہا تھا۔ چند صحافی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ''اچھا، تو یہ پاکستان سے آئی ہیں!'' وہ اس سے بہت دلچسپی اور گرمجوشی سے ملتے رہے۔ وہ سب اسے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ پاکستان لے آنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت سے صحافیوں کے کارڈ جمع کیے، اور ان سے وعدہ کیا کہ پاکستان پہنچتے ہی وہ ان کے نام اور پتے پاکستانی اخباروں میں بانٹ دے گی تاکہ وہ وہاں کے اخباروں کے لیے لکھیں۔

اب پھر ساری دنیا اچھی لگ رہی تھی۔ پریس کلب کے ہال کی مدھم روشنی میں ہر شخص خوبصورت نظر آرہا تھا۔ اس صورتِ حال سے عورت کا دل اتنا بڑھا کہ اس نے پھر بہاریوں کا ذکر چھیڑ دیا، حالانکہ کچھ

ڈرتے ڈرتے...

اس گفتگو کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لمحے بھر میں سب صحافی بیزار ہو کر تتر بتر ہو چکے تھے۔ وہ اب تک کیوں نہیں سمجھ جاتی کہ یہ لوگ اٹھارہ برس سے اس حقیقت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس ذکر پر وہ ان کی آنکھوں میں جلن سی دیکھ کر ایک بار پوری طرح سمجھ کیوں نہیں جاتی۔ بار بار وہی ایک بات! سمجھداری سے ماورا۔ کیا بات تھی؟

زیادہ بولنے کی عادت، اس نے خود کو بتایا۔

تم ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر لو، اس نے اپنے آپ کو ہدایت کی۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے وہ دانت بھینچ کر، تن کر بیٹھ گئی۔

ایک صحافی بہت بن بن کر بولنے لگا۔ ''افوہ! آپ کو اتنی دلچسپی ہے ہمارے حالات سے۔ چلیے یہ بھی ایک تفریح سہی!''

فہمیدہ ریاض نے اسے ہرگز نہ بتایا کہ وہ کل ہی بوڑھی گنگا پر ناؤ میں بیٹھی ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ بلکہ خود بھی زہریلی ہنسی ہونٹوں پر لے آئیں، بالوں کو ہاتھ سے جھٹک کر آنکھیں پھڑ پھڑائیں، ہونٹوں کو واہیات انداز سے گول مول کرنے لگیں، گویا اسے پٹاتی ہوں۔

بنگالی صحافی اس اچانک تبدیلی سے کچھ گھبرایا، کچھ مسکرایا۔ لیکن پھر گھبرا کر پوچھنے لگا، ''مسٹر ریاض کہاں ہیں؟''

وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔ پھر اس نے کہا، ''وہ؟ ان کا تو انتقال ہو گیا۔''

صحافی بالکل سٹپٹا گیا۔ نہایت تعجب سے اس ٹھٹھے لگاتی بیوہ کو دیکھنے لگا۔ وہ فوری طور پر صورتِ حال کو سنبھالنا چاہتا تھا۔ نہایت مشکل سے، بالکل عجیب انداز سے اور کچھ سوالیہ لہجہ میں اتنا کہہ سکا، ''اوہ، بہت افسوس ہوا؟''

گویا پتا نہ تھا کہ اسے افسوس ہونا بھی چاہیے یا نہیں۔

''جی ہاں، میں بہت چھوٹی تھی جب ان کا انتقال ہو گیا تھا'' اس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

بنگالی صحافی اب سمجھا۔ پھر زور سے ہنس پڑا۔ اس کا چہرہ اچانک مطمئن ہو گیا تھا، گویا سر سے بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

''آپ میرے شوہر کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے غالباً؟''

''ہاں۔'' وہ تھوڑا سا آگے جھکا۔ وہ اب بھی خوش مزاجی سے ہنس رہا تھا، مگر اب فہمیدہ ریاض کو ہنسی نہیں آرہی تھی۔ اس کا دل جل رہا تھا۔

''وہ خیریت سے ہیں۔ کراچی میں ہیں۔ اور آپ کی بیوی؟''

صحافی کی آنکھوں میں کچھ سمجھ اور کچھ الجھن کے آثار آئے۔

''یعنی ویمنز لب... '' وہ پھر ہنسا۔ اب وہ واقعی تھوڑا سا شرمندہ ہو چکا تھا۔ ''ہمارے ہاں بھی آزادیِ نسواں کی تحریک زوروں پر ہے۔''

''جی ہاں،'' اس نے زہرخند سے کہا، ''میں نے بھی کل ایک پوسٹر دیکھا تھا۔ پدری نظام اب نہیں چل سکتا۔ اس قدر انتہا پر رہتے ہیں آپ لوگ! نعرے کی حد تک ہر بات انتہائی مبالغہ آمیز۔ مگر حقیقت میں آپ ہم سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں، یعنی مغربی پاکستان سے۔''

جوش میں آکر وہ پھر مشرقی اور مغربی پاکستان کہنے لگی۔

''یہاں ہر دوسرا مرد لامحالہ یہی سوال کر رہا ہے۔ چھوٹتے ہی پوچھتے ہیں کہ بھئی مسٹر ریاض؟ ہمارے یہاں... مثلاً اب آپ کے یہاں سے کوئی بنگالی خاتون وہاں جائیں، کسی دفتر میں یا اخبار کے دفتر میں، تو لوگ فوراً شوہر کے بارے میں پوچھ گچھ شروع نہیں کر دیتے عورت کو دیکھتے ہی۔''

دانت پیس پیس کر اس نے اپنی بات مکمل کی۔

دو تین صحافی لڑکیاں اس کے نزدیک سرک آئیں۔ وہ اس کی باتیں بڑی دلچسپی اور غور سے سن رہی تھیں۔

''کہیے، کہیے!'' ان میں ایک نے کہا، ''دراصل ہم تو یہیں رہتے ہیں نا، ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔ آپ باہر سے آئی ہیں۔ یہ تو ہماری معلومات میں اضافہ ہے۔''

''یہی تو!'' اس نے کہا۔ ''اب جو میں پوچھ رہی ہوں کہ کرنل ابو طاہر کو کیوں مارا آپ کے خیال میں؟ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بھلا آپ کے شوہر کہاں ہیں؟''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انھیں اسی وقت اپنے اخباروں کے دفتروں میں واپس جانا تھا، مگر اٹھتے اٹھتے انھوں نے پاکستانی عورت کے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کر لیا، عورتوں کی ایک مجلس میں شریک ہونے کے لیے۔ انھوں نے جاتے وقت اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ دو مسکراتی بنگالی جادوگرنیاں۔ اسّی کی

دہائی میں چلنے والی ہوا سے ان کی ساریاں اڑ گئی تھیں۔ پنزابی کرتا پے زامہ پہنے پنزابنیں معلوم ہو رہی تھیں۔

ان سے ذرا بڑی عمر کی ایک نہایت پرکشش سانولی سلونی بنگالن، بہت حسین ساری پہنے بیٹھی تھیں۔ بالکل وحیدہ رحمٰن جیسی تھیں۔ اگر آپ وحیدہ رحمٰن کو عینک پہنا دیں تب وہ بالکل سونیا رحمٰن جیسی لگے، جو کہ ان کا نام تھا، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا جب میں سرک کر ان کے پاس جا پہنچی۔ وہ ایک بنگالی ہفت روزہ کی مدیر تھیں۔

''گاؤں میں بنگالی سردی سے مر رہے ہیں،'' میں نے ان سے کہا۔

''ہاں۔''

''آپ کے ہاں غریبی بڑھ رہی ہے۔ کیوں؟''

اس لیے، کیونکہ زرعی اصلاحات بار بار جاری کی جا رہی ہیں۔''

یہ ایک بھاری بھرکم اسکالر تھیں۔ اقوام متحدہ کے کئی اداروں کے وظیفوں پر دنیا گھوم آئی تھیں۔ خود تو بالکل دھان پان تھیں، سارا طبعی وزن صرف عینک کے شیشوں میں تھا۔

''اس موضوع پر تو میں نے ایک کتاب لکھی ہے،'' سونیا جی نے بہت انکسار سے کہا۔

''آپ کی کتاب کا یہی موضوع ہے کیا؟''

''ہاں۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ ... ابھی میں آپ کو بتاتی ہوں،'' انھوں نے داستان کا آغاز کیا۔ ''دیکھیے، یہ تو آپ جانتی ہیں کہ غریب کسان کے پاس کم زمین ہوتی ہے، جس سے گزارہ ہو نہیں سکتا، اس لیے تھوڑی سی زمین بیچ کر بٹائی پر کام کرنے لگتا ہے۔ جیسے جیسے یہ تعداد بڑھ رہی ہے، بٹائی کا عوض کم ہوتا جا رہا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں آدھوں آدھ بٹائی ہوتی تھی مگر اسّی کی دہائی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اب تو زمیندار بیج اور کھاد کی قیمت بھی پوری نہیں دے رہا۔ جتنا غریب کسان ہوتا ہے، اسی قدر کم رقم اسے دی جاتی ہے، کیونکہ وہ اسے قبول کرنے پر مجبور ہے۔ زمیندار کا حصہ خود ہی اسے گھر تک پہنچاتے ہیں غریب کسان۔ پہلے کھیت سے زمیندار خود لے جایا کرتا تھا۔ اس سے ہو یہ رہا ہے کہ جہاں زراعت کو جدید سہولتیں دی جا رہی ہیں، وہاں بٹائی پر کام کرنے کے مواقع بڑھ رہے ہیں، اور غریب کسان اور زیادہ غریب ہوتے جا رہے ہیں۔''

''لیکن آپ کے یہاں بنگال میں تو مغربی پاکستان جیسی بڑی زمینداریاں نہیں ہیں۔''

''ہاں، وہ تو نہیں ہیں۔''

''اور امداد سے؟ غیر ملکی امداد سے خوشحالی بڑھ رہی ہے؟''

''نہیں، بے ایمانی بڑھ رہی ہے... کرپشن، بھرشٹا چار۔ جتنی غیر ملکی امداد آتی ہے، اتنی ہی بے ایمانی اور غریبی بڑھ جاتی ہے۔''

''خیر، عوامی لیگ تو خود سنگین بدعنوانیوں میں ملوث تھی۔ شیخ مجیب کے خاندان کے بارے میں ہولناک باتیں کہی جا رہی ہیں۔''

''مگر مجیب خود ذاتی طور پر بے ایمان نہیں تھے۔ انھوں نے ایک ٹکا بھی اپنے لیے نہ لیا تھا،'' سونیا نے اس کی بات کاٹی۔

''مگر ان کے قریبی رشتے دار...''

''ہاں۔''

''یہاں لوگ ضیاء الرحمٰن کی کافی عزت کرتے ہیں...''

''ضیاء الرحمٰن پر بدعنوانی کا کوئی الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ انھوں نے تو اپنے سگے بھائیوں تک کو چھوڑ دیا تھا۔''

''لیکن انھیں بھی قتل کر دیا گیا۔''

''دراصل،'' سونیا جی نے کہا، ''۱۹۷۷ میں ایک فوجی انقلاب کی افواہ اڑی تھی۔ اس سے انھیں کرنل منظور نے خبردار کیا تھا۔ ضیاء الرحمٰن پریشان ہو گئے اور کرنل منظور کا تبادلہ چٹا گانگ کر دیا۔ اس بات سے کرنل منظور بددل ہو گئے اور بعد میں خود فوجی انقلاب لے آئے اور ضیاء الرحمٰن کو خود قتل کر دیا۔''

''اور پھر؟ کرنل منظور تو گدی پر نہ بیٹھے...''

''نہیں۔ انھیں بھی پُراسرار طریقے پر قتل کر دیا گیا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے تفتیش کی اور پندرہ بیس دوسرے فوجی افسروں کو بھی پھانسی دے دی گئی۔''

''یہ کیا تماشا ہے؟'' فہمیدہ ریاض نے دلی کوفت کے ساتھ کہا۔ ''آپ لوگ پہلے مرواتے ہیں، پھر سپریم کورٹ سے انکوائری کرواتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کو بھی مروا ڈالتے ہیں۔ اور کوئی تیسرا شخص صدر بن جاتا ہے۔''

''ہاں، کچھ عجیب سا حال ہے۔ بھئی سچ تو یہ ہے...'' سونیا جی نے رازداری کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو فوجی پاکستان سے ہمیں لوٹائے گئے تھے، دراصل یہ سب ان کا کیا دھرا ہے۔ جنگِ آزادی میں شامل فوج اور پاکستان سے واپس لوٹائی فوج میں ملاپ نہیں ہو سکا۔''

''کرنل منظور پاکستان سے واپس آئے تھے؟''

''نہیں، وہ تو جنگِ آزادی میں شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان سے واپس آنے والے افسروں نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر انھیں اکسایا۔ سوچا کہ اس طرح ضیاء الرحمٰن سے بھی نجات ملے گی، اور پھر کرنل منظور تو مارے ہی جائیں گے۔''

فہمیدہ ریاض منھ پھاڑے سنتی رہیں۔ ان کے حلق میں آسانی سے مکھی گھس سکتی تھی۔ آخر انھوں نے بے اختیار ہو کر کہا، ''یہ تو انتہائی دور از کار تھیوری معلوم ہو رہی ہے۔ مجھے تو معاملہ بالکل الٹ نظر آتا ہے۔ تمام قتل انھی لوگوں کے ہاتھوں ہو رہے ہیں جو جنگِ آزادی میں شامل تھے۔ دراصل آپ کی اپنی وہ فوج جس نے بنگلہ دیش بنانے کی لڑائی لڑی، اقتدار اور انتظام سیاست دانوں اور سول نوکر شاہی کے ہاتھ میں سونپ دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ آپ لوگ کودِتاؤں کے تواتر سے شرمندہ ہو کر یہ تھیوری گھڑ رہے ہیں کہ پاکستان سے لوٹنے والے فوجی اس قدر لمبی چوڑی سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اتنے موثر ہیں کہ کروڑوں کی آبادی کو بس نچا رکھا ہے۔''

''لیکن کیا ان میں ایجنٹ نہیں ہو سکتے؟'' سونیا جی نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں۔

''ہو سکتے ہیں،'' اس نے کہا، ''مگر وہ فوج کے ایک بہت ہی بڑے حصے کے اعتماد کے بغیر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ ایجنٹ تو ایک آدھ ہی ہو سکتا ہے نا۔ کوئی تھوک کے حساب سے ہزاروں ایجنٹ تھوڑا ہی بھرتی کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تو، جہاں تک عقل کام کرتی ہے، خفیہ کام ہوتا ہے، یعنی ایجنٹ بھرتی کرنا اور ان کی تربیت وغیرہ۔''

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں،'' سونیا جی نے عینک اتار کر شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو بنیادی طور پر اقتصادیات کی آدمی ہوں۔''

عینک اتار کر تو وہ عین مین وحیدہ رحمٰن لگ رہی تھیں۔ فہمیدہ ریاض ان کی شکل تکتی رہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو یہ پوچھتے سنا: ''اور آپ کے شوہر؟ کیا کام کرتے ہیں آپ کے شوہر؟'' انھیں بالکل یاد نہ تھا کہ ذرا دیر پہلے وہ اس سوال پر کس قدر جز بز ہوئی تھیں۔

''نیوکلیئر فزسسٹ ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے مجھے لینے۔ بنگلہ دیش جوہری توانائی کمیشن میں کام کرتے ہیں۔ آپ ہمارے گھر چلیں گی؟''

تھوڑی دیر میں مطیع الرحمٰن صاحب آ گئے۔ منھ پر خوبصورت سی ڈاڑھی۔ ماہرِ طبیعیات سے زیادہ فلسفی نظر آ رہے تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے گاڑی میں پوچھا۔ پرانی ٹویوٹا تھی۔

''لال ماٹی۔ محمد پور کے پاس ہے۔''

فہمیدہ ریاض کو محمد پور کیمپ یاد آیا۔ لیکن اس بار اس نے ایک لفظ بھی بہاریوں کے بارے میں نہ کہا۔ ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گئی۔

ایک معمولی سے علاقے میں معمولی سا فلیٹ، دوسری منزل پر، جیسے ہمارے کراچی میں، پرانے ناظم آباد میں ہوتے تھے۔ وہی بینت کا صوفہ، جوٹ کی دری کا چوکور ٹکڑا۔ گھر میں ہر طرف کتابیں تھیں۔ ان میں گھرے دو بچے کھیل رہے تھے۔ ایک دس برس کا ہوگا اور دوسرا بالکل چھوٹا سا تھا، مشکل سے ڈیڑھ سال کا رہا ہوگا۔ ایک حاملہ عورت اٹنگی بدرنگ ساڑھی باندھے رسوئی میں کام کر رہی تھی، جیسا کہ ڈھاکہ کے ہر گھر میں کرتی ہے۔ وہ ان کے لیے چائے بنا لائی۔

''آپ کے بچوں میں فرق ہے۔''

''ہاں...'' سونیا کہنے لگیں۔ ''یہ دوسرا بچہ... دراصل یہ میری دوسری شادی ہے۔''

''اچھا؟'' فہمیدہ ریاض نے دلچسپی سے پوچھا۔ وہ اس حسین بنگالن ماہر اقتصادیات کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہتی تھیں۔ ''آپ کے یہاں عورتوں کی دوسری شادی سماجی طور پر قبول کر لی جاتی ہے؟''

''اب تو کچھ کچھ...'' انھوں نے کہا۔ ''اور پھر اس پر منحصر ہے کہ آپ کس طبقے سے ہیں، کس قسم کے لوگوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔''

وہ صرف دو بہنیں تھیں۔ ان کے باپ محکمۂ جنگلات کے کوئی بڑے افسر تھے۔ دوسری بہن امریکہ میں رہتی ہیں۔

''میں ایک بار پاکستان گئی تھی،'' سونیا نے انکشاف کیا۔

''اچھا؟''

''ہاں۔ بابا کے ساتھ ایک پنجابی افسر تھے، تو ایک بار انھوں نے میرا گانا سنا۔ اتنے خوش ہوئے کہ کچھ انتظام کر کے مجھے میوزک کانفرنس میں بلا لیا۔ ہم لاہور گئے تھے، اور پھر مری بھی۔''

''آپ گاتی ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں! اندر ہارمونیم بھی رکھا ہے۔''

ڈھاکہ کے تقریباً ہر بنگالی گھر میں اسے ہارمونیم نظر آیا تھا۔ ایک گانا گاتی قوم! اس نے دل میں سوچا۔

''پاکستان میں اب بھی میوزک کانفرنس ہوتی ہے؟'' سونیا اس سے پوچھ رہی تھیں۔

مجھے معلوم نہ تھا۔ کہاں ہوتی ہے اب... ''اب تو نہیں ہوتی۔''

''ہمیں تب بھی عجیب سا لگا تھا،'' سونیا نے کہا۔ ''میں جب اسٹیج پر گانے گئی تو لوگ بڑی گھٹیا حرکتیں کرنے لگے۔ بعد میں ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے علاوہ زیادہ تر کوٹھے والیاں شرکت کر رہی تھیں۔''

''نہیں تو! ایسا تو نہ ہوگا،'' میں نے کہا۔ اور دل ہی دل میں سوچا کہ اب تو وہ بھی نہیں گاتیں! بس اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔

رحمٰن صاحب اپنے پاکستانی ہم عصروں کی باتیں کرنے لگے جن سے وہ برمنگھم میں ملے تھے، جہاں یہ سب ایم ایس سی کر رہے تھے۔

''یاد آتے ہیں آپ کو؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیوں نہیں! ہم کانفرنس کریں گے تو انھیں بلائیں گے۔'' پھر انھوں نے کہا، ''میرے خیال میں مذہب تو ایک آفاقی چیز ہے، یعنی بہت سے مسلمان ملک ہیں۔ اس کا تعلق ریاست سے ہوتا ہے، مگر وہ ہیں پھر بھی الگ الگ ملک...''

وہ خاموش رہی۔ تھوڑی دیر میں اسے معلوم ہونے والا تھا کہ یہ بھی جنگِ آزادی میں لڑے ہیں، باقاعدہ رائفل اٹھا کر۔ بعد میں ضیاء الرحمٰن کو پسند کرنے لگے۔

''ضیاء الرحمٰن پُرخلوص تھے،'' انھوں نے زور دے کر کہا۔

سونیا نے ان سے اختلاف کیا۔ اس نے سوچا، یہ پتی پوجا نہیں کرتیں... یوں ہی تو نہیں ہوگئی ہوگی علیحدگی پہلے میاں سے!

''پہلے پُرخلوص تھے،'' سونیا کہہ رہی تھیں، ''بعد میں ماتھا پھر گیا تھا۔ ہوا یہ تھا...'' اب اس نے مشاق مدیرہ بن کر بولنا شروع کیا، ''ضیاء الرحمٰن نے چین دوست فوجیوں اور ان کی پارٹی کا تو پہلے صفایا کر دیا۔ اور خبر ہے، اس میں سب سے زیادہ ضیاء الرحمٰن کا ساتھ کس نے دیا؟ روس دوست کمیونسٹوں نے!

کھلم کھلا کہتے تھے کہ ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے۔''

فہمیدہ ریاض کو یاد آیا کہ ایوب خان کے زمانے میں، اس کے وطن کے چین دوست کمیونسٹ، روس دوست کمیونسٹوں کے لیے بالکل ایسا ہی کہتے تھے۔

''لیکن،'' سونیا نے اپنی بات جاری رکھی، ''انھوں نے ابتدا میں روس دوست کمیونسٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ضیاء الرحمٰن نے یونیفارم اتار پھینکی اور عام انتخابات بھی کروائے۔ انتخابات میں بائیں بازو کے لوگ ہار گئے۔ اس طرح ضیا کی نظروں میں ان کی اہمیت ختم ہوگئی اور وہ دودھ کی مکھی کی طرح باہر کر دیے گئے۔ ساتھ ہی ضیا زیادہ طاقتور ہو گئے اور جمہوری اداروں کے بدلے، ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لیتے گئے۔ انتخابات میں ان کی بھاری اکثریت تھی، ان کی جماعت بی این پی کی۔ ایک طرف وہ فوج کو پیچھے کھسکاتے جا رہے تھے، دوسری طرف جمہوری ادارے بھی بن نہ پا رہے تھے۔ اختلاف کرنے والوں کو سختی سے خاموش کرنے لگے...''

''مگر وہ پُرخلوص تھے،'' رحمٰن نے کہا۔

''ارے پُرخلوص تو سب ہی تھے،'' سونیا نے بچے کے منھ میں دودھ کی بوتل ٹھونس کر کہا، ''شیخ مجیب بھی تھے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''پانچ سال تک کم از کم استحکام تو تھا نا بنگلہ دیش میں۔ لیکن غریبی بڑھ رہی تھی۔ آخیر تک لوگوں نے ان کی باتوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ضیاء الرحمٰن نے مغربی ملکوں سے، یعنی جو جنوب شمال مکالمے کے نام سے مشہور ہوا، عالمی خوراک کی صورتِ حال پر ہمت سے بات چیت شروع کی تھی۔''

مجھے یاد آیا۔

''ہاں،'' سونیا نے کہا، ''بس امداد کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرتے تھے۔ جب اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل میکنمارا بنگلہ دیش آئے تو انھوں نے ایسا ہی ڈراما کیا جیسا کہ ان کی اپنی پارٹی کے نچلے رہنما کرتے تھے۔''

''کیا ڈراما کیا؟''

''بھئی ضیاء الرحمٰن جب دورے پر جاتے تو بس اسی دن کے لیے بی این پی کے لیڈر کرائے پر دیہاتی لے آتے جو کبھی دریا میں جال ڈال کر بیٹھ جاتے، کہیں پھاوڑا تھام، یوں ہی زمین کھودنے لگتے۔ ضیاء الرحمٰن بہت متاثر ہو کر لوٹ جاتے۔ میکنمارا کے آنے پر بالکل اسی طرح کا ڈراما خود ضیا نے کیا۔ ایک دن

کے لیے ہزاروں لوگوں کو کرائے پر لے آئے جو جھوٹ موٹ سمندر کے پانی سے نمک بنانے کا سوانگ رچانے لگے۔ میکنمارا نے معائنہ کیا اور بہت متاثر ہو کر واپس چلے گئے۔ دن بھر کے لیے کرائے پر حاصل کیے ترقیاتی کام کرنے والے بھی واپس چلے گئے۔ کھیل ختم، پیسہ ہضم۔''

''کیا ضیا اپنی پارٹی کے ان بدمعاشوں کے ناٹک سے واقف تھے؟''

''تھے، یا شاید نہیں تھے،'' سونیا نے ہاتھ ہلا کر کہا، ''مگر ایک بات تو ثابت ہوتی ہے۔ ان کے پارٹی لیڈروں کا اور ان کا دماغ ایک ہی طرح سے کام کرتا تھا۔''

مجھے ہندوستان کے لطیفے یاد آئے۔ راجیو نئے نئے آئے تھے تو انھیں بھی دورے کرنے کا شوق تھا۔ ایک جگہ انھیں ایسی نہر دکھائی گئی جو کسی کھیت تک نہ جاتی تھی، ذرا سا موڑ کاٹ کر ختم ہو جاتی تھی۔ ترقیاتی کام دکھانے کے لیے راتوں رات یہ کھدائی کی گئی تھی۔ ایک آدی واسی علاقے میں، اصل باشندوں کو کہیں بند کر کے قریبی تھانے کے پولیس والوں کو قبائلیوں کا لباس پہنا کر بٹھا دیا گیا۔ راجیو کو ان کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ قبائلیوں نے جب چکن روسٹ اور پڈنگ پیش کی تو وہ کچھ کھٹکے۔ دو دن بعد اخباروں نے سب بھید کھول دیا۔

یہ سب باتیں یاد کر کے وہ کھلکھلا کر ہنستے رہے، اس خطے کے لوگوں کی فنکاری اور ذہانت پر، ان کی قہقہہ آور چالاکیوں پر! یعنی کیا کہتے ہیں، دیکھتی آنکھ سے کاجل چُرا لیں۔

''اس لیے،'' سونیا نے سنجیدہ ہو کر کہا،'' میں نہیں کہتی... یہ ہمارے جائزے ثابت کرتے ہیں... غیر ملکی امداد سے صرف بے ایمانیاں بڑھتی ہیں، صرف کرپشن بڑھتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ غربت بڑھتی ہے۔''

''آخر کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ،'' سونیا نے میز پر انگلی سے نقشہ بناتے ہوئے کہا، ''ہمارے پاس غیر ملکی امداد کا صحیح استعمال کرنے کے لیے مناسب تنظیم نہیں ہے۔ اسے ہماری اقتصادی بولی میں جذب کرنے کی صلاحیت کہتے ہیں۔ ابزاربنگ کیپیسٹی۔''

''حکومت سختی سے پڑتال کرے، تب؟''

''حکومت کی بھی ایک رہی! یہ کام کرتی ہی حکومت ہے۔ ایکو ایک بدمعاش پہلے بی این پی میں شامل ہو گیا تھا، اب جنرل ارشاد کی پارٹی میں شامل ہو گیا ہے۔ اچھا، ایک سے آپ کی ملاقات ابھی کراتی

ہوں۔اے نجم النسا!''

اس نے بدرنگ ساری والی حاملہ بنگالن کو آواز دی۔

''ذرا اپنے بھائی کو تو بلانا۔اوپر کوارٹر میں ہوگا'' نجم النسا ہلکے قدموں سے اوپر کو دوڑی گئی۔

''یہ گاؤں سے دو تین دن کو آئے ہیں،'' سونیا نے کہا۔''اب ان کی ذرا باتیں سنو۔''

کمرے میں ایک کھایا پیا، اچھا خاصا صحت مند بنگالی وارد ہوا۔

''اے جمیر الدین، بتاؤ... بتاؤ تم نے لیا تھا نا دو ہزار ٹکا، کسی دوسرے کرشک کے نام پر؟''

جمیر الدین، جو شاید ضمیر الدین تھا، ہنسنے لگا، سر کھجانے لگا۔

''انھیں سنا دو، یہ تو پاکستان سے آئی ہیں۔''

جمیر الدین اپنی کہانی سنانے لگا۔ وہ باری باری پاکستانی مہمان اور سونیا کی جانب دیکھ رہا تھا اور بنگالی میں بات کر رہا تھا۔سونیا فوری انگریزی ترجمہ بتا رہی تھیں۔

''کہتا ہے، لیا تھا۔ زرعی ترقیاتی بینک کے گاؤں کی شاخ کے منیجر کو معلوم تھا۔یہ اُپ ضلع پریشد کا ممبر بن گیا تھا۔ دوسرے کسان کو بینک کا نوٹس ملا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔وہ منیجر کے پاس گیا۔منیجر نے اسے جمیر کے پاس بھیج دیا۔اس نے الٹے اس سے سو ٹکے اور لے لیے۔

''بینک سے قرضہ لینے کے لیے بینک منیجر کو رشوت دینی ہی پڑتی ہے۔جتنا غریب کسان، اتنی ہی زیادہ رشوت دینی پڑتی ہے۔اس کے گاؤں میں جو سرکاری افسر زمین کی تقسیم کا جائزہ لینے ۱۹۸۱ء میں آئے تھے، ایک اکیلے اس کے گاؤں سے ساٹھ ہزار ٹکا رشوت جمع کر کے لے گئے تھے۔''

جمیر سر کھجا رہا تھا۔ پھر گردن کھجانے لگا۔اس کے چہرے پر نفرت تھی، اور سفاکی۔بجلی کی روشنی میں کھڑا وہ کوئی بھوت معلوم ہو رہا تھا۔

''غریب کسانوں کی تو اتنی زمین نہیں ہوتی۔کیوں دے دیتے ہیں رشوت؟'' میں نے پوچھا۔

جمیر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا،''ڈرتے ہیں، اس لیے۔سرکاری آدمی سے ڈرتے ہیں۔''

''ابھی تو ایسا ہی ہے نا ریاست کا آدمی سے رشتہ،'' سونیا کہہ رہی تھیں۔'' گاؤں کے دس بارہ آدمی ان کے ایجنٹ بن جاتے ہیں۔انھوں نے بھی خوب پیسہ بنایا۔زمینداروں نے سرکاری آدمیوں کے ذریعے غریب کسانوں کو ڈرا دھمکا کر اونے پونے ان کی زمین خرید لی۔ ہمارے جائزے کے مطابق، جو ۱۹۷۸

میں کیا گیا تھا، بے زمین غریب کسانوں سے جب سوال کیا گیا کہ آپ ضلع پریشد کے ارکان کس کے لیے کام کرتے ہیں، تو اکہتر فیصد نے جواب دیا: زمینداروں کے لیے۔ یہ سروے دس گاؤوں میں کیا گیا تھا۔''

فہمیدہ ریاض خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر انھیں اسی روز کے اخباروں کا جائزہ یاد آیا، کئی اخباروں کا۔ سب ہی تو نجی صنعتوں کی حوصلہ افزائی، غیر ملکی سرمایہ کاری کے فائدے، ایسے ہی چرچوں سے بھرے پڑے تھے۔ انھوں نے کہا، ''اب تو دوسرا زمانہ ہے، جو اچانک آ گیا۔ نجی صنعتوں کا زمانہ!''

سونیا بھی ہنسنے لگیں۔ ''پرئیویٹائزیشن از دی ورڈ۔ لیکن ابھی تو اس کا صرف ذکر ہو رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے اس کی مزاحمت سب سے زیادہ کس طرف سے ہوگی؟ نوکر شاہی کی جانب سے، اور خود ایسے سرمایہ کاروں کی جانب سے جو ابھی تک سرکاری خزانے کے بل بوتے پر زندہ ہیں، جنھوں نے جی کھول کر پیسہ بنایا ہے۔''

''اور آپ کی فوجی حکومت؟''

ہاں، یہ کافی پیچیدہ بات ہے۔ ویسے یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب تک رہے۔ عوام کی رائے تو، آپ نے دیکھا ہوگا، جمہوریت کے حق میں ہے۔''

فہمیدہ ریاض ہنسنے لگیں۔ ''ہاں،'' انھوں نے کہا، ''پریس کلب میں تو خصوصاً!... نہیں، یہ تو میں مذاق میں کہہ رہی ہوں۔ واقعی یہاں ہر طرف جمہوریت کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور بحالیِ جمہوریت کی تحریک ایسی لہر کی طرح نظر آ رہی ہے کہ دل چاہتا ہے فوراً اس میں شامل ہو جایا جائے۔ ہمیں اپنا زمانہ یاد آتا ہے۔ بلکہ کسک سی ہوتی ہے کہ بھئی وہ زمانہ گزر گیا۔ اُس وقت بہت برا لگتا تھا۔''

''یہاں پاکستان واچرز بہت کم ہیں،'' سونیا نے کہا۔ ''ایریا اسٹڈی میں بھی پاکستان کا مطالعہ کسی قابلِ ذکر پیمانے پر نہیں ہو رہا۔ عام لوگ پاکستان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔''

''ہم بھی آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مگر چند باتیں...'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ بدن سے ایک عضو جدا ہو چکا ہے اور ایک تسمہ رہ گیا ہے... ایک گوشت کا خون بھرا تسمہ...

''یہاں بہاریوں کے باسٹھ کیمپ ہیں نا؟'' اس نے کہا، اور اس نے ان کے بنگالی چہروں کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی... وہ سب کچھ جانتی تھی۔

''مجھے شاید یہ ناخوشگوار ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا،'' اس نے میکانیکی طریقے سے کہا اور اپنے آپ کو کھوکھلا، ڈبے کی طرح بجتا محسوس کیا۔ ٹھن ٹھن ٹھن... ٹھن ٹھن گوپال، اس کی ماں کہتی تھی۔

دونوں میاں بیوی کے چہروں پر تردد کے تاثرات آ گئے۔

''نہیں نہیں مسز ریاض،'' سونیا نے کہا،''ایسی بات نہیں۔ آپ تو ہمیں ... میرا مطلب ہے... غیر نہیں لگ رہیں۔ اب یہ تو ہم آپس میں بیٹھے ہیں۔''

''اور خالص سائنسی نقطۂ نظر سے بات کر رہے ہیں،'' رحمٰن نے کہا۔

''ہاں... خالص سائنسی نقطۂ نظر سے... ''فہمیدہ نے دہرایا۔

''اس کی تو بڑی ضرورت ہے... ''سونیا اسے اب ایسی ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں، گویا وہ خود کیمپ میں رہتی ہو۔''اس بات کی کہ لوگ گھٹیا تعصّبات سے بالاتر ہو کر مطالعہ کریں، اور تجزیہ۔ ارے رحمٰن! آپ کو پپیّا یاد ہے؟''

''ہاں ہاں،'' رحمٰن صاحب نے کہا۔''پتا نہیں اب کہاں ہوگی وہ! بہت بَڑھیا لڑکی تھی۔ کتنی ذہین اور محنتی!''

''کون تھی وہ؟'' فہمیدہ ریاض نے پوچھا۔

''کوئی بہارن تھی۔ بہار یونیورسٹی کی ایک ہندو لڑکی۔ یہاں وہ ریسرچ کرنے آئی تھی۔ اس نے بہاریوں کے کیمپوں پر اپنا مقالہ لکھا تھا۔ روز جاتی تھی وہاں۔''

کون تھی یہ پپیّا؟ فہمیدہ ریاض نے سوچا۔ اس نے تھوڑی سی مٹی اور پانی سے اس لڑکی کو گڑیا کی طرح بنانا شروع کیا۔ ایک تنکے سے آنکھیں بنائیں، ناک، اور ناک کی لونگ بھی بنا دی۔ پھر اس کے بال تراش کر کاندھوں پر لہرا دیے۔ اس نے اس کی پتلی کمر اور ... پھر ایک سوتی ساری پہنا دی۔ پیروں میں چپل پہنائے۔ کاندھوں پر ایک جھولا لٹکا دیا، ایسا ہی جیسا دلّی میں جن پتھ کی دکانوں میں ملتا ہے۔ اس جھولے میں اس نے کتابیں، نوٹ بک، قلم اور دال موٹھ کا پیکٹ ڈال دیا۔ پھر موٹی موٹی بھنویں بنا کر، بیچ میں ایک ننھی سی لال بندیا لگا دی۔ یہ تھی پپیّا! بن گئی۔

کیونکہ وہ اس سے ملی تھی۔

وہ اس لڑکی سے ہزاروں بار ملی تھی۔ دلّی میں، بمبئی میں، بہار میں، گجرات میں، شملہ اور مسوری میں۔ بسوں میں دوڑ کر چڑھتی، اسکوٹر رکشاؤں میں پھٹ پھٹاتی، جواہر لال یونیورسٹی کے کینٹین میں آلو چھولے کھاتی۔

فہمیدہ ریاض کی آنکھوں میں خفیف سی جلن ہوئی۔ پھر پپیّا پانی میں ڈولنے لگی۔ اس کے سراپا پر لہریں

گزر رہی تھیں، اور اس کے نقوش بار بار تھرتھرا رہے تھے۔
''آپ تو جذباتی ہوگئیں،'' رحمٰن کہہ رہے تھے۔''وی آر سوری۔ آیئے آپ کو آپ کے ہوٹل چھوڑ آئیں۔''

ہوٹل پہنچی تو اس کی روم میٹ سو چکی تھیں۔ فرش پر ان کے کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ میز پر اسپاٹ لائٹ کی طرح روشنی کرنے والا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ فہمیدہ ریاض نے ایک کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ وی ایس نائپال کی ناول دی انگما آف اَرائیول، پہنچ جانے کا بھید۔

''بات تو یہ ہے کہ وہ پہنچ کر بھی نہ پہنچے...'' پہلی سطر میں لکھا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی بستر میں گھس گئی۔ گاندھی وادی سردارنی ہیں خوشبیر جی، اس نے سوچا۔

پھر جانے کہاں سے بند آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ آ گیا۔ نفرت اور سفاکی سے معمولی سا مسخ چہرہ، بنگالی میں جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ یہ جمیر تھا، اس نے پہچانا۔ لگتا ہے ابھی اس کے منہ سے تھوک اڑنے لگے گا۔

وہ بار بار آنکھیں کھولنے اور بند کرنے لگی۔ ایٹی وان کی گولیاں کہاں رکھی ہیں؟ شاید ختم ہوگئیں۔ اچانک اسے کراچی شدت سے یاد آنے لگا۔ اپنے علاقے کی کیمسٹ کی دکان — حالانکہ اب وہ اسلام آباد میں رہتی تھی۔

وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟ اس نے سوچا۔ شاید لڑائی ہو رہی ہوگی۔ اس نے جماہی لی۔ وہ نیند کو بلانے لگی، خود کو تھپکنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے پھر جمیر کا دیہاتی، موٹے نقوش کا چہرہ آ گیا۔ اب اس نے غور سے اس کے ہونٹوں کو دیکھا۔ بھرے ہوئے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا شائبہ سا تھا، جیسے کسی پرچھائیں کی بھی پرچھائیں ہو۔

چلے جاؤ! اس نے آہستہ سے کہا۔ اس نے بے خیالی ہی میں ہاتھ سے اس چہرے کو مٹا دینا چاہا جو اپنے نقوش بدل رہا تھا، کسی اور کا چہرہ بنتا جا رہا تھا۔

تم ان باتوں کو سننا ہی نہیں چاہتے، اس نے کہا۔ اب آخر پپیا بھی تو ہے نا۔ چلو ٹھیک ہے اسے کسی نے اس کے گھر سے نہیں نکالا۔ کوئی ابھی اس کے پیچھے چاقو لہراتا ہوا نہیں دوڑا۔ اسے نیچے گرا کر اس سے بارہ بلوائیوں نے زیادتی نہیں کی ہے۔ اسے کیا حق ہے؟ کیا حق ہے بھلائی کی باتیں سوچنے کا؟ کیا حق ہے بہار سے پاسپورٹ ویزا لے کر یہاں آنے کا؟ ہوائی جہازوں اور پھر ٹرینوں میں مارے مارے پھرنے کا؟ نہیں! پہلے اس کا بدن چیتھڑے کرو... پھر... پھر... خوابوں سے بھری الو کی پٹھی...

لیکن اس کے ساتھ چپکا دوسرا ہیولا اسے ٹھوکے دینے لگا تھا۔اس کا سنسنایا ہوا بدن پہلے ڈھیلا پڑا، پھر پوری طرح دوسرے کی اور متوجہ ہوگیا۔اس کے دماغ میں ایک دوسرا نکتہ آچکا تھا۔ دو تین کروٹیں لے کر آخر وہ اٹھ بیٹھی۔ کچھ تذبذب کے بعد اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ کمرے میں خوشبیر جی کی موجودگی میں وہ سگریٹ نہیں پیتی تھی۔لیکن اس وقت تو وہ سو رہی تھیں۔وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔دھواں باہر جائے تو اچھا! کمال ہے کہ اس بحث میں اس نے یہ کیوں نہ پوچھا: حکومت کی مدد اور بیرونی امداد دونوں ہندوستان والے پنجاب میں کامیاب رہے تھے، آخر یہ کیسے ہوا؟ یہ نکتہ کیسے رہ گیا؟ اور اب بار بار اس کے حلق میں اٹک رہا ہے۔ وہ لالچی نظروں سے ٹیلیفون کو دیکھنے لگی۔ فرض کرو وہ فون کرکے پوچھے؟ نہیں، یہ تو بہت بدتمیزی ہوگی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر فون کی طرف دیکھا۔ سمجھیں گی پاگل ہے، اس نے سوچا۔

گھڑی دیکھی۔ گھڑی میں بنگلہ دیش کا وقت ہی نہ تھا۔ لاحول ولا... وہ اپنے اوپر لعنت بھیج کر پھر ٹہلنے لگی، ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتی۔

آخر اس نے رسیور اٹھا ہی لیا۔استقبالیہ سے ریسپشنسٹ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز: ''یس پلیز؟''

لاحول ولا! یہ کیا بیہودگی ہے، اس نے سوچا۔

''کچن ملا دیجیے،'' اس نے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔اسے ڈر لگ رہا تھا کہ خوشبیر جی جاگ نہ جائیں۔

''کچن بند ہے،'' ریسپشنسٹ کی آواز آئی۔''آپ کو کیا چاہیے؟''

''چائے،'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''میڈم، کچن بند ہو چکا ہے۔اس وقت رات کے ڈھائی بجے ہیں۔''

''سوری، ویری سوری۔''

''کوئی بات نہیں۔شب بخیر۔''

لیکن اتنی دیر میں خوشبیر جاگ چکی تھیں۔''کیا بات ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

وہ ان کے پرسکون چہرے کو دیکھنے لگی۔ چاندی کے تاروں جیسے بالوں میں گھرا، اچھا خاصا جوان چہرہ۔ اگر میں بھی گاندھی وادی ہوتی تو آج سکون کی نیند میں سوتی ہوتی، اس نے کسی قدر شبے کے ساتھ سوچا۔

''نیند نہیں آ رہی خوشبیر جی،'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''نیند کی گولیاں دوں؟'' خوشبیر جی فکرمندی سے اٹھ بیٹھیں۔ پھر بستر پر بیٹھ کر فرش پر رکھا اپنا

ہینڈ بیگ اٹھایا اور جلدی جلدی گولیاں ڈھونڈنے لگیں۔

''آپ لیتی ہیں سلیپنگ پلز؟'' فہمیدہ ریاض کو حیرت ہو رہی تھی۔

''برسوں سے،'' انھوں نے جواب دیا۔

فہمیدہ ریاض نے خاموشی سے دو سلیپنگ پلز پانی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے نیچے اتاریں اور بستر میں گھس گئیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ بے سدھ ہونے لگیں۔ آتی نیند کے پہلے، تقریباً لامحسوس جھونکے میں اسے خوشبیر جی کے وی ایس نائپال کی کتاب پر لکھے مقالے کی پہلی سطر یاد آئی! پہنچ جانے کا بھید، اسی پر تو لکھا تھا نا انھوں نے: ''وہ پہنچ کر بھی نہیں پہنچے۔'' انھوں نے یاد کیا۔ وہ اپنے مفروضوں پر تھوڑا سا ہنسیں اور پھر نہ جانے کب سو گئیں۔

۲۰ دسمبر

اب تو بس ایک ہی دن رہتا ہے۔

سیمینار تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ آج شام انگریزی اور بنگالی کا ملا جلا مشاعرہ ہوگا۔ شام کو وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی کے پاس چائے ہے۔

ناشتے پر شرمیلا ٹیگور نے اس سے کہا، ''شونو، آج میرے ساتھ چلو گی؟ میں ڈھاکہ گھومنا چاہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔''

انھوں نے آتے ہی ہندوستانی سفارت خانے فون کیا تھا، جہاں ان کی ایک طالب علم لڑکی فرسٹ سیکرٹری تھی۔ مگر وہ بنگالی نہ تھی۔ وہ ڈھاکہ میں زیادہ خوش بھی نہ تھی۔

آج تو آخری دن ہے، میں نے سوچا۔ دل اتنا بھاری کیوں ہو رہا ہے؟ کیا ہو گیا مجھے چند دنوں میں؟ محبت تو نہیں ہو گئی؟

محبت؟

پھٹ سے محبت کرو، پھر پچھتاؤ!

اچھا، یوں ہی سہی! اتنے دنوں میں ماری ماری پھری ہوں۔ میں نے اپنا ڈھاکہ دیکھا ہے۔ آج میں

ان کا ڈھاکہ دیکھ لوں!

''مگر میں بازار سے کچھ خریدنا بھی تو چاہتی ہوں۔''

''ہم دونوں چلیں گے۔''

''اور گیارہ بجے مجھے عورتوں کی میٹنگ میں جانا ہے۔''

''عورتوں کی میٹنگ؟'' شرمیلا ٹیگور کی خوبصورت، کالی بنگالی آنکھیں پھیل گئیں۔''وہاں تو ضرور ہی چلیں گے۔''

فہمیدہ ریاض کو اسی کی توقع تھی۔ اب یہ تحریک کہاں رکنے والی ہے، اس نے سوچا۔

برٹش کاؤنسل میں سیمینار کا آخری سیشن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اندر ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک بزرگ کوئی بہت طویل مقالہ پڑھ رہے تھے۔ ہال میں صرف چند افراد بیٹھے تھے۔ وہ چپکے سے باہر کھسک آئیں۔ لان پر لڑکیاں جلدی جلدی چائے کے برتن لگا رہی تھیں۔ جہانگیر پور یونیورسٹی کے پروفیسر لان پر بیٹھے مکھیاں اڑا رہے تھے۔''کیا ابھی پہلا مقالہ جاری ہے؟'' انھوں نے بہت منت سے پوچھا۔ انھیں جا کر سوالوں کا سیشن شروع کروانا تھا۔

''جاری ہے،'' شرمیلا نے کہا۔''خدا کے لیے اندر نہ جائیے گا۔''

وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ تین چار لڑکیاں ان کے ساتھ ہو لی تھیں۔ ایک امریکن لڑکی بھی تھی۔ وہ کسی ریسرچ کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی۔

فردوس کی گاڑی میں وہ ماما گھر بازار روڈ پر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک پرانا چرچ نظر آیا، اور پھر دورشلپ کلا اکیڈمی، فنونِ لطیفہ کا ادارہ۔

''ارے یہی تو زین العابدین نے بنوائی تھی نا؟''

''ہاں،'' شرمیلا ٹیگور نے کہا۔''واپسی پر یہاں چلیں گے۔''

وہ ایک بار پھر پریس کلب کے سامنے سے گزرے۔ پھر ایک چھوٹی سی سڑک پر مڑ گئے۔ اس کا نام تھا: حضرت عثمان غنی روڈ۔ فہمیدہ ریاض کو کراچی کی عثمانیہ کالونی یاد آئی۔ اس کے ساتھ جڑی ہوئی رضویہ کالونی تھی۔ ایک زمانے میں ہر سال محرم کے مہینے میں دونوں کالونیوں سے عورتیں اور بچے کہیں اور منتقل کر دیے جاتے تھے۔ صرف تنومند جوان رہ جاتے تھے جو لڑ بھڑ سکیں۔ یا سفید براق کرتوں پاجاموں میں

ویسے ہی دودھیا ڈاڑھیوں والے بوڑھے، جو اپنے اپنے فرقے کے جوانوں کو لڑا سکیں، انھیں جوش میں لانے والی تقریریں کر سکیں۔ جس روز چپ تعزیہ نکلتا، شرپسند اسی راستے پر بیلوں اور رنگین جھنڈیوں سے بڑا سا 'چار یار' کا گیٹ بنا دیتے۔ بس لڑائی شروع ہو جاتی۔

''کیا یہ سنیوں کا علاقہ ہے؟'' فہمیدہ ریاض نے رازداری سے پوچھا۔

''سنیوں کا؟ یہاں سب سنی ہیں،'' فردوس نے جواب دیا۔ وہ بھی یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتی تھیں۔ ''کون کہتا ہے یہاں شیعہ ہیں؟''

فہمیدہ ریاض نے فوراً کہا، ''میں نے خود دیکھے۔ پرانے ڈھاکہ میں۔ حسینی دالان میں تو بہت بڑا امام باڑہ ہے۔''

فردوس نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اولڈ ڈھاکہ؟ عجیب بات ہے! دراصل اُدھر ہم لوگوں کا جانا ہی نہیں ہوتا۔''

''شہر کی انتڑیوں میں...''

نہ جانے اس نے کیوں کہا۔ شاید اس لیے، اسے یاد آیا، ان پتلی پتلی گلیوں اور گلیاروں سے گزرتے ہوئے اس نے بہت سی گوشت کی دکانیں دیکھی تھیں۔ ایک دکان پر شاید اسے آنتیں بھی نظر آئی تھیں۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی، ڈھاکہ کی قدیم، کوئی دوسو برس پرانی زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے — ایک خاص طرح کی اردو۔ جب شمالی ہندوستان کی بولیاں آپس میں گھل مل کر وہاں کی کھڑی بول بنا رہی تھیں... حسین شاہی زمانے میں... مغلوں سے پہلے...

لیکن اس نے کہا نہیں۔ بعد کے حالات کی دھول نے تاریخ کے ایک حصے کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ اب یہاں شہید مینار ہے — اردو کی اجارہ داری کے خلاف بنگالیوں کی اولین جدوجہد کی نشانی۔

کیا یہ سب کچھ منفی تھا؟

کہا نہیں جا سکتا۔ ایک دن یہ دھول اپنے آپ ہی ہٹ جائے گی۔ شاید چیزیں اپنے صحیح تناظر اور تناسب میں نظر آ سکیں گی... نہ اپنے آپ سے بڑی اور نہ معدوم۔ بنگال کی زبان بنگالی ہی ہے، مگر ڈھاکہ کی قدیم زبانوں میں سے ایک اردو بھی ہے۔

حضرت عثمان غنی روڈ کی ایک کوٹھی کے احاطے میں میٹنگ تھی۔

کچھ دن میں بھی رضویہ کالونی میں رہی تھی۔محرم بھی پڑا تھا۔ہمیں کوئی کچھ نہ کہتا تھا، نہ سنی نہ شیعہ؛ حالانکہ ہمارا گھر بالکل بارڈر پر تھا، یعنی جہاں رضویہ کالونی اور عثمانیہ کالونی کا اتصال ہوتا تھا۔لوگ ہمیں چھیڑتے ہی نہ تھے۔منھ سے تو کچھ نہ کہتے، مگر نظروں سے صاف پتہ چلتا کہ کیا سوچتے ہیں۔اڑتی اڑاتی کبھی ہم بھی سن لیتے۔لوگ کہتے تھے، یہ تو پاگل ہیں، پتہ نہیں کمیونسٹ ہیں کہ کیا! ہم ان کے مار دھاڑ کے سالانہ کھیل میں شامل جو نہ ہو سکتے تھے۔ہم بھی جان کی خیر مناتے، محرم کا مہینہ گذار دیتے۔سنی پڑوسیوں سے سنیوں کی تعریف کرتے، اور شیعوں سے کہتے کہ بس کیا کریں، سنی گھرانوں میں پیدا ہو گئے، ورنہ دل سے ہم شیعہ ہیں۔دونوں میں سے کوئی فرقہ ہماری بات پر یقین نہ کرتا تھا۔سننے والے مسکرا کر، محظوظ ہو کر، گردن ہلاتے چل دیتے تھے۔پھر پتہ چلا کہ محلے میں یہ بات پھیل گئی کہ یہ تو مسلمان ہی نہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ اس افواہ کا محلے داروں پر کچھ اثر نہ ہوا۔وہ پہلے کی طرح ہمیں اپنی شادی و غم میں بلاتے رہے، ہماری ضرورتوں کا خیال رکھتے رہے۔پتہ چلا کہ اس علاقے میں اصل مسئلہ مسلمان ہونا یا نہ ہونا نہ تھا، بلکہ شیعہ یا سنی پر زور تھا۔اور یہی اصل سوال تھا... بلکہ واحد سوال۔

جب ہم نے وہ مکان چھوڑا تو ہمارے شیعہ اور سنی پڑوسی بہت دکھی ہوئے۔سامان کو دوسرے مکان تک لانے کے لیے گاڑی کا انتظام کیا۔انھیں یقین تھا کہ ہم ان کے مخالف نہیں ہیں۔بس اسی بنیاد پر وہ ہمیں اپنا سمجھنے لگے تھے... حالانکہ یہ کوئی بنیاد نہ تھی۔

اچانک ہی سڑک پر گزرتی رکشاؤں کو دیکھ کر اسے نوکا یاد آئی، اور ایک سارنگ، جس کی آنکھیں کچھ بھوری تھیں، منھ پر ڈاڑھی میں سفیدی کی ایک لکیر، اور اس کے ہونٹ... اور اس کے ہونٹ...

وہ پھر گردن لمبی کر کے اسی کی جانب تکنے لگی۔کہاں سے آ جاتا ہے یہ شخص... حیرت انگیز!

اس کا دھیان عورتوں کی میٹنگ سے تقریباً ہٹ چکا تھا۔

لیکن اندر ایک بڑے پوسٹر پر اس کی نظریں ٹکیں۔کوئی بنگالی خاتون پرانے زمانے کے انداز سے ساری کا پلّو ڈالے کھڑی تھیں۔ساری کی چنّٹ بھی پرانے انداز کی تھی۔الٹے بل دیے گئے تھے۔ان کے ہاتھ میں رولر کی طرح گول کیا ہوا فائل تھا۔

''کون ہیں یہ؟''

''رقیہ بیگم۔اٹھارہ سو اسّی میں عورتوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے جدو جہد کی۔''

''اچھا؟ انھی کے نام پر یونیورسٹی میں رقیہ ہال ہے؟''

''ہاں۔ اپنے وقت میں یہ اتنی ترقی یافتہ باتیں سوچ اور لکھ سکتی تھیں، کہ آج پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔''

''اچھا؟ پھر بھی سمجھا جاتا ہے کہ برصغیر میں مسلمان عورتیں ہمیشہ دوسروں سے پچھڑی ہوئی رہیں۔ ہندوستان میں بھی میں نے ان کا تذکرہ عورتوں کی تحریکوں کی تاریخ میں نہیں دیکھا۔''

فردوس ہنسیں۔ ''بھئی، یہ اس طرف رہ گئیں نا۔ اب بنگلہ دیش جس حصے کا نام ہے، اس کے بارے میں کوئی کچھ یاد ہی نہیں کرتا۔ نہ ہندوستان نہ پاکستان۔''

اندر کمرے میں تیس پینتیس عورتیں جمع تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار تعجب ہوا کہ ہماری عورتوں کی انجمنوں کے برعکس ان میں غریب عورتیں بھی تھیں، بلکہ زیادہ تعداد انھی کی تھی۔

زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ بینت کی چند کرسیاں۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ اس میٹنگ کی ساری کارروائی صرف بنگالی میں ہو رہی تھی۔

پھر ریسرچ کے لیے آئی امریکن لڑکی نے بولنا شروع کیا۔ ''کیا آپ جانتی ہیں آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے امریکی آپ پر ایسی دوا استعمال کر رہے ہیں جس کے نقصانات کا ابھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ ایک کیپسول ہے جو بازو یا جسم کے کسی اور حصے پر معمولی جراحت کے ذریعے بدن میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جب تک کیپسول بدن میں رہے، حمل نہیں ٹھہرتا۔ لیکن اس کے منفی اثرات کیا ہوں گے، اس کا علم تو تب ہوگا جب یہ اثرات آپ پر ہونا شروع ہوں گے۔ بنگلہ دیش کی مفلس، بھوکی ننگی عورتوں پر تجربہ کیا جا رہا ہے!'' فردوس بنگالی میں ترجمہ کرتی جا رہی تھی۔ بنگالنوں کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں جو پڑھی لکھی نظر آ رہی تھیں، ان کے حلقوں میں دھیمے لہجوں میں کہے جملوں کی سرسراہٹ سی اٹھی، اور لہر کی طرح گزری۔ امریکن لڑکی بات ختم کر کے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے جینز پر چھینٹ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ مشکل سے بیس بائیس برس کی ہوگی۔

جب عورتیں چائے پینے اٹھیں تو فہمیدہ ریاض سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ بنگلہ دیش آنے سے پہلے ایک برس ہندوستان رہی تھی۔ کلکتہ میں۔

اسے پپیا کا خیال آیا۔

میٹنگ سے واپسی پر شرمیلا ٹیگور اور وہ دوسروں سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے ایک نوکا طے کی۔

''کہاں چلیں پہلے؟''

اسے گم ہو جانے کا ذرا خطرہ نہ تھا؛ شرمیلا بنگالی جو جانتی تھی۔ جاننا کیا مطلب، اس کی تو زبان تھی بنگلہ۔ شرمیلا ٹیگور سے مشابہ یہ بنگالی حسینہ حسرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، راہ چلتوں سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''آپ نہیں سمجھیں گی،'' اس نے فہمیدہ ریاض سے کہا۔ پھر رک کر، ''جیون میں پہلی بار لگ رہا ہے کہ بنگال میں ہوں۔ کلکتہ بنگالی تو کب کا نہیں رہا۔ ہمارا کلچر، ہماری بولی، سب کچھ یہیں ہے، اپنی اصل شکل میں۔''

فہمیدہ ریاض چپ چاپ رکشا میں اس کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ایسا نہیں کہ وہ اس کے ساتھ ہمدردی نہ کر سکتی تھیں۔ اسے کیسا لگ رہا ہوگا؟ ایسا ہی جیسے خود اسے میرٹھ میں، یا یوپی کے چھوٹے شہروں میں محسوس ہوا تھا۔ یہ ان کے جذباتی سفر تھے جن کا تاریخ سے رابطہ نہ تھا۔ وہ کسی اور ہی جہت میں کیے گئے سفر تھے۔

ان کی رکشا لال باغ قلعے کی طرف جا رہی تھی۔

تم تو ہو، اس نے سوچا، مگر میں بھی تو ہوں۔ اس شہر کے گلی کوچے تمھارے لیے کیا ہیں، اور میرے لیے کیا ہیں! اس چھوٹی سی رکشا میں دو پوری کائناتیں سمائی جا رہی ہیں؛ دو دھارے، جن کا سنگم کہیں بھی نہیں۔ یونہی متوازی یہ نہیں بہہ سکتے کیا؟ ایک دوسرے پر جھپٹا مارے بغیر؟ اور ہوسکتا ہے، اچانک ہم ایک دوسرے سے بات کریں۔

کیا سوچ رہی ہوگی یہ ہندوستانی بنگالن؟

سوچتی ہوگی، تم کیا جانو!

اس لیے وہ حیران ہوئی جب اس نے اچانک کہا، ''آپ لوگوں کے تو ملک کا یہ حصہ رہا ہے۔''

وہ چونک پڑی۔ اچھا، تو یہ عورت اس کے بارے میں سوچ رہی ہے! وہ شرمندہ ہوگئی۔ لیکن پھر دل پر ایسی گمبھیر اداسی اتر آئی کہ اسے پورا شہر ویران نظر آنے لگا۔ دلّی... ڈھاکہ... اسلام آباد...

اور کراچی...

کراچی، جہاں یہ متوازی بہتی دھارائیں ٹکرا رہی تھیں۔ یہ مل نہیں پا رہی تھیں... ٹکرا رہی تھیں، اور لہو سے سرخ سرخ جھاگ۔

اورنگ آباد کا قلعہ — جسے لال باغ قلعہ کہتے ہیں، کیونکہ بنگالیوں کو یہ لفظ ''لال'' بہت پسند ہے؛

لال باغ، لال ماٹی، لال مسجد — اورنگ زیب کے بیٹے محمد اعظم نے بنوایا تھا، ۱۶۷۸ء میں۔(بورڈ پر لکھا تھا۔) تین سو برس پہلے، اس قلعے کے لیے راجپوتانہ اور دکن سے ہاتھیوں کے کارواں پتھر ڈھو کر لائے ہوں گے؛ بہار سے سنگِ سیاہ، مدھیہ پردیش سے سرمئی پتھر اور راجپوتانہ سے سنگِ مرمر۔

رکشا سے اتر کر وہ قلعے میں داخل ہوئے۔سامنے مرجھائی دوب پر دولڑکے کھڑے تھے۔طالب علم معلوم ہوتے تھے۔دونوں ہاتھوں میں کیمرا لیے پریشان کھڑے تھے۔انھیں دیکھ کر جھجکتے ہوئے آگے بڑھے،اور شرمیلا ٹیگور سے بنگالی میں مخاطب ہوگئے۔خدا ہی جانے انھیں کیسے اندازہ ہوگیا کہ ان دونوں میں سے شرمیلا ٹیگور ہی بنگالی ہے۔شرمیلا کھل اٹھی۔فوراً پری بی بی کے مقبرے کے سامنے دونوں کی تصویر کھینچ کر ان کا کیمرا واپس کیا۔خوشی خوشی ان سے بنگلہ بھاشا میں باتیں کرتی ان کے ساتھ آگے آگے چلنے لگی۔

میں پیچھے پیچھے ان کے قدم پر قدم رکھتی چلی آتی تھی۔دونوں لڑکوں نے ایک بار میری طرف دیکھا بھی نہیں۔اتنا بھی نہیں کہا کہ اچھا! آپ مغربی پاکستان سے آئی ہیں؟

پری بی بی نواب شائستہ خان کی بیٹی تھیں، جو شہزادہ محمد اعظم کے بعد بنگال کے گورنر بنے۔(بورڈ۔)

نواب شائستہ خان کے حمام کے سامنے وہ لڑکے ان سے جدا ہوکر دوسری طرف چلے گئے۔میں نے زور سے کہا،''شولام آلے کم!''

''شولام، شولام،'' دونوں نے بہت خوش ہوکر مجھے دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ان دونوں کے نام بھلا کیا تھے؟ نورالہدیٰ اور شمس الضحیٰ یا شاید لکم دینکم ولی دین ہوں گے۔کیا خاک مسلمان تھے کمبخت، مجھے تو پہچاننے سے منکر، بس نام کے مسلمان، میں نے جل کٹ کر سوچا۔

شرمیلا ٹیگور جذباتی ہو رہی تھیں۔''بالکل ہی تو اپنے لگتے ہیں... آہ، بالکل ہی تو اپنے...''

ہم بورڈ پر لکھی عبارت پڑھنے لگے۔اس قلعے کے گنبدوں کی خاص بات یہ ہے کہ مغل ماہرینِ تعمیر نے ان کی چھتوں کی بناوٹ بالکل بنگالی جھونپڑیوں کی چھتوں کی مانند بنائی ہے۔

اوپر نگاہ ڈالی تو حیران رہ گئی۔ارے واقعی، کس قدر خوبصورت خیال تھا۔بالکل جھونپڑیوں کے سبک، درمیان میں خفیف سے مدوّر خم والی چھتوں کے نمونے کو پتھر میں کس فنکاری سے اتارا ہے۔ایسی چھتیں تو میں نے نو کاؤں پر بھی دیکھی ہیں، بوڑھی گنگا پر۔

سوچا، یحییٰ خان کم بخت میں مغلوں جتنی نہ عقل تھی اور نہ نازک خیالی۔

حمام میں اب میوزیم ہے۔ مغلوں کی باقیات۔ وہاں ایک گائیڈ ملے۔ نہایت ضعیف، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ سرد آہ بھر کر کہنے لگے، ''میں نے زمانے کے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔'' معلوم ہوتا تھا مغل دور سے زمانے کو دیکھ رہے ہیں، مگر وہ صرف جنرل ایوب کے زمانے کی بات کرتے تھے۔

اندر آنکھیں چکا چوند کرنے والا سکوں کا ذخیرہ، اورنگ زیب اور اس کی اولاد کے دور کے مخطوطات، چینی کے ظروف۔ ایک سکے پر جہانگیر پالتی مارے پدم آسن میں بیٹھے ہیں۔ تصویر بنانے میں آسانی کے لیے چہرہ بائیں شانے کی جانب موڑ رکھا ہے۔ مغل مصور پروفائل بنانا جانتے تھے، روبرو چہرے پر انھیں ناک کشید کرنا نہ آتی تھی۔

فرامین۔

''ارے کیا یہ اصلی ہیں؟ یا یہ نقل ہے؟''

''بالکل اصلی جناب!''

فرمانوں میں جگہ جگہ فارسی نثر میں خاص مقامی بولیوں کے الفاظ جڑے ہوئے۔ اردو کی ابتدا، اس نے سوچا۔ آپ یہاں ایک زبان کا جنم ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ یہ فرامین ایک زچہ خانہ ہیں۔ اور آگے چل کر اس کو اتنا متنازعہ بننا تھا! لہو سے زمین کو لال کرنا تھا۔ لال ماٹی، لال باغ، لال مسجد...

ایک دیوار پر کئی تصویروں پر ''مدھوبنی'' کا نام۔ ''اس کا کیا مطلب؟'' معلوم ہوا مغل دور کی ایک مصورہ تھیں۔

آتے ہوئے اس نے تبصرہ لکھنے کے لیے رجسٹر کھولا۔ وہ کیا لکھے؟ جنیوا کیمپ...

سکوت کا ایک طویل لمحہ اس کے سر میں سے گزر گیا۔ پر اس نے پسیجتے ہاتھوں سے انگریزی میں لکھا: ''میں نے دلّی میں لال قلعے کا میوزیم دیکھا ہے۔ حیدرآباد دکن اور آگرہ کے عجائب گھر بھی دیکھے ہیں۔ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مخطوطات کا اتنا صاف ستھرا ذخیرہ اور اس تعداد میں محفوظ سکے کہیں اور موجود نہیں۔''

شرمیلا ٹیگور دلچسپی سے اس کا لکھا پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے بنگالی میں دو سطروں کا تبصرہ لکھا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ کس طرح یہ ذخیرے محفوظ رہ گئے؟ اٹھارہ سو ستاون کے غدر میں ڈھاکہ دلّی اور شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں کی مانند اس قدر نہ لٹا تھا، شاید اسی لیے۔

وہ واپس برٹش کاؤنسل آ گئے۔ سیمینار کا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں کچھ لڑکے اور لڑکیاں کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے۔

وہ دروازے سے جھانکنے لگی۔

باہر اداس، بے نور شام اتر آئی تھی۔ آسمان پر سیاہ کوے بوکھلائے گھوم رہے تھے۔ ان کی کاں کاں میں ایسی نحوست تھی جیسے رات کے ساتھ یہ شہر مر جائے گا۔

کاؤنسل کے منیجر ان سے باتیں کرنے لگے۔ وہ بھی مغربی پاکستان رہ چکے تھے۔ جنگِ آزادی سے پہلے۔ جنگِ آزادی...

اندر وہ نہ تھا۔

وہ بھی تو ہوسکتا تھا... وہ ہیولا جو صرف انگاروں سے بنا ہوا تھا۔ یہ کھیل... وہ لکھ سکتا تھا یہ کھیل... یہیں اسی ڈھاکہ میں... وہ اس کی ہدایت دے سکتا تھا، یا اس میں کام کرتا ہوتا... وہ بول سکتا تھا... اور اس کے ہونٹ، اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم آ سکتا تھا۔

یا شاید ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے بدلے اس نے شہید اللہ قیصر کو اذیتیں دے دے کر مار ڈالا... دوڑتا ہوا فوجیوں کے پاس جا پہنچا... ''یہاں چھپے ہیں سالے۔ مارو!'' پھر داؤ لگتے ہی بھوکے ننگے زخمیوں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے دوڑ پڑا... اس کی تکا بوٹی کرنے ہونکتا ہوا بھاگا... بلیا، قصبہ، گورکھپور سے کاٹھمنڈو...

ڈھاکہ سے کراچی آنے والی ہر پرواز میں کتنے بہاری ہوتے ہیں، اس کا شمار کرنا مشکل ہے۔ بنگلہ دیش کا پاسپورٹ بناتے ہیں، کراچی پہنچ کر پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔

ایرپورٹ پر اتنی بھیڑ تھی۔ وہ حیران ہوگئی تھی۔ ''ارے اتنے بنگالی کہاں جا رہے ہیں!'' اس نے قطار بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

بھیڑ میں کھڑی، تنگیل کی ساری لپیٹے، ایک سانولی، چھریری جادو بھری آنکھوں والی بنگالن نے اسے مڑ کر دیکھا... اور پھر وہ بنگالن نہیں تھی۔

''تم تو بنگالی نہیں!'' اس نے اردو میں کہا۔

بھیڑ کی بھیڑ... چادروں میں سارے برتن بھانڈے باندھے، پانوں کی ٹوکریاں سنبھالے۔ کچھ

نے سب سامان بیچ زیور بنوا لیے تھے، اور سب ہی پہنے تھیں۔ نئے ملک میں کام کریں گے۔

ایک دن نئے مہاجروں اور پرانے مہاجروں میں ٹھن جائے گی کیا؟

میسور میں... ہاں میسور میں ہی تو اس نے پڑھا تھا... کرناٹک میں پہلے سے آ کر بس جانے والے ترکوں اور بعد میں آنے والے ترکوں میں بن نہ سکی۔ دونوں میں باہم خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ کرناٹک میں مسلمانوں کو اب بھی عام طور پر ترک ہی کہا جاتا ہے، تر کرو۔

اسے سندھیوں کا خیال آیا۔ بے بس تماشائی! دل کٹ کے رہ گیا۔ ان کی کوئی روک تھام ہونی چاہیے، اس نے بوکھلا کر سوچا تھا۔ لیکن پھر وہ ایک ایسی گھناؤنی شرمندگی سے بھر گئی تھی کہ اسے اپنے آپ سے اور ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش سے اور اس ہجوم سے اتھاہ کراہت محسوس ہوئی تھی۔ کھایا پیا الٹا آ رہا تھا۔ ابکائی روک رہی تھی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا... گرم پانی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ یہ جہاز اسے کراچی کے بدلے کہیں اور لے جائے۔ بس کہیں اور... دور... بہت دور... ان سب سے دور۔

بھٹکی اور بچھڑی ہوئی دو عورتوں کو لینے یونیورسٹی کی ایک گاڑی آ پہنچی تھی۔

''وائس چانسلر کی چائے تو رہ گئی۔ اب آپ شاعروں کے اجتماع میں چلیے۔''

ٹیچرز ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کی دوسری منزل پر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا۔ شعر کے رسیا بنگالی۔

یہ شمس الرحمٰن ہیں، بنگلہ دیش کے سب سے ممتاز شاعر۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ گورے چٹے آدمی تھے۔

''یہ تو برٹش کاؤنسل کا انتظام ہے، اسی لیے میں آ گیا۔ پچھلے دنوں سرکاری مشاعرے کا ہم سب نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا،'' انھوں نے کہا تھا۔

ان کی نظم کا انگریزی ترجمہ سنایا جانے لگا۔ یہ ترجمہ کبیر چودھری نے کیا تھا۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی، جب ڈھاکہ کو خاموش کر دیا گیا تھا۔

آزادی تیرے لیے
تجھے جیتنے کی خاطر
کتنی بار ہم خون کے سمندر میں نہائیں؟
دوزخ کے شعلوں سے گزریں؟
تو آ رہی تھی اس لیے

سکینہ بی بی کا جیون بجھ گیا
اور ہری داسی وِدھوا ہو گئی
تو آ رہی تھی اس لیے
ایک کتا روتا رہا بے صبری سے دیر تک
مردہ مالک کے مکان کے کھنڈر پر
تو آ رہی تھی اس لیے
ایک بچہ لاشوں پر رینگتا رہا
ایک بوڑھا قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے
اور تیرا انتظار کر رہا ہے
سہ پہر کا کمزور سورج
اس کی آنکھوں میں چمک رہا ہے
تیرے منتظر ہیں
شہباز پور کا گبھرو کسان صغیر علی
میگھنا کی موجوں پر
بے خوفی سے نو کا کھیتا مطّلب میاں
ہنر مند سارنگ
اور رستم شیخ، رکشا والا
جس کے پھیپھڑوں کو کیڑے کھا رہے ہیں
اور آگ بگولہ ایک جوان
جو جنگلوں میں گھوم رہا ہے
اس کے قدموں کی دھمک
جنم دے رہی ہے ایک نئی دنیا کو
تجھے آنا ہی پڑے گا

اے آزادی
تجھے آنا ہے
اس بنگال میں

اچھا تو ہوٹل میں اس کی یہ آخری رات ہے۔

اس کا خوف حیرت انگیز طریقے سے غائب ہوگیا تھا۔ جس کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، تو ختم ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے! شاید تھکن تھی۔ آج وہ پیدل کتنا چلی۔

بستر میں لیٹ کر ٹھاٹھ سے ٹیلیفون کے ذریعے کافی منگائی۔ بیرا کافی کی ٹرے لایا تو بالکل نہ گھبرائی۔ دراصل دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب اتنے دنوں میں مجھے قتل نہیں کیا تو اب کیا کریں گے! ایسے معاملوں میں دماغ کا اپنا ہی حساب کتاب ہوتا ہے۔ عام لوگ نہیں سمجھ سکتے، یہ دنیا ہی اور ہے۔

سگریٹ سلگا کر ماچس کے شعلے کو دیر تک تکا کی۔

ایک اور ماچس سلگائی... بس یوں ہی۔ دیکھتے ہیں، پوری ماچس کتنی دیر میں ختم ہوتی ہے۔

بجلی بجھی اور سونے کی کوشش۔

اب یہ تو پوچھا ہی نہیں، امداد کا تجربہ ہندوستانی پنجاب میں کیسے کامیاب ہوا۔ چلو، کوئی کتاب ہاتھ لگی تو پڑھ لوں گی۔

تجربہ کامیاب ہوا۔ سردار امیر ہوگئے، اور غریب ہندوستان سے الگ ہونے کی ٹھانی۔ اسے ہندوستانی لکھکوں کے تجزیے یاد آئے۔ پنجاب میں بڑی صنعتیں نہ لگنے کے باعث سرمائے کو راستہ نہیں مل رہا ہے، گھٹن پیدا ہو رہی ہے۔ اسی نے مذہبی علیحدگی کا روپ دھار لیا ہے۔

پنجاب کے خوشحال کسان بہار کے بھک مروں کو کھیت مزدوری کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ ٹرینیں بھر بھر کر آتی ہیں۔ چھت پر بھی لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک بار کسی پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے کتنے ہی کٹ گئے۔ اخباروں میں بڑی سرخیاں لگیں۔ روزگار کمانے آئے تھے! کاہے کو گئے تھے اتنی دور؟ ہے گنگا میا! ہے گنگا میا، تو ہے پیڑی چڑھئی ہے، سیاں سے کر دے ملنوا ہمار۔

اس کے دماغ میں یہ خیال آیا، پنجاب پہلے بھی تھوڑا بہت خوشحال تھا۔ اس لیے حکومت کی مدد اور غیر ملکی ٹیکنالوجی نے فائدہ دیا۔ جہاں شدید غربت ہو، وہاں یہ دونوں چیزیں الٹا اثر دکھاتی ہیں۔ واللہ اعلم!

پھر دوسری تحریکیں ابھرتی ہیں۔قتل عام... سفا کانہ قتل عام... میرٹھ کے فسادوں میں وہ چلے گئے تھے۔ ان کا کام ہی یہ تھا کہ فسادوں میں جا گھستے اور لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے۔ دن رات مضمون لکھتے۔ ہندوستان میں ان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ ہیں تو مسلمان۔ میرٹھ سے واپسی پر دلّی رکے۔ رات ان کے گھر بتائی۔فہمیدہ ریاض ان کے لیے کھانا گرم کر کے لائی تھیں۔

''مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔''

''کیوں؟ کیوں بھائی صاحب؟ کچھ تو کھا لیجیے۔ بھوکے پیٹ سونا اچھا نہیں۔''

''بھئی، جو کچھ ہوا ہے... وہ بھی پولیس کے ہاتھوں... گھر میں گھس کر...ایک ہی بیٹا تھا ان کا سات بیٹیوں پر۔ گھر میں گھس کر شوٹ کیا...اور پھر باپ سے کہا کہ لاش اٹھا کر ٹرک میں ڈالو۔''

ان کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے ڈھلکتے ہوئے کھچڑی ڈاڑھی میں اٹک گئے۔

یہ بی بی بھی پکی۔آنسو لڑھک کر سالن کی پلیٹ میں گر رہے تھے۔''آپ کہاں ٹھہرے تھے؟''

''ہمارے ایک ہندو دوست ہیں بیچارے،ان کے ہاں۔کامریڈ آدمی ہیں بیچارے۔''

''کیا ہوا انھیں؟''

''ایک بیٹا تھا ان کا۔ ڈاکٹر تھا۔ان ہی فسادوں میں اسے مار ڈالا گیا۔''

''ارے!''

''مگر صاحب!'' آخر انھوں نے لقمہ توڑا۔''کمال کے آدمی ہیں۔کیا مجال جو پیشانی پر بل آیا ہو۔ اس قدر بری حالت میں، معاملے کی تحقیقات میں میری ہر طرح مدد کر رہے تھے۔اور لوگ... لوگ کہتے تھے کہ بڈھا بھس کھا گیا ہے؛لڑکا گنوا دیا پلا پلایا،اور پھر گھر میں گھسائے بیٹھا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں پھر لہر سی تیر گئی۔

وہ بھی تو ہے... ہے نا؟ اس نے تکیے سے کہا۔

ہاں ہے تو... مگر حاصل؟ دھوبی کے کتے... نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔

دھوبی کے کتے...

جب ایک ہوا چلتی ہے تو بس پھر چلتی ہے۔ ہونی کا روپ لیتی ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس قسم کی انفرادی واویلا مضحکہ خیز ہے۔ یہ اپنی ناطاقتی میں فحش بن جاتی ہے، جیسے کوئی نامرد کچھ کوشش کرتا ہو۔

پھر ایسے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟
سب کے ساتھ مل جانا چاہیے۔
اور وہ جو ایسا نہ کر سکیں؟
تو جو چاہے کرلیں... حاصل کچھ نہ ہوگا۔
کیا حاصل ہی سب کچھ ہے؟ کوشش خود ایک حاصل ہوتی ہوگی، اس نے کہا۔
اپنی بات کو حرفِ آخر بنانے کے لیے اب وہ سو جانا چاہتی تھی۔
لیکن حرفِ آخر کہاں تھا!
یہ ایک چلتی ہوئی فلم ہے، اور کائنات اپنی اٹوٹ تاریکی میں اپنے اوپر گھوم کر خود پلٹ جاتی ہے۔ ایسا ایک فزکس کے جرنل میں لکھا ہے۔
تاریکی میں ستارے...
کیا لوگ ہوتے ہوں گے! ستارے دیکھ کر جہاز رانی کرنے والے پرانے انسان۔
ایک طویل سناٹا...
پرجاتن ہوٹل میں ہر طرف سناٹا تھا۔
دور کہیں کسی پُر پیچ راہداری میں، جس کا فرش سرخ تھا، جس کے دونوں اطراف بھاری، بند چوبی دروازے تھے، کوئی شخص عالمِ نزع کی سی گھبراہٹ میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔
اس نے آنکھیں جھپکائیں۔ یہ میرا دل ہے...
اور یہ میں ہوں... میں خود...
صرف اگر ایک تازہ ہوا کا جھونکا آجائے... ایک دریچہ کہیں سے کھل جائے باہر کی طرف... تو میں... تو میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی... لوگوں میں... آدمیوں کے ہجوم میں...
مجھے کوئی بچا سکتا ہے... صرف کوئی دوسرا آدمی ہی مجھے بچا سکتا ہے... دوسرا آدمی... مجھ سے جدا کوئی اور...
اور یہ جو چاقو لہراتا پیچھے دوڑا آ رہا ہے؟ یہ بھی تو دوسرا آدمی ہے... تجھ سے جدا کوئی اور۔
یہ بھی... یہ بھی تو ہے... یہی ہے...
پلٹ کر دیکھا تو... یا خدا، یہ کون؟ اس کے لبوں پر ایسا معصوم اور لطیف تبسم! سب کچھ گڈمڈ سا ہے۔

چند اقتباسات

بے ایمانی لالچ کے مقابلے میں نئی ہے، کیونکہ بھوک جائیداد سے قدیم ہے۔

تشدد کے جرائم بھی لالچ جتنے ہی پرانے ہیں۔ غیر متمدن انسان ظلم کرنے پر مجبور تھا، کیونکہ اسے زندگی نے یہی سکھایا تھا کہ اس کے پاس ہر وقت ہتھیار ہو۔ لیکن چونکہ انسان کو جنگ میں شدید قتل و غارت کرنی ہوتی تھی لہٰذا انھوں نے امن کے وقت بھی قتل کرنا سیکھ لیا، کیونکہ کئی غیر متمدن ذہنوں میں باہم مذاکرات سے تنازعہ حل نہ ہوتا تھا۔ اہلِ فیوجی قاتل کو یہ سزا دیتے کہ اسے قبیلے کی حدود سے باہر نکال دیتے، جب تک کہ اس کے ساتھی اس کا جرم نہ بھول جاتے۔ کافر قاتل کو پلید خیال کرتے اور مطالبہ کرتے کہ وہ اپنا چہرہ تارکول سے کالا کرے۔

تقریباً تمام گروہ دوسرے گروہ کو خود سے گھٹیا خیال کرتے۔ امریکن انڈین خود کو منتخب انسان سمجھتے، جنھیں عظیم روح نے نسلِ انسانی کی سر بلندی کے لیے پیدا کیا تھا۔ کیرب کہتے، صرف ہم انسان ہیں۔ نتیجتاً غیر مہذب انسان کو کبھی احساس نہیں ہوا کہ دوسرے قبیلوں کے متعلق بھی وہ اخلاقی پابندیاں عائد کر دے جو وہ اپنے قبیلے کے متعلق روا رکھتا ہے۔ احکام اور رکاوٹوں کا اطلاق صرف اس کے اپنے قبیلے پر ہوتا تھا: مثلاً قتل نہ کیا جائے، کسی کا گھر نہ لُوٹا جائے۔ دوسرے قبیلوں کے ساتھ، اگر وہ اس کے مہمان نہ ہوں، وہ جہاں تک چاہتا جا سکتا تھا۔

ہم میں سے اکثر کے لیے شکار ایک کھیل ہے، جو قدیم دنوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جبکہ شکاری اور شکار دونوں کے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا، کیونکہ شکار صرف خوراک کی تلاش ہی نہیں بلکہ سلامتی اور غلبے کی جنگ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ سب کے لیے کھانا نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات صرف جنگجوؤں ہی کو کھانے کی اجازت ملتی تھی۔

شکار اور ماہی گیری اقتصادی ارتقا کے مرحلے نہیں تھے۔ یہ معاشرے کی اعلیٰ مقام پر زندہ رہنے کی سرگرمیاں تھیں۔ ایک زمانے میں وہ زندگی کا مرکز تھے اور آج بھی زندگی کی چھپی ہوئی بنیادیں ہیں۔ ہمارے ادب اور فلسفے، ہماری رسومات اور فن کے پیچھے پیکنگ ٹاؤن کے مضبوط شکاری کھڑے ہیں۔ بچوں کے کھیلوں حتیٰ کہ لفظ کھیل میں کمزور یا بھگوڑے شکار کا تعاقب کرنے کی تسکین بخش یادیں باقی رہتی ہیں۔ حتمی تجزیے کے اعتبار سے تہذیب خوراک کی فراہمی پر منحصر ہے۔

شکار کے ذریعے زندہ رہنا انسانی طبع کا خاصہ نہیں تھا۔ اگر انسان خود کو شکار تک ہی محدود رکھتا تو وہ فقط گوشت خور ہوتا۔ جب وہ شکار کی غیر یقینی صورتِ حال سے باہر نکلا تو زیادہ تحفظ پا کر انسان بنا۔

اسی دوران عورت سب سے بڑی معاشی دریافت کر رہی تھی، اور وہ زمین کی فیاضی تھی۔ جب مرد شکار پر جاتا تو اسے جھونپڑے کے اردگرد جو خوردنی شے ملتی، اسے اٹھا لیتی۔ عورت درختوں سے جوز اور پھل توڑتی؛ شہد، بیج اور قدرتی اناج اکٹھا کرتی۔

بہت کم معاشروں نے اپنے اخلاقی ضابطے کی بنیاد معاشی اور سیاسی افادے پر رکھی۔ انیس سو سال پہلے قدیم زمانے کے ایک ماہر جغرافیہ دان نے اس موضوع پر لکھا:

''قدیم لوگ سمجھتے تھے کہ وہ شاعری کے ذریعے زندگی کے ہر حصے کی اطمینان بخش تنظیم کر سکتے ہیں۔ ایک لمبے عرصے کے بعد تحریر اور فلسفہ سامنے آیا ہے۔ تاہم فلسفہ خواص کے لیے ہے، اور شاعری زیادہ لوگوں کے لیے مفید ہے۔''

فرد کو فطرت کی طرف سے ایسا مزاج نہیں ملا کہ اپنی شخصی دلچسپیاں گروہ کے مفادات کے ماتحت کر دے۔ معاشی محرکات کو انفرادی محرکات کے مقابلے میں مضبوط کرنے کے لیے ایک غیر مرئی نگہبان کو مقرر کر کے معاشروں نے مذہب کو ایجاد نہیں کیا، بلکہ اس کا استعمال کیا ہے۔

اخلاقیات پر جلد ہی مذہب کی مہر لگ جاتی ہے، کیونکہ مذہبی رسومات اور مافوق الفطرت عناصر ایسا اثر ڈالتے ہیں جو تکوینی طور پر ممکن نہیں۔ انسان پر علم کی نسبت تخیل کی حکمرانی آسان ہے۔ لیکن کیا اخلاقی افادیت مذہب کا نقطۂ آغاز تھی؟

وِل ڈیوراں: انسانی تہذیب کا ارتقا

زندہ بہار

یہ ان کا ڈھاکہ میں آخری دن تھا۔

چار بج کر پینتالیس منٹ پر ہوائی جہاز کی ایک پرواز اسے یہاں سے بہت دور لے جائے گی ... اس بار ڈھاکہ سے کراچی تک ایک سانس کی پرواز۔

جب وہ آئی تھی، اسے معلوم نہ تھا۔ صرف جہاز کا دروازہ بند ہونے پر، سفر کی دعا پڑھے جانے سے پہلے، اسے معلوم ہوا تھا، اس کا جہاز کاٹھمنڈو سے ہوتا ہوا ڈھاکہ جائے گا۔

اچانک انھیں بائیں ہاتھ پر ہمالیہ کی چوٹیوں کا سلسلہ نظر آیا تھا؛ ایک سانس روک دینے والا منظر۔ کتنے ہی مسافر شیشوں کے پار سے کھٹا کھٹ تصویریں لینے لگے تھے۔ وہ ایک صاف ستھرا دن تھا۔ اتفاق سے کہر نہ تھی۔ جہاز کی کھڑکیوں سے وہ کرۂ ارض کے سب سے بلند پہاڑ دیکھ سکتے تھے۔ برف سے ڈھکے، دھوپ میں جگمگاتے۔ وہیں کہیں تو شِو جی بیٹھے تھے، اس نے سوچا تھا، اپنی پتنی پاروتی کے سنگ، کسی کائناتی حالت وصل میں۔

بہت دن پہلے ہمالیہ کی ایک جھلک اس نے مسوری میں دیکھی تھی۔ صرف ایک جھلک کے لیے سیاح پہروں، دنوں انتظار کرتے تھے۔ ہمالیہ کہرے حجاب میں پوشیدہ رہتا تھا۔ تب ہی اچانک ایک دن، ایک پہاڑی موڑ کاٹتے ہوئے، وہ ہمالیہ کے روبرو تھی۔ پل بھر کو کہرا پگھل گیا تھا اور یہ مقدس منظر، کسی سراب کی طرح ناقابلِ یقین، آنکھ کی پتلی میں سما رہا تھا، جسے دیکھ کر قدیم آدمی نے پہلے پہل جانا کہ دیوتا کہاں رہتے ہوں گے۔ وہیں تو! انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا ہوگا، اور سنسکرت بولیوں میں ایک دوسرے کو بتایا ہوگا۔ پھر کہرا اچانک اسی طرح دوبارہ وجود میں آ گیا ہوگا، جس طرح اچانک معدوم ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ منظر اپنے تسلسل میں ان کے بائیں جانب جلوہ گر تھا۔ دل ہی دل میں فہمیدہ ریاض نے ہمالیہ کو سلام کیا۔ شِو جی کو آداب اور تسلیم عرض کیا۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں خیریت سے ہوں، اور آپ کی خیریت خداوندِ کریم سے نیک مطلوب۔ شِو جی! اس خط کو تار سمجھیے گا۔ ہے بھولے ناتھ! ہے شنکر! پاروتی جی کیسی ہیں؟ ماتا، شکتی شالی، جگدمبے... ہے امبے ماں! شکتی دے۔

اور اس کے ساتھ دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا کہ کاٹھمنڈو پہلا پڑاؤ رہا ہوگا۔

زندہ بہار لین سے کاٹھمنڈو! انجانے میں وہ اسی راستے پر الٹا سفر کر رہی تھی۔ جہاز نیپالی پہاڑیوں سے گزر رہا تھا۔ اب بھلا اتنی پہاڑیوں پر چڑھ کر لوگ کیوں رہے؟

اس نے کھڑکی سے سر جھکا کر نیچے جھانکا۔ پہاڑ اب نظر نہ آ رہے تھے۔ لیکن نیچے یہ کیا تھا؟ دور دور تک نیلاہٹ، جس کا کٹا پھٹا ساحل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تا حدِ نظر کیا پھیلا ہے؟ نہیں بھائی، سمندر یہاں کہاں! اسے اپنے جغرافیہ کے علم پر اس قدر شدید شک ہوا کہ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے لڑکے کا بازو ہلا کر پوچھا:

''یہ کیا ہے؟ یہ! یہ!''

وہ ناک چپکا کر جھانکنے لگا۔

''سمندر تو نہیں ہوسکتا... میرا مطلب ہے یہاں...''

امریکن مسکرایا۔ ''نہیں۔'' پھر سیٹ پر واپس آ گیا۔ ''جنگل ہوں گے۔ ترائی کے جنگل۔''

دو منٹ میں وہ دنیا کے سب سے گھنے جنگل پر سے گزر گئے۔

امریکن لڑکا، اب مجھے یقین تھا، ہیروئن اسمگل کر کے لے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے سفر کا نقشہ ہی ایسا بتایا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بزنس۔''

''کاہے کا بزنس؟''

''ہر چیز کا۔ پاکستان سے میں نے زیورات اور قالین خریدے ہیں۔ افوہ! مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ ہم کاٹھمنڈو کے راستے سے جارہے ہیں۔ مجھے پہلے ڈھاکہ جانا ہے، پھر کاٹھمنڈو۔''

''پاکستان میں کہاں گئے؟''

''پشاور۔ اب ڈھاکہ جارہا ہوں۔ اور پھر کاٹھمنڈو سے پھر پشاور۔ میں اس روٹ پر اکثر سفر کرتا ہوں۔''

میرے دماغ میں شدید شکوک وشبہات آچکے تھے۔ ضرور ہیروئن اسمگل کررہا ہے۔ اس کے دستی سامان میں حقے کی پندرہ بیس منقش نالیاں تھیں۔ اب بھلا وہ انھیں ڈھاکہ کیوں لے جارہا ہے؟

''اگر میں کسٹم آفیسر ہوتی،'' فہمیدہ ریاض نے آنکھیں چمکا کر انتہائی خوفناک انداز میں امریکی لڑکے سے کہا تھا، ''تو ان نالیوں کی ضرور تلاشی لیتی۔''

وہ امریکن لڑکے کو ڈرانا چاہتی تھی... بس یونہی۔ ضبط نہ کرسکی۔ سوچا، چھوٹا سا تو ہے، کیوں نہ اسے ڈرایا جائے۔

وہ ڈرا یا نہیں، اس کے چہرے سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اسے بری طرح زکام ہورہا تھا۔ بار بار کھانس بھی رہا تھا۔

فہمیدہ ریاض نے سوچا، لاحول ولاقوۃ، مجھے اس امریکن سے زکام نہ لگ جائے۔ انھیں ڈھاکہ میں زکام ہونے کا خیال نہایت ہی بے موقع لگا۔ وہ اس پر خوش بھی ہوئیں کہ دیکھو! میں امریکن سے چھوت کرنا چاہتی ہوں۔ میں! یعنی ایک کالیا، پاکستانی، ایژین!... اگر ان صاحبہ کو کوئی اکیلا دکیلا امریکن مل جائے تو اس سے بداخلاقی کرکے خوش ہوتی ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک بہترین جملہ ایجاد کرلیا ہے۔ شاید کسی کا تکیۂ کلام کہیں سنا تھا، اور اس پر جی بھر کر ہنس کے اسے یاد کرلیا تھا۔ یہ مختصر سا جملہ تھا، ''نہیں سمجھے؟''

وہ اپنے شکار سے اس طرح بات کرتیں، ''مسٹر رافیل، ہم اپنے ملک میں کتابوں کا فروغ چاہتے ہیں، نہیں سمجھے؟'' ساتھ مایوسی سے گردن بھی ہلاتی تھیں۔ اس طرح ان کا توہین آمیز جملہ تکیۂ کلام سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ اسی سے خوش تھیں!

ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر امریکن لڑکا کسٹمز سے صاف نکل گیا تھا... ان سب سے پہلے۔ سرخ ساڑی میں ایک بنگالن اسے صاف پار کرا لے گئی تھی۔

ضروری اور سرکاری کاغذات کہیں پھینک کر انھوں نے سوٹ کیس میں باقی کا سامان بھر دیا۔ ایک گٹھڑی میں باندھا ڈھاکہ کا پنیر، زیتون کا اچار، اور کھجور کا گڑ۔

جنھوں نے کبھی اس کا ذائقہ چکھا تھا، اس نے ڈوبتے دل سے سوچا، اور یقین کیا کہ وہ اسے نہیں قبولیں گے۔ اس کے لیے ان میں زہر مل چکا ہے۔ اس زہر کی اس نے ایک گٹھڑی باندھ لی ہے، اور اپنے ساتھ لیے جا رہی ہے۔

میں خود اسے بہت دن تک کھاؤں گی، سوچا۔

اس نے پرجاتن ہوٹل کے اس کمرے پر نظر ڈالی۔ اس بستر پر۔ اس بستر پر جہاں وہ دو ہیولوں کے ساتھ لیٹی تھی۔ دونوں اب بھی وہیں لیٹے تھے، جاتی عورت کو دیکھتے۔ وہ ان کے پائینتی کھڑی غور سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

اچھا اب ایسا کرتے ہیں، اس نے سوچا، ایک آسمانی پرات لاتی ہوں۔

وہ آسمانی پرات لائی۔ اس نے دونوں ہیولوں کو پرات میں ڈالا اور تھوڑا سا گرم پانی، اور انھیں گوندھنے میں جٹ گئی۔

کیا تم ان دونوں کو ملا کر ایک بنانا چاہتی ہو؟

ہوسکتا ہے... ہوسکتا ہے بیس بنا دوں...

اس نے تندہی سے گوندھنے کی کوشش جاری رکھی۔

مگر اس کے ہیولے ربڑ کے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل گئے۔

تم رو کیوں رہی ہو؟ مسکراتے ہیولے نے پوچھا۔

میں تمھاری نعرے بازی سے تنگ آ چکی ہوں۔

وہ بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ لیا تھا۔

ہیولا اسے زخمی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا، مگر میں صرف نعرہ ہی تو نہیں...

نہیں، اس نے مان لیا۔ یہ بات وہ جانتی تھی۔

عورت نے رونے کے باعث لال چقندر منھ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہر طرف کس قدر ویرانی تھی اس کی دو آنکھوں میں... اس کی دو آنکھیں، جیسے وہ ایک مردہ سمندر کے کنارے بیٹھے ہوں۔

کتنا ویرانہ ہے، اس نے چپکے سے کہا۔ کیوں؟ اس نے خاموش ہیولے کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

بتاؤ! بولو نا! بولیے، نہیں تو...

وہ پھر بھی خاموش رہا۔

نہیں تو میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں گی۔

اب اس کی نظریں دوسرے کے چہرے سے پھسل گئیں۔ کھڑکی سے باہر دور کسی نیل کوٹھی کی چھت پر۔

خوشبیر جی چلی گئی تھیں۔ شرمیلا ٹیگور اور راکھی بھی ہندوستان واپس جا چکی تھیں۔

اسے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے گاڑی آ گئی۔

استقبالیہ میں کمرے کی چابیاں دینے لگی تو کاؤنٹر پر بیٹھا افسر بہت گرم جوشی سے مسکرایا۔

''مادام، جا رہی ہیں؟ آپ کو اچھا لگا ڈھاکہ؟''

وہ رک کر کھڑی ہو گئی۔ ''اتنی زیادہ غربت ہے۔''

شاید اس کی سرخ آنکھیں اور ناک دیکھ کر ریسپشنسٹ نے اس کی بات کا برا نہ منایا۔ گو پہلے وہ کچھ پریشان ہوا۔ مگر پھر کسی اندرونی جذبے نے اسے مجبور کر دیا، جو اچانک، بغیر کسی اطلاع کے، اس غیر ملکی پاکستانی عورت کے سامنے ابھر کر آ گیا تھا۔ رازداری سے کہنے لگا، ''دیکھیے، میں سرکاری ملازم ہوں، مجھے ایسا کہنا تو نہیں چاہیے، لیکن اس کی ذمے داری ہمارے سیاسی عدم استحکام...''

میں تقریباً بسورتے بسورتے ہنس پڑی۔ سچ تو کہتے ہیں لوگ! رکشا والے سے لے کر بینک منیجر تک ہر بنگالی سیاسی ہے۔ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

استقبالیہ پر اس سے ملنے والے لوگ... ان کے نام اور پتے...

چند دن پہلے وہ یہاں آئی تھی... بنگال کے لیے برسوں پرانا پیار دل میں لے کر۔ اور آج وہ جا رہی

تھی۔قدم جیسے اٹھنے سے انکاری تھے۔وہ پیار کرنے لگی تھی۔ڈھاکہ سے پیار کرنے لگی تھی چند ہی دنوں میں۔استقبالیہ پر بیٹھے اجنبی کا شانہ ہلا کر اس نے کہا،''میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

یہ سچ تھا۔

کیوں؟ آخر کیوں؟ آپ اس برصغیر کے تینوں ٹکڑے دیکھ کر،سب سے مفلوک الحال،غریب ترین حصے میں کیوں رہ جانا چاہتی ہیں؟ جہاں کبھی قحط پڑتا ہے،کبھی سائیکلون آجاتا ہے؛ جہاں مختصر سی فوج آپس میں لڑی مر رہی ہے،اور مارشل لا بھی لگائے جاتی ہے؛ جہاں تشدد پھیلتے سیکنڈ نہیں لگتا؛ جہاں اس پورے برِصغیر میں سب سے زیادہ کرپشن ہے، اور اس لیے اور بھی دل ٹکڑے کر دیتا ہے کہ اس کا شکار برصغیر میں سب سے زیادہ مجبور اور بدحال لوگ ہیں؛ جہاں غریب آدمی سے، ماتحت سے ایسے بات کی جاتی ہے جیسے مجبوراً کوئی گھناؤنا کام کیا جاتا ہو۔

آخر وہ کیوں یہاں رہ جانا چاہتی ہے؟ آخر کیوں؟

استقبالیہ سے اس نے اردو ادیب سے رابطے کی آخری کوشش کی۔کسی معجزے سے وہ اسے فون پر مل گئے۔

''جی ہاں، میں آپ سے نہ مل سکی۔مجھے بہت افسوس ہے۔کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟ اچھا! بنگالی ادیبوں کے ساتھ مل کر ایک بنگالی کا رسالہ نکال رہے ہیں۔کیا؟ اردو ادب کے بارے میں بنگالی رسالہ؟ گریٹ! آپ بہت اچھا کر رہے ہیں۔کیپ اِٹ اَپ بھائی، بہترین کام کر رہے ہیں۔میں تو اب جا رہی ہوں... بس چند منٹ میں۔پھر ملیں گے۔پاکستان آیئے نا!''

زندہ بہار... اس نے سوچا، زندہ بہار...

گاڑی ڈھاکہ کی بستیاں پیچھے چھوڑتی ایئرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔

بنگالی پروفیسر جو اسے ایئرپورٹ لے جانے آئے تھے،اس کے پریشان چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ واقعی یہاں رہ جانا چاہتی ہیں؟'' نوجوان استاد نے آہستہ سے پوچھا۔اس کی نظریں فہمیدہ ریاض کے چہرے پر ایسے جمی تھی جیسے کھوج لگاتی ہوں۔

''ہاں،'' فہمیدہ ریاض نے کہا۔''میں یہاں رہ جانا چاہتی ہوں... یہیں ڈھاکہ میں... زندہ بہار لین میں...''

''یہ ناممکن تو نہیں۔''

وہ خاموش رہی۔صرف دل پر گھونسا سا لگا۔

''لیکن آپ کو اپنا پاسپورٹ بدلنا پڑے گا۔بنگلہ دیش کی شہریت لے لیجیے۔''

وہ زبردستی مسکرائی۔''پاسپورٹ وغیرہ اب کیا بدلیں!'' دل میں کہا، بس جیسی ہوں اب ویسی ہی ہوں... سب کاغذوں سمیت۔''اور پھر... بچے بھی تو ہیں...'' بچے! جیسا میں چاہتی ہوں ویسا ہی وہ تو نہیں چاہیں گے... ''بچوں کی وجہ سے...'' اس نے کہا، اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

'وہ تو بچے ہیں...'' کسی نے کہا، جیسے وہ اس کے ساتھ کار میں نہ بیٹھا تھا۔بہت دور تھا۔''وہ تو بچے ہیں۔بنگالی سیکھ جائیں گے۔''

اس نے دل میں جھانکا... بچوں کو بنگالی سکھانے کی ذرہ بھر خواہش سے بھی عاری دل...

اس کی آنکھیں کسی پرانے منظر سے بھر گئی تھیں۔وہ کسی نیل کوٹھی کی چھت پر کھڑی تھی۔دور گنگا بہہ رہی تھی۔اسی پس منظر میں سرکنڈوں کی جھونپڑی۔پھوس کے چھپر پر ایک چھوٹی سی بچی کھڑی تھی۔اس نے بغل سے چھوٹا سا پرچم نکالا اور کھول کر لہرایا— سبز اور سنہری پرچم۔پھر وہ سرکتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔اس کی طرف دیکھے بغیر... بے خبر۔دور نیل کوٹھی کی چھت پر کھڑی ایک حواس باختہ، اجنبی، غیر ملکی عورت کے دل کی سلامی سے دور...

زندہ بہار لین سے ایک رکشا نکلی اور دوسری گلی میں مڑ گئی۔

''ہاں!'' اس نے چونک کر کہا، ''نہیں!''

پہلے ہی اتنی در بدری ہو چکی ہے۔اس نے عادتاً پھر گھڑی دیکھی۔

اچھا ہی تو ہوا، اس نے سوچا، میں نے اتنے دن گھڑی سیٹ نہ کی۔

گھڑی میں پرانا وقت چل رہا تھا۔

گوداوری

پہاڑی بس اسٹاپ پر اترتے ہی ایک مختصر سیاح خاندان کے چھوٹے بڑے اور بچے بیتابی سے اپنا سامان اٹھا کر اپنی عارضی، چھٹیوں کی قیام گاہ کی جانب دوڑ پڑے۔

زمین نے فوراً ان کے پیر پکڑ لیے۔ یہ میدان نہیں تھا۔ گھنٹوں بس میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے آنکھوں سے گرد و پیش کے تمام مناظر بدلتے دیکھے تھے اور میدانوں کو پہاڑوں میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ لیکن آنکھوں کی اطلاع بے سود تھی؛ ان کی ٹانگوں کو میدان ہی کی عادت تھی۔ اوبڑ کھابڑ پہاڑی راستے پر ذرا سی دیر میں وہ پسینے پسینے ہو گئے، ہانپنے لگے۔ جوتوں کی طرف نظر ڈالی تو پہچانے نہیں جا رہے تھے؛ بالکل سرخ، سرخا سرخ، جیسے پسی ہوئی اینٹ مل دی گئی ہو۔

ناچار بوجھ تلے ہانپتے وہ الٹے قدموں لوٹے۔ بس اڈے سے قلی کیے۔ دھوتیوں کے لنگوٹ کسے دو گہرے سانولے قلی، ان کے چھوٹے بڑے سوٹ کیس، ناشتے دان، تھرمَس اور ٹرانزسٹر ریڈیو سنبھالے، پہاڑی کی پگڈنڈی کی چک پھیریاں چڑھنے لگے۔ پہاڑی کے عین سرے پر ان کی قیام گاہ تھی۔

مہاراشٹر کے مغربی کنارے پر اس پہاڑ کو بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور بمبئی اور سورت کے بوہروں، خوجوں، اسماعیلیوں اور پارسیوں نے بسایا تھا۔ بمبئی کی گرمی سے جب انگریز کا جی اُوبا تو انھوں نے پہلے کھنڈالہ اور پھر اس نسبتاً سستے پہاڑی مقام پر ریل کی پٹریاں بچھا دی تھیں۔ ان پٹریوں پر اب بھی دو انجن والی کھلونا سی ریل گاڑیاں بھاپ چھوڑتی چھک چھک کرتی آتی تھیں۔ یہ کنبہ ریل وقت پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے بس سے آیا تھا۔ تمام راستے انھیں پہاڑ کی گولائیوں میں ریل گھومتی نظر آتی رہی تھی۔ بمبئی سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر، جہاں سے یہاں تک پہنچنے میں انھیں بمشکل چار پانچ گھنٹے لگے تھے، یہ تقریباً غیر پامال علاقہ جیسے مراٹھا لینڈ کے پیٹ میں گھسا لیٹا تھا۔ بس اسٹاپ پر مورنیوں کی سی مراٹھنیں، شوخ کچے رنگوں کے سنہری کناریوں والے کاشٹے رانوں تک لنگوٹ کی طرح کسے، سامان ڈھو رہی تھیں۔

کتنوں کی گود کے بچے ان کے سینوں ، بازوؤں اور پیٹھ سے چمٹے تھے۔ ایک کو مزدوری مل جاتی تو دوسری موٹے موٹے کڑوں سے کہنی تک بھری بانہیں بڑھا کر اس کا بچہ سنبھال لیتی۔ ان کی سانولی پنڈلیاں ریشم کی طرح چکنی تھیں، ان پر بالکل بال نہ تھے۔ (آنے والے گروہ میں جو عورت تھی اس نے اپنی ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی سہیلی سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا تھا، ''کیا ان کی ٹانگوں پر بال ہی نہیں اُگتے ؟'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا، ''اگتے کیوں نہیں!'' اور اسے بتایا تھا، ''اکھاڑتی ہیں دھاگے سے۔'') کسے کسائے سانولے مراٹھے چائے اور پان بیڑی سگریٹ بیچ رہے تھے اور کمپا کولا کی گرم بوتلیں، جو ہر روز بمبئی کے مضافات سے ٹرک ان پہاڑی سلسلوں پر پھینک جاتے تھے۔ مردوں نے بھی دھوتیوں کو لنگوٹ کی طرح مڑھ رکھا تھا۔ ان سب کے بالوں اور بازوؤں اور سینوں پر اس پہاڑ کی سرخ مٹی کی تہہ سی جم رہی تھی، جیسے غازہ لگایا ہو۔

چھٹیاں گذارنے کے لیے آنے والا یہ کنبہ بمبئی کے ایک مسلمان سرمایہ دار کی وِلا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب خوشی سے اچھلتا کودتا جامنوں کے درختوں کے جھنڈ میں کپڑے میں سوئی دھاگے کی طرح گزرتی پگڈنڈیوں پر چڑھ رہا تھا۔ درختوں تلے خود رو جھاڑیوں میں اور لمبی لمبی گھاس میں ننھے منے جنگلی جانور کھٹ پٹ کر رہے تھے۔ ایک گلہری نے تیزی سے دوڑ لگائی۔ اچانک اس قافلے میں شامل نوجوان لڑکی کی مختصر چیخ ابھری اور پھر ایک پُرمسرت قہقہہ۔ اس کے عین سر پر سے ایک سیاہ رُو لنگور نے جامن کے ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر بے حد لمبی دم لہرا کر زقند بھری تھی۔

''ارے لنگور! لنگور!'' ان کے قدم راستے ہی میں گڑ گئے۔ سب منھ اوپر اٹھا اٹھا کر تاکنے لگے۔ گہرے دبیز پتوں کی گھٹی ہوئی جالیوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی کرنوں کے جال میں، بھنوروں کی طرح کالی، رس سے تربتر جامنوں کے گچھوں میں، انھیں بیسیوں ہنستے اور منھ چڑاتے لنگور نظر آئے جو اپنی سفید، مگر پہاڑ کی مٹی سے سرخ پلکیں جھپکاتے، بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے انھیں تاک رہے تھے۔

مراٹھا قلی ہنسا۔

''ہاں اِدھر لنگور بہت ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا صاب۔ چیزیں اٹھا کر لے جاتا ہے اور ... اور پنجہ بھی مار سکتا ہے۔''

مگر بچے لنگوروں کی قربت کے خیال ہی سے خوشی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ عمر کے بے خطر

مقام پر تھے۔ بڑکی جو ابھی سولہ کی نہ ہوئی تھی؛ نیکر میں پیشاب کرکے رونے والا چیکو، اور رُککلی جسے سب شیدیانی کہتے تھے، کیونکہ اس کے بال گھنگھریالے تھے اور چھوٹا تراشنے پر شیدیوں کے بالوں کی طرح گھنڈی دار ہو جاتے تھے۔

اس گروہ کا سربراہ ایک دراز قد تنومند سانولا مرد تھا: 'با'۔ ایک عورت، جسم کے کسی ضروری حصے کی طرح، اس کنبے کے ساتھ لگی تھی۔ گوشت اور خون کے ان پتلوں کو پیدا کرکے اب انھیں پالنے پوسنے کا کام کرتی ہوئی، ان کی حرکتوں پر روتی، ہنستی اور پریشان ہوتی ہوئی۔ یہ 'ما' تھی۔

خوش قطع وِلا کا دروازہ کھلتے ہی ان پر اس کے کشادہ اور آرام دہ ہونے کا خوشگوار انکشاف ہوا۔ جلدی جلدی تمام کمروں کے دروازے کھولتے، بچے دھما چوکڑی مچانے لگے، الگ الگ کمروں پر قبضہ کرنے کے لیے دھینگا مشتی میں مصروف ہو گئے۔ سب سے اچھے منظر پر کھلنے والی کھڑکی جس کمرے میں تھی، وہاں بڑکی نے فوراً اپنا سوٹ کیس جما دیا اور الماری میں سوٹ کیس سے نکال نکال کر کپڑے ٹانگنے لگی جنھیں وہ دلّی سے استری کر کے لائی تھی اور پورے سفر کے دوران گڑگڑا کر ان کی استری نہ ٹوٹنے کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ آنے والے پُرلطف وقت کی قوی امید سے اس کا دل گنگنا رہا تھا۔ بس میں آتے ہوئے، اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس نے راستے میں کئی خوبصورت لڑکے دیکھے تھے۔ جو انھی کی طرح چھٹیاں گذارنے شاید بمبئی سے آئے تھے اور پہاڑ کے سرخ، تنگ، چکر دار راستوں پر گھڑسواری کر رہے تھے۔

قلی جاتے جاتے اس وِلا میں رہنے والی، اس کی دیکھ بھال کی ذمے دار اُشا کو کھانا بنانے کا سامان خرید کر دینے کے لیے ان سے پیسے لے گیا تھا۔ جب تک اُشا مکئی کے تیل میں (جو وہاں وافر مقدار میں دستیاب تھا) پتوں سمیت مولی کی بھجیا، سب طرح کی ملی ہوئی دال اور حیرت انگیز حد تک نرم اور ذائقے دار مراٹھی چپاتیاں پکا کر ان کے لیے لائے، بڑکی نہا دھوکر، جینز اور بلاؤز پہن کر، سورج کی کنکنی دھوپ میں اپنے لمبے سیاہ ریشمی بال سکھا چکی تھی، اور اب اپنا تمتماتا، اشتیاق سے گلابی مکھڑا لیے بس فوراً ان پگڈنڈیوں پر بے نیازانہ چہل قدمی کرنے کے لیے بیتاب تھی جہاں خوبصورت لڑکے گھڑسواری کر رہے تھے۔ وہ اتنی پُرکشش تھی کہ کوئی بھی لڑکا اسے دیکھ کر کم از کم دل ہی دل میں اشتیاق اور حیرت کی سیٹی مارے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ بڑکی بظاہر بے نیازی سے فوراً منھ پھیر لیتی، لیکن خوشی اور اضطراب بیہودگی سے کہاں چھپتا تھا! مارے

خوشی کے بتیسی باہر نکلی رہتی۔ اس کی پوری کھلی، شفاف چمکدار آنکھیں چکر مکر گھومتیں اور میلوں دور کسی ہاتھ پیر سے درست لڑکے کو دیکھ لیتیں۔ ما کی یہ بڑی والی ذہین اور حساس بیٹی پڑھائی پر بالکل توجہ نہ دینے کے باعث ابھی ابھی دسویں میں فیل ہوئی تھی۔ اس کی سپلیمنٹری آئی تھی۔

تب تک با لمبے سفر کی کسلمندی اتارنے کے لیے مٹی کی مہک سے بھرے کمرے میں نرم گدیلے والے دوہرے جہازی بستر پر مدھم، مسکی ہوئی خوشبو والی چادروں سے خود کو ڈھانپ کر ایک نیند لے چکا تھا۔ چیکو کے رونے پر اس کی پیشاب والی نیکر اتار کر ما اسے بجلی کی راڈ سے بالٹی میں پانی گرم کر کے نہلا چکی تھی اور اپنی بڑی باجی کے بےفکرے پن کے براہِ راست ردعمل میں چھ برس کی عمر ہی میں کسی اسکول ہیڈ مسٹریس کی طرح سنجیدہ، غصیلی اور پڑھاکو بن جانے والی ِکِکلی کا ہاتھ منھ دھلا کر اسے نئی پھول دار فراک پہنا چکی تھی۔ اب ما خود نہانے جانے والی تھی کہ اُشا کھانے کی سینی لیے دروازے پر آ پہنچی۔

پانچوں کی نظریں اُس کی جانب اٹھ گئیں۔ کھڑی تھی وہاں گندمی رنگ کی ایک حسینہ! اس نے کام کرنے والے گھاٹنوں یا پہاڑنوں کی طرح کاشٹے کا لنگوٹ نہیں کس رکھا تھا، باقاعدہ ساری پہنے تھی۔ تیس پینتیس کا سن رہا ہوگا۔ پتلی پتلی بھنویں تھیں، بڑی آنکھیں۔ نازک ناک میں البتہ وہ سبک سا مراٹھی طرز کا ترنج نما زیور ڈالے تھی جو اس کے لبوں کو چھو رہا تھا۔

''میں ہوں اُشا،'' اس نے برتن میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''طاہر بھائی کا بمبئی سے فون آیا تھا۔ آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ میں ہی یہاں بنگلے کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔''

''اچھا! اچھ... چھا... ! تو آپ ہیں ... اُشا۔ آیئے آیئے!'' با نے فوراً ریشہ خطمی ہو کر کہا۔ خوشی سے وہ فوری طور پر بے حال بلکہ نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا یہی حال تھا۔ کوئی بھی اور کیسی بھی عورت ہو، وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر بڑکی نے کوفت سے ہونٹ پچکائے، چمکدار، چکر مکر گھومتی آنکھوں سے با کو تاکا۔ ما نے بھی اس کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور گویا انھوں نے مل کر کہا، ''یہ ہو گئے ریشہ خطمی!'' اس پر ما اور بڑکی کی ہنسی چھوٹ گئی، جسے انھوں نے فوراً دبا لیا۔ لیکن با کچھ نہ سمجھا۔ وہ سمجھنے کی حالت میں باقی ہی کہاں رہا تھا! ِکِکلی اور چیکو تیز بھوک میں خوشی کی چیخیں مارتے ہوئے کھانے اور پھلوں پر پل پڑے۔ اُشا تازہ چپاتی ڈالنے کے لیے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر میں جب وہ چنگیر لائی تو ما نے اسے غور سے

دیکھا۔ وہ ایک حسین عورت تھی، اپنے لائے ہوئے سلاد کی ککڑی کی طرح نرم اور لچکیلی، اور اپنی بنائی ہوئی نرم ذائقے دار مراٹھی چپاتی جیسی نمکین۔

کھانے کے بعد بانے فوراً پیشکش کی کہ بچوں کو ما سیر کرانے لے جائے؛ وہ خود وِلا میں کچھ دیر سونا چاہتا ہے۔صبر اور تحمل سے مانے یہ پیشکش مسترد کی، اور چیکو، ککلی اور بڑکی کے بلند آواز مطالبوں کی گونج میں بادلِ ناخواستہ باانھیں سیر کرانے لے گیا۔کھڑکی سے لگی ما دور تک ان کے ہنسنے اور لنگوروں کی چھلانگوں پر ان کی مسرت بھری چیخوں کی آوازیں سنتی رہی جو پہاڑی کی ڈھلانوں میں گونج رہی تھیں۔

اب وِلا میں خاموشی تھی۔ یہاں اب کوئی نہ تھا۔دو عورتیں، جدا جدا اپنے کاموں میں مصروف۔

ما نہائی۔ وِلا کے پرانے ٹائلز لگے غسل خانے میں سیلن تھی اور کائی، جیسے انھیں کسی نے مدت سے صاف نہ کیا ہو۔شاید اس سیزن میں یہ کمرے اور غسل خانے اور الماریاں پہلی بار کھلی تھیں۔ پانی اس کے اداس بدن پر یخ تھا۔ وہ بجلی کی راڈ سے ٹھیک پانی گرم نہ کر پائی تھی اور وقت سے پہلے اسے نکال لیا تھا۔ پھسلتے پیروں سے، ساری لپیٹ کر، ما باہر آئی۔ احاطے میں سہ پہر کی کمزور پڑتی دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے احاطے کی وسعتوں پر نظر ڈالی۔''ارے! یہاں تو ایک جھولا بھی ہے۔'' بچپن کی کوئی امنگ سرک کر اس کے بدن میں سما گئی۔ وہ خوشی سے تیز قدم بڑھاتی جھولے پر جا بیٹھی۔ دائیں طرف دور جامنوں کا جھنڈ تھا جن پر لنگور قلانچیں بھر رہے تھے۔ ما جھولے میں جھولی۔ اس وقت یہاں کوئی نہ تھا، وہ جو دل چاہے کر سکتی تھی۔ مگر انجان بدن نے امنگ بھرے دل کا ساتھ نہیں نبھایا۔لمبی اور اونچی پینگ لینے سے ما کا سر چکرانے لگا۔

جھولے سے اتر کر وہ گھاس کے تختے پر بیٹھ گئی جو خود رو سبز چیتھڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھری تھی۔ سرخ مٹی میں سبزہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ اس نے وِلا پر نظر دوڑائی۔ وِلا سے متصل دو تین آؤٹ ہاؤسز تھے۔ دو میں تالا پڑا تھا۔ ایک کوٹھڑی کھلی تھی جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اُشا اسی کوٹھڑی میں رہتی تھی۔ ولا کے باورچی خانے کو سنبھالنے کے لمبے چوڑے کام سے بچنے کے لیے وہ اپنی کوٹھڑی ہی کے چولہے پر ولا میں ٹھہرنے والے مہمانوں کا کھانا بنا دیتی تھی۔

بال سکھاتی ما ٹہلتی ہوئی اُشا کی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔ جانے کیوں اس نے دروازے پر دستک نہ دی؛ شاید وہ کسی ناخوشگوار خیال کی گرفت میں تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا، صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس کے

ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔ کوٹھڑی کے نیم اجالے میں اُشا نے چولہے کے سامنے بیٹھے ہوئے اسے سر اٹھا کر دیکھا، پھر وہ مسکرا کر کھڑی ہوگئی۔

''آؤ بائی...'' اس نے کہا۔

کوٹھڑی کھولتے ہی ایک لطیف مگر نہایت واضح سگندھ کا بھبکا جیسے ما کے چہرے سے ٹکرا گیا۔ مہک اتنی سرعت سے اس کے نتھنوں میں گھسی اور اتنی غیر متوقع تھی کہ پل بھر کو ما نے جھٹکے سے سر پیچھے کیا، جیسے سچ مچ کسی چھوئی جانے والی شے سے چہرہ بچاتی ہو۔ یہ ایک مسکی ہوئی خوشبو تھی جس میں گرم مسالوں اور باسی پھولوں کے ساتھ مٹی کی دھانس شامل تھی، اور جو شاید اپنی لطافت کے باعث حیرت انگیز طور پر خوشگوار بن گئی تھی۔

کوٹھڑی کے مدھم اجالے میں ما نے قدم بڑھایا۔ یہ کوٹھڑی عمودی لمبان میں بنائی گئی تھی اور بالکل سادہ سی تھی۔ حالانکہ یہ وِلا کا حصہ تھی، لیکن اس کی بناوٹ کسی جھونپڑی کی طرح تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ تین پتھروں کا چولہا بنا دیا گیا تھا (جیسا پورے ہندوستان میں ہزاروں برسوں سے چلا آ رہا ہے) جس کے پاس راکھ بکھری تھی۔ ساتھ برتن بھانڈے دھرے تھے۔ مٹی کے کونڈے میں ہلدی کی گانٹھیں اور لہسن پیاز رکھا تھا۔ بانس جوڑ کر کوٹھڑی میں پارٹیشن سا کھڑا کر دیا گیا تھا جس نے کھانا پکانے کے حصے کو باقی کی کوٹھڑی سے جدا کر دیا تھا۔ اس سے پرے ایک کھاٹ پر اُشا کا بستر بچھا تھا۔ دیوار کے ساتھ اوپر تلے ٹین کے دو تین صندوق تھے جن کے اوپر دیوار کی کیل میں ٹنگا آئینہ تھا اور اس کے بالکل ساتھ سات رنگوں کی دھنک میں رنگی معصوم سی سونڈ والے گنیش جی کی مورتی دیوار پر آویزاں تھی۔

وہ اُشا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی جیسی دو عورتوں میں آپ ہی آپ نکل آتی ہیں۔

''جب مہمان نہیں ہوتے تب میں بیڑیاں بناتی ہوں،'' اس نے ما کو بتایا اور بانسوں کی جالی میں اُڑسا آپٹے کے پتوں کا گٹھا دکھایا۔ اس کے ساتھ بانس کا ایک کھوکھلا تنا دیوار کے سہارے ٹکا تھا۔ اتنا گھیر دار بانس ما نے پہلے کبھی نہ دیکھا۔ (ما نے تو بانس ہی ٹھیک سے اور غور سے سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا... ہمیشہ بانس کو کسی نہ کسی چیز میں لگا ہوا ہی دیکھا تھا جس پر کوئی غور نہیں کرتا۔) ما نے حیرت سے اس ستون جیسے کھوکھلے نباتی عجوبے کو دیکھا جسے برتن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا!

''پانی کمتی ہوتا ہے اِدھر ما،'' اُشا نے کہا۔ ''آج آپ سب نے سنان کیا، ایک دم کھلاس ہوگیا۔ پینے کا

پانی میرے گھڑولے سے لے لینا۔ ٹنکی دن میں ایک بار چلتی ہے۔ ٹنکی چلانے والا سواجی سویرے آئے گا۔''
(تھوڑی دیر بعد، باتوں ہی باتوں میں، ما کو معلوم ہوا، لم ترنگ سواجی صرف سویرے ہی نہیں، رات کو بھی آتا ہے... ٹنکی چلانے نہیں، پہاڑ کی ٹھنڈی رات میں اُشا کے سنگ سونے۔ لیکن جب بنگلے میں مہمان ہوں تو پھر اس کو مشکل پڑتی ہے۔)

اُشا کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس کا شوہر تھا یا نہیں یا کہاں گیا، اس بات کو وہ بالکل گول مال کر گئی۔
''ہاں تھا وہ، الوتے دار بلوتے دار،'' اس نے بیزاری سے کہا۔
''ہاں؟'' ما نے حیرت سے ہونٹ پر انگلی دھر کر پوچھا۔
''ترکھان تھا۔''

پھر ما کو پتہ چلا۔ یہاں 'الوتے دار بلوتے دار' کاریگر کو کہتے ہیں۔ مراٹھی محاورے میں فارسی کی جڑاوٹ سے وہ پہلے کافی چکرائی۔ پولیس والوں کو 'معاملت دار' کہتے تھے، زمینداروں کو 'کھاتے دار'۔ لیکن مراٹھے تو اپنے بادشاہ کو بھی پیشوا کہتے تھے۔ وہ دل میں ہنسی۔ تاریخ داں اس بات پر حیران تھے۔ مغلوں سے جتنا لڑتے تھے، اتنی ہی فارسی بولتے، گویا جل جل کر۔

(بعد میں کسی نے اسے بتایا، برسوں پہلے اُشا کا آدمی چلا گیا تھا... بمبئی، فلم ایکٹر بننے۔ کسی نے اس سے کہا تھا، وہ بہت سندر ہے، ہیرو بن جائے گا۔ پھر اس کی کوئی خبر ہی نہ آئی۔)

اُشا پڑھی لکھی نہ تھی، لیکن پھر بھی پہاڑ پر بوجھا ڈھوتی پہاڑنوں سے زیادہ مہذب معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے ما کو بتایا کہ وہ طاہر بھائی کے ساتھ کئی بار بمبئی ہو آئی ہے۔ کچھ مہینے تک اس نے بمبئی میں طاہر بھائی کی فیملی کی خدمت گذاری بھی کی ہے۔ وہ باپ کی وجہ سے واپس آ گئی جو ابھی زندہ ہے اور نیچے کہیں ترائی میں رہتا ہے۔ بمبئی میں طاہر بھائی کا شاندار بنگلہ تھا۔ ان کا عطر کا کاروبار تھا۔ ما اور با کی طاہر بھائی سے ملاقات دراصل طیب بھائی کے ذریعے ہوئی تھی۔

ما اور با اسّی کی دہائی میں کسی بھینکر سنکٹ میں پڑ کر پڑوسی ملک پاکستان سے بھٹکتے اِدھر آ نکلے تھے۔ وہ دلّی میں رہ پڑے تھے۔ یہ دو سیاسی جیوڑے تھے۔ رفتہ رفتہ یہاں ان کے ہم خیال دوستوں کا وسیع حلقہ بن گیا تھا۔ ان میں کتنے ہی کمیونسٹ تھے۔ طیب بھائی ایک جید عالم اور سیاسی کارکن تھے۔ وہ ہندو مسلم فرقہ واریت کے خلاف تقریباً کل وقتی تحریک چلاتے تھے۔ اب سوئے اتفاق دیکھیے کہ ان کا تعلق اُدے

پور میں گڑھ رکھنے والے ایک چھوٹے سے مسلمانوں کے فرقے سے تھا۔ کسی جن کی طرح وقت نکال کروہ اس فرقے کے پیشوا کے ظلم وستم کے خلاف ایک اصلاحی تحریک بھی چلاتے رہتے۔ ان کے زیادہ تر دوست اس حرکت سے عاجز رہتے۔ روشن خیال مسلمانوں کا، اور ہندوؤں کا بھی، خیال یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے، رائی جتنے فرقے کو کیوں چھیڑا جائے۔ بھئی، کرنے دو جوان کا دل چاہتا ہے۔

''طیب بھائی،'' ما پیار سے کہتی۔ ''آپ کا بنیادی کام اتنا اہم ہے۔ آخر کیوں آپ اپنے فرقے کی اصلاح کے پیچھے پڑے ہیں؟ خواہ مخواہ اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں۔''

طیب بھائی کے سینکڑوں ہندو مسلمان سکھ پرستار ایسا ہی کہتے۔ کسی کو بھی اس فرقے کی اصلاح سے دلچسپی نہیں تھی۔

بچوں کی سی معصوم شکل والے طیب بھائی کھچڑی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے، گول مٹول چہرے کو دائیں بائیں گھماتے، عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے بڑی بڑی سیاہ گجراتی آنکھیں اور بھی پھیلا کر کہتے:

''یہ لیجیے، اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی! یہ تو سب سے اہم مشن ہے۔ اس فرقے کی اصلاح تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔''

سب لوگ اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے۔

طاہر بھائی عطر والے اس اصلاحی تحریک کے حمایتی تھے۔ تگڑا ٹیکس وصول کرتے تھے اس فرقے کے پیشوا، اور جو نہ دے سو برادری باہر۔ سنا ہے قبرستان میں دفن ہونے کی جگہ بھی نہ دیتے تھے۔ (سارے چھوٹے فرقوں کی طرح ان کے فرقے کا بھی علیحدہ قبرستان تھا۔)

''ارے تو لعنت بھیجیے،'' لوگ کہتے، ''عام قبرستان میں دفن ہو جایئے۔'' (لوگوں کا مطلب ہوتا تھا کہ اپنے مُردوں کو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیں۔)

وہ بے بسی سے منھ دیکھتے۔ ''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں، یہ تو ایسا ہے کہ گویا... اب کوئی مسلمان اپنے مولوی جی سے ناخوش ہو تو آپ کہہ دیں: تو بھئی سیدھے سادھے چِتا کیوں نہیں جلا لیتے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظلم کیوں برداشت کریں۔''

اصل بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی اس فرقے کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا جو راجپوتانہ سے کسی سامری عمل

سے گجرات تک جا پہنچا تھا۔ طیب بھائی کے چکر میں کتنے ہی عام مسلمانوں نے اس کے موجودہ پیشوا کی ظلم کی داستانیں صبر اور تحمل سے سنی تھیں اور تاسف سے ''چہ چہ!'' کہا تھا۔ کس طرح وہ دین کے بنیادی مثالی اصولوں سے بھٹک کر گمراہ ہو رہے ہیں۔ طیب بھائی کے منھ پر کون کہتا کہ عام مسلمان اس فرقے ہی کو صریحاً خواہ مخواہ سمجھتے ہیں۔

''کیا ضرورت تھی بھئی!'' وہ چپکے چپکے آپ میں کہتے۔ ''ختم کریں یہ احمقانہ پاکٹس۔ اصل مقابلہ کفار سے ہے۔ اب سب کے سامنے اپنے گندے کپڑے دھونا! لاحول ولا...''

مگر طیب بھائی سے کوئی کیا کہتا! طیب بھائی نمازی تھے پنج وقتہ (اپنے فرقے کے مطابق ادا کرتے تھے) اور مسلم نشاۃِ ثانیہ کے لیے رات دن ایسے جی توڑ کر محنت کرتے تھے کہ عام مسلمان دیکھنے سے اپنی کم مایگی اور کم عملی پر شرمندہ ہی ہو سکتے تھے۔

طاہر بھائی کا ذکر سن کر اُشا سے باتیں کرتے کرتے، یہ سارے خیال ما کے ذہن سے آہستہ رفتار لہروں کی طرح گزرے۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اٹھتے اٹھتے ما سے رہا نہ گیا۔ وہ ایک تردد میں مبتلا تھی۔ با کے ریشہ خطمی ہونے سے اس انجان پہاڑی مقام پر کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے خود کو اور اپنے پورے کنبے کو (بشمول با) بچانا چاہتی تھی۔ اس تردد کے ہاتھوں ہار کر اس نے اُشا سے کہا:

''بچوں کے با ذرا ...ریشہ خطمی ہیں۔''

اُشا نے اسے سادگی سے دیکھا، پھر اس کی نگاہیں گہری ہوگئیں۔ اس نے غور کیا کہ ما کے لہجے میں غصہ یا جلن نہیں تھی... بس ایک گہری اور طویل تھکن!

وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر کالی لمبی پلکیں جھپکائے بِنا، اس نے ما سے عجب بے خوفی سے کہا:

''مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے بائی۔ مرد کتا ہے! آپ کیوں پھکر کرتی ہے؟ مرد لوگ اِدھر اُدھر ڈبکی لگا لیتا ہے۔ اس کا کچھ گھِس تو نہیں جاتا۔ اور نہ عورت کا کچھ گھِس جاتا ہے۔ دونوں جیسے کے تیسے رہتے ہیں۔''

''نہیں، میں فکر نہیں کرتی،'' ما نے کچھ بددلی سے ہنس کر کہا۔ ''مگر... میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔''

''ضرورت نہیں تھی،'' اُشا نے کہا۔ ''میں کیا آدمی کی آنکھ نہیں پہچانتی؟ مگر... آپ پھکر نہ کرو۔''

ما اس سے رخصت ہونے لگی۔ کھلے دروازے میں اس نے مڑ کر کہا، ''اچھا، میں چلتی ہوں۔'' لیکن

اس کا دھیان ہٹ گیا۔ سورج اب دروازے کے عین سامنے آ گیا تھا۔ کھلے دروازے سے داخل ہونے والی لمبی ترچھی کرنوں نے کوٹھڑی کی دیوار روشن کردی تھی۔ ما کی نظریں دیوار پر جم کر رہ گئیں جہاں قطار میں اَن گنت نقش ونگار بنے تھے۔ انتہائی عجیب وغریب، مستطیل اور مثلث چھ پتوں والے پھول جن کا زرِگل کا حصہ اتنا چوڑا تھا کہ پھول سورج معلوم ہو رہا تھا، کئی قسم کے ہلال، یا شاید وہ خم کھائے ہوئے سینگ ہوں... مچھلی، مچھلی کے کانٹے جیسا ہک جو ہندی کی 'ٹ' سے مشابہ تھا... ما اچانک حیرت کے ریلے میں انھیں دیکھتی رہ گئی۔

''یہ کیا ہیں؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

اُشا ہنسی۔ ''دیوی دیوتا ہیں ما۔''

کسی اسپاٹ لائٹ کی مانند گھستی سورج کی شعاعوں میں ما حیرت سے تکتی رہ گئی۔ اسے مور کا پنکھ نظر آیا۔ اسے جو نظر آیا وہ ہو بہو آم جیسا تھا۔ آم! آم دیوتا ہے! لنگڑا ہوگا کہ سندوری؟ اس کے دل نے ہنس کر سوچا: آم میٹھا ہوتا ہے۔ میٹھا ہی تو نہیں، خوشبو بھی تو غضب کی۔ مرزا غالب کو پسند تھا آم۔ اس کا دیوتا بن جانا کیا برا تھا۔ شاید آم لوگوں کا پیٹ بھرتا ہو، اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا، مہاراشٹر کا آم جہازی سائز کا ہوتا ہے... ایک آم دو جنوں کی ایک وقت کی خوراک کے لیے کافی۔ اتنا سرخ کہ سیاہ لگتا تھا۔ سیاہ آم، الفانسو! دلّی میں تو پچاس روپے کا ایک ملتا ہے۔ اس کے دل نے آم کو پرنام کیا۔ ایک ہنسی بھرا پرنام۔

''میٹھے ہوں اور بہت ہوں،'' ما نے دل ہی دل میں کہا، اور بمبئی کا سوچا جہاں میرٹھ کا باسی فلم ایکٹر بھارت بھوشن مرزا غالب کا سوانگ رچاتا تھا اور بہت حسین غالب نظر آتا تھا۔ (ما میرٹھ کی تھی۔)

پھیکے گیرو سے بنے ان نقوش کو مسحور ہو کر دیکھتی جنھیں سہ پہر کی روشنی نے کوٹھڑی میں گھس کر اچانک دمکا دیا تھا، آخر وہ اُشا کو اس کی دہلیز سے قدم پیچھے ہٹانے یا دوبارہ اندر آنے کا منتظر دیکھ کر کچھ شرمندہ ہوگئی اور واپس جانے کو مڑی۔ میں انھیں پھر کبھی آ کر تفصیلاً دیکھوں گی، اس نے سوچا۔ جاتے جاتے اُشا نے دھیرے سے کہا، ''رات کو ورانڈے کی پرلی والی بتی دس بجے تک گل کر دینا بائی۔ نہیں تو... سوا جی سردی میں کھڑا رہے گا۔''

ما مسکرا کر ''اچھا'' کہتی ہوئی اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ مسکرا تو وہ دی تھی لیکن اب اسے اور فکر لگ گئی۔ با کی کہیں پٹائی نہ ہو جائے۔ وہ کمرے میں بستر پر بیٹھی کچھ دیر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے سوچتی رہی۔

پھر اسے خیال آیا۔ چیکو کے نہانے کا پانی ٹھیک سے گرم نہیں ہوا تھا۔ چیکو کو کہیں زکام نہ ہو جائے۔ بڑکی کی نظر کسی لڑکے پر نہ جا پڑے۔ یہ بات بھی یقینی تھی اور خاصی کوفت کا باعث۔ اور ککلی؟ بس ککلی ہی تو ٹھیک تھی۔ چھٹیوں تک میں ہوم ورک کرنے کے لیے بستہ ساتھ لائی تھی۔ اس کی ننھی ہیڈ ماسٹر یانی! اسے کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالنے والی اس کی چھوٹی سی شیدیانی! دل ہی دل میں ککلی کو پیار کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ سفر سے تھکی ہوئی ما فوراً نیند میں ڈوب گئی۔ بستر اس کے لیے جیسے ایک جزیرہ تھا۔ باہر سہ پہر کی تیز پہاڑی ہوا میں جامنوں کے پتے اور سرخ غبار اڑ رہا تھا۔ ما کے سپنے میں سواجی ٹنکی والا با کے پیچھے کوئی خطرناک ہتھیار اٹھائے دوڑ رہا تھا۔

رات پڑ چکی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔

وِلا کے گول کمرے سے اس کے کنبے کی باتوں اور ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت یہ لوگ واپس آ گئے تھے۔

ما نے دروازہ کھولا اور ورانڈے میں قدم رکھا۔

جیسے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جائے! اس کے چاروں طرف آتش بازی سی چھوٹ رہی تھی۔ جہاں تک نظر دیکھ سکتی تھی، گہرے اودے اندھیرے میں دور دور تک جگنوؤں کے جمگھٹ اڑ رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ ان سے ایک غیر ارضی قسم کی سبز روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دور دور تک پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ جگنوؤں کے دَل کے دَل! سینکڑوں، ہزاروں، سوئی کی نوک جیسی باریک، چمکتی روشنیاں، ہر طرف اڑتی ہوئی!

آنکھیں پھاڑے ما دیکھ رہی تھی۔ پہاڑ پر اتنے جگنو کہاں ہوتے ہیں! یہاں کے گرم مرطوب موسم کی وجہ سے ہو گئے۔ اتنے جگنو! اور ان کا یہ رنگ! یہ سبز کیوں ہے؟ پتوں کا عکس کیا؟ یا پتے کھا کھا کر ایسے ہو گئے؟ ما کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر اس منظر کا تحیر خیز حسن دیکھ رہی تھی جس نے اسے پل بھر کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔ جب ہوش آیا تو تیزی سے پلٹ کر اس نے گول کمرے کی کھڑکی پہ ہاتھ مارا اور چلّائی: ''جگنو۔''

دروازہ بھڑاک سے کھول کر سب لوگ باہر دوڑے آئے۔ پل بھر کو حیرت کی مورت بنے فطرت کے

اس عجوبے کو دیکھا کیے۔ رات ری نے جادو کی کوئی چھڑی چھو کر پورے منظر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا!

پھر وہ کلکاریاں مارتے، تالیاں بجاتے، احاطے کے میدان میں پھیل گئے، جیسے جگنوؤں کی بارش میں نہاتے ہوں۔ وہ دور دور تک جگنوؤں کے پیچھے دوڑنے لگے۔ جگنو ان کے بالوں میں الجھ رہے تھے، ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور بانہوں پر چپک رہے تھے۔ بچوں کے ہنگامے سے جامنوں کے خاموش، برگزیدہ، موٹے ٹہنوں میں سوئے ہوئے لنگوروں کی نیند ٹوٹ گئی۔ لنگور ہڑبڑانے اور چڑچڑ کرنے لگے۔ لنگوروں سے ڈر کر بچے واپس دوڑے، اپنے کپڑوں اور بالوں میں جگنوؤں کی افشاں سے چُنے ہوئے۔

کوٹھری کے دروازے سے لگی اُشا جھانک رہی تھی، ہنس رہی تھی۔ ''اندر جاؤ اندر... لنگور کاٹ لے گا۔''

وہ سب جلدی سے گول کمرے میں گھس گئے۔ بجلی کی کمزور روشنی میں آتے ہی جگنوؤں کی چمک ناپید ہوگئی۔ اب تو وہ بس بھورے بھورے کیڑے تھے۔ سب سے زیادہ جگنو بڑکی کی بانہوں اور گردن پر چمٹے تھے۔ سب سے زیادہ اونچی چھلانگیں وہی لگا رہی تھی، لمبی بانہیں چاروں طرف لہراتی۔ اب جگنو اس کی قمیص میں گھسے پھرپھرا رہے تھے۔

اوں! آ! اوہ! تھت تھت تھت... '' بڑکی بلبلا کر گیند کی طرح اچھلنے اور اپنے بدن پر تابڑ توڑ ہاتھ مارنے لگی۔ ما نے اچھلتی لڑکی کو غور سے دیکھا۔

''یہ کیا حرکتیں کر رہی ہو؟'' ما نے بڑکی کو ڈانٹا۔ کون کہے گا یہ سولھویں میں لگی ہے! اس نے دل ہی دل میں متھے پر ہاتھ مارا۔

''جاؤ، باتھ روم میں جا کر کپڑے جھاڑو۔'' اس نے بڑکی کو حکم دیا اور خود ککلی اور چیکو کے کپڑے اتار کر جھاڑنے لے چلی۔ پھر اس نے آواز دی، ''با۔''

با ابھی تک ورانڈے میں کھڑا جگنوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اُشا کی کوٹھری کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ما کو یاد آیا۔ ارے ورانڈے کی بتی! پرلی والی بتی کہا تھا نا اُشا نے؟ کھڑکی سے جھانک کر اس نے اطمینان کر لیا۔ بتی کسی نے جلائی ہی نہیں تھی جو بجھائی جاتی۔

یونہی ڈبکی لگا لیتے ہیں، کچھ گھس تھوڑا ہی جاتا ہے... ما نے یاد کیا۔ ایک عورت کے منہ سے یہ بات سن کر اس کی اندر کی آتما ہنس دی تھی۔ اس جملے کی پھکڑ ذومعنویت بھی پی گئی تھی۔ اُشا کی روح نہیں ہے کیا؟ ما نے سوچا۔

روح اور بدن کی یکجائی کے چکر میں نہیں پڑتی کیا وہ؟ جس میں خود اس نے ساری عمر بِتا دی... یا گنوادی؟ اس زمین کے پراچین کالوں کا کہیں پڑھا خیال اس کے دماغ میں گونجا: ''شے میں جو کچھ نہ گھٹتا ہے، نہ بڑھتا ہے، نہ متغیر ہوتا ہے، سدا پُرسکون اور شانت، وہ ذی روح ہے۔ جو کچھ بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، جنم لیتا اور جنم دیتا ہے، وہ ذی روح نہیں۔ وہ سوچ نہیں سکتا۔'' وہ دل میں ہنسی۔ مجھ میں مادّہ نہیں ہے کیا، جو سوچ نہ سکے؟ بس یونہی بِنا سوچے، ماس کا لطف لے سکے، اور دے سکے؟ ہوگا تو ضرور... اس نے سوچا، کہیں روح کے مساموں میں پھنسا ہوا... کوئی گہرا اداس اندھیرا اس کے اندر ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تب ہی چیکو رویا۔ ما اپنی سوچوں کے سفر سے واپس لوٹ آئی۔

سہ پہر کی بے وقت نیند لے کر اس کا دماغ الجھا الجھا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے اُشا کی بات ٹھیک سے سمجھنے کی دوبارہ کوشش کی۔ اسے اُشا کی پُرسکون مسکراتی آنکھیں یاد آئیں۔ ''مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے،'' اور، ''تم فکر مت کرو۔'' کیا مطلب تھا اس کا؟ ایک مطلب تو یہ ہوسکتا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم فکر نہ کرو۔ اور دوسرا مطلب... دوسرا مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے، تم فکر مت کرو۔

اچھی خاصی سمجھ رکھنے والی ما ان جملوں کو آگے پیچھے کر کر کے اُشا کی بات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہی، پھر اسے اپنی حماقت پر زور کی ہنسی آئی۔ بچے کپڑے پہنتے پہنتے ما کی طرف منھ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کیوں ہنس رہی ہے؟ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بنا کچھ سمجھے ہنسنے لگے، آپ ہی آپ۔ ما نے انھیں بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ دونوں کو ان کے کمرے میں جدا جدا بستروں پر لٹا دیا۔ ساتھ سونے سے لڑتے تھے دونوں۔ ایک دوسرے کا تکیہ گھسیٹ لیتے تھے۔

رات دیر گئے... سب اپنے کمروں میں۔ برسوں پرانی بنی ولا میں بند کمروں کی مسکی خوشبو میں تیرتے، ڈھیلی پڑی اسپرنگوں والے گدوں پر، موہوم سے فنائل کی مہک والی رضائیوں میں ایک دیوقامت ڈبل بیڈ پر ما، با کے ساتھ۔

خاموشی۔

''کہاں گئے تھے؟''

اس نے با کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''بازار۔''

انھوں نے بتی بجھا دی تھی۔ دو جگنو بچوں کے کپڑوں سے نکل کر بھٹک کر کھڑکی کی گگر تک آ گئے تھے۔ دو سبز جگنو دیر تک جھلملاتے رہے۔ ما انھیں دیکھ رہی تھی۔ ما کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دیر تک جاگی۔ دیر تک جگنو جھلملاتے ہوئے پورے کمرے میں گھومتے رہے۔

ایک دم اُجالا۔ جیسے سورج پہاڑ کے پیچھے چھپا، بے چین اور منتظر بیٹھا تھا اور چھلانگ مار کر نکل آیا تھا۔ رات ما کی نہ جانے کب آنکھ لگی تھی اور کب وہ پھر جاگ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سوئی ہی نہ ہو۔ با ابھی تک پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ بچوں کے کمروں میں بھی خاموشی تھی۔ ما جلدی سے ساری لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

باہر خوب اجالا پھیل چکا تھا۔ اُشا وِلا کے کچن میں کھٹر پٹر کر رہی تھی جہاں شہر سے لوٹ کر بڑکی اور با نے ساتھ لایا ہوا سارا سامان پھیلا دیا تھا: سبزیاں، پکانے کا تیل، مرچ مسالے، رسوئی کا سارا بکھیڑا۔ اُشا انھیں سنگوار رہی تھی۔

''چلو نیچے چلتے ہیں۔'' ما اسے اصرار سے اپنے ساتھ نیچے لے چلی۔ ''ان کے جاگنے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔''

اب وہ لنگوروں سے اتنی گھبرا نہیں رہی تھی، جیسے سمجھ گئی ہو، انھیں نہ چھیڑو تو یہ کچھ نہیں کہیں گے۔ جامنوں کی شاخوں کا، تنوں کا سہارا لیتی، تقریباً پھسلتی، وہ آسانی سے تیزی سے پہاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ نیچے تو سب دنیا جاگ پڑی تھی۔ پہاڑی کی گھڑسواری کے قابل سڑکیں آباد ہو گئی تھیں۔ نیچے ہی بس کا اڈا تھا۔ ایک تھڑے سے ما اور اُشا نے صبح کا پہلا پہلا چائے کا گرم پیالہ پیا۔ چائے اتنی میٹھی تھی کہ ما کے ہونٹ چپک گئے۔ ''بہت سستی ہے شکر یہاں،'' اُشا نے کہا۔ یہ گنوں کا علاقہ تھا۔ ترائی میں میلوں تک گنے کے فارم تھے۔ ''میرے چھوٹے ہوتے تو،'' اُشا نے کہا، ''گڑ کی بھیلی بھی نہیں ملتی تھی۔''

ما نے کتنے ہی سیاحوں سے دعا سلام کر لی۔ زیادہ تر چھوٹے اسٹیشن سے آئے تھے، اور کچھ بمبئی سے۔

ما کو تعجب بھری ہنسی آئی جب اسے لگا، الوتے دار بلوتے دار بھلے ہی فارسی کی کوئی بگڑی ہوئی ترکیب ہو، پھر بھی اس مراٹھی پہاڑی اسٹیشن پر ہر پوری عمر کے مرد کا نام سوا.جی ہی تھا۔ مراٹھی ماؤں کو دوسرا کوئی نام نہیں سوجھتا!

ٹنکی والا سوا.جی، گھوڑوں والا سوا.جی اور چائے کی دکان والا سوا.جی، حالانکہ گھنے جنگلوں میں گھسی اس

پہاڑی پر سواجی مرہٹے کے گھوڑوں کے سم نہ پڑے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے تک یہاں سورن ہندو تہذیب بھی نہ پہنچی تھی۔ جو کچھ لوگوں سے باتیں کر کے اس کے پلے پڑا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے یہاں آدی واسی رہتے تھے، ہندوستان کے قدیم انسان، جنھیں مار بھگا کر انگریزوں اور شہری لوگوں نے سو ڈیڑھ سو برس پہلے یہ تفریحی مقام آباد کر لیا تھا۔

جب وہ پہاڑ پر ملنے والے اصلی مرغی کے اصلی انڈوں کا اور توے پر سکی ڈبل روٹی کا اور اصل دودھ کا ناشتہ کر چکے تھے تب ما کو پتہ چلا، جو کچھ نہ ہونا تھا سب ہو چکا تھا۔ (ما کو پہلے ہی پتہ تھا۔)

چیکو کوز کام تو نہیں ہوا تھا مگر اس کی ران پر کسی کیڑے نے کاٹ کھایا تھا۔ کاٹے کا نشان سرخ سرخ دَدوڑا بن کر پھیلتا جا رہا تھا۔ کسی زہریلے کیڑے کے خیال سے ما کا دل سہم گیا۔ ہائے میری ماں! اب یہاں ڈاکٹر کہاں ہوگا۔

با بھی سہم گیا۔ ''ہے ڈاکٹر، اسٹیشن کے پاس۔ ڈاک خانے کے پیچھے... فزیشن کی ڈسپنسری ہے۔''

با منھ ہاتھ دھوئے بنا، چیکو کو کندھے پر لاد کر، ڈھلان پر جما جما کر قدم دھرتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا، دو پہاڑیاں پار بازار کی سمت چل دیا۔ سمجھدار چیکو نے دونوں بانہیں با کی گردن میں ڈال کر مضبوطی سے جما دیا تھا۔ جامن کی ٹہنیوں پر لنگور چڑچڑائے اور سرعت سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر منتقل ہونے لگے۔

بڑکی کی نظر لڑکے پر پڑ گئی تھی۔ منھ سے ڈبل روٹی کے ذرے جھاڑ کر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے، ہنستی چمکدار آنکھیں میچ کر اس نے ما کی گود میں سر رکھ دیا۔

''رمیش نام ہے اس کا... رمیش سنگھ۔ ما، اس قدر اسمیشنگ ہے کہ کیا بتاؤں! بی کام میں پڑھ رہا ہے۔ انگریزی ذرا کمزور ہے۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ آیا ہے۔ اور تیسری پہاڑی پر ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ رائیڈنگ کرتا ہے۔ گھوڑا اپنا ہے۔ اس کا اپنا۔ وہ ہر سال یہاں آتے ہیں اس لیے گھوڑا خرید لیا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''کہاں مل گیا تجھے؟'' ما نے اُترے منھ سے پوچھا۔

''میں نے تو کل ہی دیکھ لیا تھا،'' بڑکی نے جھٹ سے کہا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ رومانی لہجے کے بجائے وہ بالکل سمجھداری سے مستعد اور ہنرمند لڑکی کی طرح باتیں کرنے لگی۔ ''وہی جو سفید گھوڑے پر تھا۔ آپ نے نہیں دیکھا تھا؟ بس کی کھڑکی سے؟''

ما نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ما کو کچھ نظر ہی کہاں آتا تھا۔ مسکراہٹ ضبط کرتی وہ بڑکی کو تکتی رہی جو اس

کی گود میں پڑی تھی۔

''با کی نظریں بچا کر تو نے اتنی ساری باتیں اس لڑکے سے کیونکر کر لیں؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''گوشت کی دکان میں گئے تھے با!'' بڑکی کی بتیسی پھر باہر آ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں اور شدید رومانی ہو گئی۔ کچھ روتی اور کچھ ہنستی ما نے بڑکی کا سر سہلایا۔ ''تو پھر؟''

''پھر کیا؟'' بڑکی جھٹ پٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولی، ''نو ہینکی پینکی!''

''وعدہ؟'' ما نے کہا۔

''ہنڈریڈ پرسنٹ،'' بڑکی نے فوراً ما کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔

''دیکھو بڑکی!'' ما نے کہا، ''اگر تم رائیڈنگ پر جاتے ہو اور یہ رمیش لڑکا بھی جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تم سب، یعنی چیکو، کِکلی اور تم اور با۔''

بڑکی کا منھ اتر گیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

''اور تو اپنی کتابیں تو لائی ہے نا؟ زولوجی اور میتھس، جن میں زیرو انڈا ملا ہے؟ روز دو گھنٹے ضرور پڑھنا ہے۔''

''لائی ہوں،'' بڑکی نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگی۔

''رمیش کی انگریزی... کمزور ہے اس کی انگریزی۔ میں اسے پڑھا نہ دیا کروں؟ ہر روز دو گھنٹے؟'' اس نے بہت فکر مند منھ بنا کر پوچھا۔

''نہیں!'' قطعیت سے ما نے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بڑکی کی آنکھوں کے نیچے، انگلیاں نچا کر کہا:

''یہ دیکھتی ہے یہ کیا ہے؟ میرے ناخن، کیا ہے ان میں؟''

''کیا ہے؟'' بڑکی نے آنکھیں پھاڑیں۔ وہ بور ہو گئی تھی۔

''تیری چالیں! میرے ناخنوں میں ہیں یہ چالبازیاں تیری۔ دو گھنٹے تک تم خود پڑھو گی۔ کیا سمجھیں؟'' اس نے مصنوعی غصے سے بڑکی کو ڈانٹا۔ بڑکی سہم گئی۔

کِکلی نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ اسے نہ آنا چاہیے تھا، مگر آ گئی تھی۔ اس نے ما کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ وہ ما کے پیچھے چپ چاپ چلتی آئی اور اپنے حصے میں آئی الماری ٹٹولنے لگی۔

ما کرسی پر بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

با ابھی تک نہیں آیا۔ چیکو کی دوا ملی کہ نہیں! بڑکی کو پڑھائی کے لیے وہ یونہی یاد نہ دلاتی تھی۔ چھٹیوں کے فوراً بعد امتحان ہیں۔ اس تندرست لڑکی کو جیسے کسی وِھیل چیئر پر بٹھا کر دھکا لگا کر دسویں سے نکالنا تھا۔ با کو اُشا کے ساتھ متھا مارنے سے کسی نہ کسی طرح روکنا تھا۔ پھر اس کی نظر رِنکلی پر پڑی۔

سانولی ننھی شیدیانی، پوری سنجیدگی سے، اپنے چھوٹے سے وجود کی ساری توجہ مجتمع کیے، کاپی پر جھکی ہوم ورک کر رہی تھی۔

خوشی اور تشکر سے ما کی آنکھ میں پانی آ گیا۔ رِنکلی! تُو ہی تو ہے نا ایک، مجھے کبھی نہ ستانے والی!'' رِنکلی کی توجہ نہ توڑنے کی خاطر ما نے دل ہی دل میں اسے پیار کیا۔

منگل کے دن (ما کو پتہ چلا) پہاڑ کے کھلے، آسمان تلے پھیلے بازار میں ترائی سے آنے والے دیہاتیوں کا میلہ لگتا تھا۔ زمین پر کپڑا بچھا کر انھوں نے اپنے منکوں کے ہار اور کنگھیاں، کھڈی پر بنے کمبل، لاکھ کے بنے ٹکلیوں دار زیور، جن پر چاندی اور دوسری دھاتوں کی پتریاں چڑھائی گئی تھیں، اور چھوٹے بڑے دیوی دیوتاؤں کی لکڑی پتھر اور مٹی کی مورتیاں سجا رکھی تھیں۔ ڈھلانوں سے اترتی اور پہاڑی کے پیچ وخم کے ساتھ گھومتی ان گنت زمینی دکانیں، جو جیسے کسی جادو سے موجود ہو گئی تھیں، اور کسی جادو سے جنھیں دوسرے دن غائب ہو جانا تھا۔ بھاکری دال موٹھ کے خوانچے، چائے کے ٹھیلے۔ دکاندار چوڑے پلس کے پتوں کا پھرتی سے دونا بناتا اور چائے بھر بھر کر بانٹتا جاتا۔ پتوں کے دونے سے (جس میں پن کی طرح کانٹا چبھو دیتا تھا) ایک قطرہ چائے بھی تو زمین پر نہ گرتی تھی! رِنکلی اور بڑکی خوشی سے اچھلیں۔ انھوں نے پتے موڑ موڑ کر دونے بنانے کی مشق شروع کر دی۔

با میلے میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ہر چیز خریدنے پر آمادہ، وہ کئی طرح کے ننھے منے راکھدان جمع کر رہا تھا۔ چیزیں جمع کر کے وہ ان کے پاس تنکوں کی ٹوکری میں رکھوا جاتا۔

ما نے ترائی سے نمودار ہونے والے دکانداروں کو غور سے دیکھا۔ ان دیہاتیوں کے چہرے اسے عام مراٹھوں سے کچھ مختلف لگے۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں خفیف سی ابھری ہوئی تھیں اور جلد کا رنگ مراٹھوں کی طرح گہرا سانولا نہیں، گندم گوں تھا۔ وہ گاہکوں سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کر رہے تھے۔

کوئی کوئی تو انگریزی کے ایک دو لفظ بھی بول دیتا۔ یہ دلی میں جن پتھ پر بھیڑ لگانے والے نیپالیوں کی طرح راک موسیقی کے گائیکوں جیسے ماڈرن تو نہیں تھے لیکن شہریوں سے بات چیت کرنے میں کافی منجھے ہوئے لگ رہے تھے۔

''تم ہندی جانتے ہو؟'' ما نے ایک نوجوان سے پوچھا جس نے پھول دار بش شرٹ اور ایک پھٹی پرانی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے تیل لگے بالوں کے پٹھے کانوں سے نیچے تک آ رہے تھے۔ دکاندار مسکرایا، ''تھوڑی تھوڑی۔''

''مراٹھی بولتے ہو؟''

''نہیں... تھوڑی تھوڑی،'' دکاندار نے کہا۔ وہ اسے منکوں کے ہار دکھانے لگا۔ ''پانچ روپے بائی، پانچ...'' اس نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔

''مراٹھی نہیں جانتے تم؟'' ما نے شوق سے پوچھا۔ وہ ان کی مورتیاں دیکھنے لگی۔ اپنے پہچانے دیوی دیوتا کھوجنے لگی۔ شیر پر سوار دُرگا، مور پنکھ بالوں میں سجائے کرشن، گلے میں سانپ لپیٹے شِو جی یا رام، جن کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا تھا اور جو بس ایک کنول پر کھڑے رہتے تھے اور جو اُتّر کی طرف عام تھے، گنگا جمنا کے علاقوں میں، لیکن ان مورتیوں میں اسے ایک بھی آشنا مورتی نہ نظر آئی۔ یہ تو کچھ اور ہی قسم کی تھیں۔

''یہ مورتیاں کن دیوتاؤں کی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ پھر اسے کرید ہوئی۔ ''تم رام اور سیتا دیوی کو مانتے ہو؟''

''نہیں،'' نوجوان نے اختصار سے کہا۔ وہ دوبارہ اس کے ہاتھ منکوں کا ہار بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''یہ دیکھو... ایک دم چمکیلا ہار۔ یہ پہنے گا ناک میں؟'' اس نے ما کو ایک بڑا سا نکیل نما حلقہ دکھایا جس میں ستارے ٹکے تھے۔

ما حیرت اور اشتیاق سے اپنی دریافت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے انگریزی میں با سے کہا جو ان کی ٹوکری میں کچھ رکھنے ابھی ابھی آ نکلا تھا۔

''یہ لوگ مراٹھا نہیں ہیں... اور حقیقت میں ہندو بھی نہیں ہیں، یعنی کہ جیسا ہم انھیں جانتے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں میڈم آپ!'' اس کے پیچھے سے آواز آئی۔

ما نے چونک کر پلٹ کے دیکھا۔ ان کے پیچھے انھی کی طرح پہاڑ گھومنے آئے دو مراٹھا لڑکے کھڑے

تھے۔ طالب علم معلوم ہو رہے تھے، اور کافی گھبراہٹ اور غصے سے اس سے مخاطب تھے۔ ان میں سے ایک اس سے الجھنے پر اتارو تھا۔

''یہ لوگ بالکل مراٹھا ہیں۔ ہنڈریڈ پرسنٹ! اس طرح تو آپ ہمیں مہاراشٹر ہی میں اقلیت میں تبدیل کر دیں گی۔ ایک تو ویسے ہی پورے انڈیا کے گنڈوں اور بے روجگاروں نے مہاراشٹر پر دھاوا بول رکھا ہے۔ ایک تو ویسے ہی ہلا بول رکھا ہے گجراتیوں نے... گجو بھائیوں نے...''

وہ تو اور جانے کیا کچھ کہتا، لیکن اس کا ساتھی اسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لے گیا۔ ما حیران پریشان کھڑی رہ گئی... جیسے کسی نے گھنٹی بجا کر اس کے سامنے ہندوستان کے نقشے کو چکر کی طرح گھما دیا ہو۔ ''اوہو، تو یہاں بھی وہی مسئلہ ہے!'' ابھی ابھی جو اس نے سنا، یہ ایک سنی ہوئی بات تھی، کسی اور پردیش میں... کسی اور ملک میں... کسی اور سرزمین پر...

''یہ آدی واسی ہیں،'' ما نے آہستہ سے کہا۔

مگر ایسے نہیں جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ یہ تو اچھے خاصے... اڈرن ہندوستانی ہیں۔ ما نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے اُشا کی کھنکھناتی ہنسی سنی جو بالکل اس کے پاس کھڑی تھی... ایک عجیب موسیقی جیسی مدھم ننھی منی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہوئی ہنسی۔

''تو میں کون ہوں؟'' اُشا ہنستی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''تم؟''

''وارلی ہیں یہ بائی۔ اِدھر نیچے رہتے ہیں۔ جنگلوں میں، ممبئی کے پاس، داہانو، پال گڑھ تعلقے میں اور امبر گاؤں میں... جہاں میرا گاؤں ہے۔''

''تم... آدی واسی ہو؟'' ما نے چکرا کر پوچھا۔ اچانک اسے اُشا اور ترائی سے آئے ہوئے ان دیہاتیوں کے نقوش میں مشابہت کا احساس ہوا۔ وہی پُرسکون خط و خال... اور گندمی رنگ۔

''وارلی۔ ہماری گوت وارلی ہے۔ وہیں رہتا ہے میرا باپ۔ مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ اب کی منگلوار کو آئے گا شاید۔ آپ ملو گی؟''

سامان کی ٹوکریاں اٹھائے دونوں عورتیں آہستہ آہستہ ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ وِلا کی طرف

واپس آنے لگیں۔ پیچھے پیچھے با ایک لمبی چھڑی سے چیکو، ککلی اور بڑکی کو تقریباً ہانکتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک اکتا دینے والی سیر تھی۔ کسی بھی بہانے وہ اُشا کو گھر پر کھانا تیار کرنے اور خود آرام کرنے اور ما کو بچوں کے ساتھ بازار بھیجنے کی ترکیب پر عمل درآمد نہ کر سکا تھا۔

تو یہ تھے آدی واسی! ما نے تعجب کی سنسنی میں ڈوب کر سوچا۔ کہاں تھے یہ لوگ ہزاروں برسوں سے؟ کیا بس یونہی...؟ سب سے کٹے ہوئے رہتے ہوں گے؟ جب ان علاقوں میں سواجی مرہٹے کے گھڑ سواروں کی دھمک سے پہاڑ گونج رہے تھے، جب تاریخ کے منچ پر اورنگزیب کی افواج اور مراٹھوں کی جھڑپوں کا خونیں مگر پُرشکوہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا، تب ... یہ کہاں ہوں گے؟ جنگلوں میں؟ گھنے جنگلوں میں چھپے جھانک رہے تھے؟ جھانک کر دیکھ رہے تھے ہزاروں برس سے۔ یہ انسانی تاریخ کے سب سے زیادہ غیر جانبدار انسان... سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ! ما نے فیصلہ کیا۔ جنگلوں میں ہزار برسوں سے چھپے لاکھوں لوگ! اس نے پھر سنسنا کر سوچا۔ جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے ان کا رنگ سنولایا نہیں۔ دھوپ نہیں آتی ہوگی نا وہاں، اس نے سوچا۔

''کہا جا سکتا ہے! کہا جا سکتا ہے!'' بمبئی میں سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ رانگانیکر نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔ (ما کی یہ بات سن کر کہ وارلی آدی واسی نہ مراٹھا تھے نہ ہندو۔)

''مگر اب لگتا ہے تہذیب کا تیزی سے گھومتا چکر انھیں چھوڑے گا نہیں۔ وہ انھیں اپنی لپیٹ میں لے کر ہی دم لے گا۔ اور یہ... آدی واسی... جیسے ہیں اور جہاں ہیں، وہیں کی تہذیب میں رُل گھل کر اسی کا ایک انگ بن جائیں گے۔ پچاس برس بعد، اسّی پچاسی برس بعد، آپ کو بالکل ویسے ہی ایک وارلی مراٹھا مل سکتا ہے جیسے آج ایک رانگانیکر مراٹھا مل رہا ہے۔''

''مگر یہ صرف مہاراشٹر ہی میں تو نہیں...'' ما نے کہا۔

''نہیں نہیں! ایک چوڑی پٹی سے پہاڑوں کی اور بنوں کی...'' کامریڈ رانگانیکر کرسی سے اٹھ کر شیلف میں لگی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگے۔ ''یہ دیکھیے!'' انھوں نے ایک کتاب کھول کر اسے سبز اور خاکی رنگوں سے بنائے ہوئے نقشے دکھائے۔

''یہ تو ایک چوڑی پٹی میں پورے ہندوستان کو لپیٹے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھیے عرب ساگر کے پاس سے، سورت، کھنڈیش، میل گھاٹ، چنڈا، بستر، سریکاکلم، کوراپٹ، چھوٹا ناگپور، سنتھال پرگنہ سے لے کر ہمالیہ کی

ترائیوں اور اروناچل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہیں یہ پہاڑوں اور ان کے سنگ اگنے والے بہت گھنے بنوں میں رہتے ہیں۔

''چھوٹا ناگپور!'' ما کی یاد میں گھنٹی سی بجی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اخبار میں ایک عجیب خبر دیکھی تھی۔ چھوٹا ناگپور کے قبائل نے حکومتِ انگلشیہ کو درخواست بھیجی ہے کہ انھیں ایک الگ ملک قرار دے دیا جائے۔ وہ پیٹ دبا کر ہنستی رہی تھی۔ ''یہ ہندوستان! یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی... مدھیہ پردیش کی نابھی میں جما چھوٹا ناگپور (بڑا بھی نہیں!) بقیہ ہندوستان سے علیحدگی کا... لیکن...'' اس پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔ ''یہ درخواست... اب... انگریزی سرکار کو کیوں بھیجی گئی؟ ان کے جانے کی خبر جنگلوں میں دیر سے پہنچی کیا؟ یا پہنچی ہی نہیں؟''

اس خبر کو سب نے ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ایک پیچیدہ صورتِ حال کو نئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹا ناگپور تو جہاں بھی ہو... لیکن وہ خود... کیا انجانے میں انسانی وجود کی نابھی سے جا ٹکرائی تھی؟

آخر با نے ایک ترکیب سوچ لی... ایک پیچ دار ترکیب۔ بدھوار کی صبح وہ ما کو بازار لے جائے گا۔ اس کے بعد، جبکہ اُشا کھانا پکا چکی ہوگی، وہ ما کو واپس لے آئے گا۔ پھر ما بچوں کو سیر کرانے لے جائے گی۔ اور با؟ وہ تھوڑی دیر سوئے گا۔

ما با کے ساتھ بازار گئی، پروگرام کے مطابق واپس آئی اور پھر بہت تھک گئی۔ با جب چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹا تو ما کو وہاں پا کر ششدر رہ گیا۔

''بچے شور مچائیں گے، ضد کریں گے بچے!'' اس نے ما کو سہولت سے سمجھایا۔ ''تم انھیں سیر کرانے لے جاؤ۔''

''وہ تو دیر ہوئی اُشا کے ساتھ جا چکے ہیں!'' ما نے اسے اطلاع دی۔

با بستر پر اچھل پڑا۔ اس کا پورا بدن اکڑ گیا۔ وہ فوراً بستر سے اتر کر موزے جوتے پہننا چاہتا تھا۔

''اُشا اکیلی... وہ کِکلی کو... چیکو کو... کیسے سنبھالے گی اُشا انھیں؟'' اس نے سرعت سے کہا۔ اب وہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

ما آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔

آنکھیں بند کیے کیے اس نے آدمی کو بستر سے نکلتے، اِدھر اُدھر کھڑبڑ کرتے سنا۔

''کہاں؟ کس طرف گئی ہے؟ کس طرف گئے ہیں سب لوگ؟'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آخری پہاڑی پر... جہاں دوربین لگی ہے،'' ما کی اداس آواز آئی۔

''افوہ! اتنی دور؟ گریں گے سب لوگ! اکیلے...'' با نے افسوس سے کہا اور چشم زدن میں کمرے سے باہر دوڑ پڑا، اپنے اوپر مردانہ آفٹر شیو کی پھوہاریں ڈالتا۔ کمرہ خوشگوار مہک میں بس گیا۔

بچے اُشا کے ساتھ آخری پہاڑی پر نہیں گئے تھے۔ اتنی دور تک وہ واقعی انھیں کیسے سنبھالتی! وہ تو بڑی مال تک گئے تھے۔

با کو دھوکا دے کر ما آرام سے سوگئی۔

اندھیرا پڑتے ہوئے جب با آخری پہاڑی سے اکیلا متھا مار کر، سنگلاخ سرخ چٹانوں میں ''اُشا! اُشا!'' پکار کر، اور ان کی گونج کو دور دور تک تالیاں بجاتے سن کر اور بے بسی میں دو روپے دے کر دوربین سے دور نظر آنے والے بنوں کو دیکھ کر واپس لوٹا، سرخ مٹی میں اٹا ہوا، تب اُشا کب کی واپس آ چکی تھی اور اپنی کوٹھڑی میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بڑکی اور ککلی اس کے پاس زمین پر بیٹھی ڈھیر سے جمع کیے ہوئے چوڑے پلس کے پتوں اور کانٹوں سے لپا جھپ دونے بنا رہی تھیں۔ چیکو گندھے آٹے سے ہاتھی گھوڑے بنا رہا تھا۔

ما کے بازوؤں میں با بے دم ہو کر گر پڑا۔

''ہوسکتا ہے ہندوستان کا قدیم انسان یونان اور برما سے آیا ہو۔ ان دونوں خطوں میں قبل از تاریخ پتھروں کے اوزاروں کی ساخت اور وہ مادّہ جس سے یہ اوزار بنائے گئے ہیں، یکساں پایا گیا ہے۔''

ما کوسمبی کی کتاب کے ورق پلٹتی رہی۔ یہ با کی کتاب تھی۔ پہاڑ پر مطالعے کے لیے وہ اسے دلّی سے ڈھو کر لایا تھا۔

''یہ خوراک بینتے تھے، کاشت نہیں کرتے تھے۔ گھنے جنگلوں میں آج بھی خود رو باجرہ، جوار، گیہوں، چاول اور گرم مسالہ تک مل سکتا ہے۔ تاریخ نویسوں کو یہ بات حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ جبکہ ان کے بالکل پڑوس میں کاشتکاری شروع ہو چکی تھی، کیونکر ان میں سے اتنے زیادہ تعداد میں صرف خوراک بیننے پر قانع رہے۔ ان کا پیداوار کا طریقہ نہ بدلا۔ اسی طرح ان کی زندگی کا اور عقائد کا محور جوں کا توں رہا۔''

آ گے لکھا تھا:

''ہندوستان کی پریشان کن خاصیت، متصل خطوں میں ادوار کا ایک دوسرے پر تہہ در تہہ حاوی ہونا ہے۔ ایک دور شروع ہو کر اختتام پذیر ہو جاتا تھا، جبکہ پہلا دور پھر بھی باقی رہتا تھا۔ جنوبی علاقوں میں ان آدی واسیوں کے بنائے ہوئے دو عجوبے ملتے ہیں۔ یہ پتھروں پر ایک دائرہ سا کھود دیتے تھے۔ اس کے علاوہ چٹانوں پر دوسری چٹانیں رکھ دیتے تھے۔ مہاراشٹر میں یہ اوپر تلے رکھی چٹانیں ہزاروں کی تعداد میں ملی ہیں۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا۔

''خوراک بیننے والوں کی ایک دیوی ماں تھی۔ بعد میں گوالوں کا دیوتا دریافت ہوا ہے۔ ابتدا میں دیوی ماں کی دیوتا سے جنگ تھی۔ جب ان قبیلوں میں صلح ہوئی تو دونوں کی شادی کر دی گئی۔ پھر بھی ہمیں ان مندروں میں کہیں کہیں دیوی ماتا کاشتکاروں کے دیوتا مہاسوبھا کا سر کچلتے ہوئے ملتی ہے، جبکہ ایک کوس کے فاصلے پر کسی مندر میں دیوی مہاسوبھا سے بیاہ رچا رہی ہوگی۔

''بعد کے آنے والے باہمنوں نے اس جوڑے کو دراوڑی جوڑے شِو اور پاربتی کی ابتدا قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر دراوڑی پاربتی شِو کا اس طرح سر نہیں کچلتی۔ آدی واسی ابتدا میں اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔ دراوڑ صرف جلاتے تھے۔ اب جلانے کی رسم آدی واسیوں میں رائج ہوگئی ہے۔ آدی واسی کاشتکاروں میں کاشتکاری کا کام عورتیں کرتی تھیں۔ دراوڑ کلچر میں زمین کھودنے کا کام عورتوں سے نہیں کروایا جاتا۔ یہ لوگ مٹی کے بالکل مدوّر، گول برتن، کمہار کے چاک کے بغیر، صرف ہاتھوں سے بناتے تھے...''

تھے کیا مطلب؟ اب بھی بناتے ہیں، ما نے سوچا۔ اسے منگلوار کے میلے میں کپڑا بچھائے، مٹی کے برتن بیچتی عورت یاد آئی۔ سب کے سامنے چکنی سرخ مٹی کے لوندے کو ہاتھوں سے تھاپ تھاپ کر گول کر رہی تھی۔ اس کے گرد سیاحوں کی بھیڑ تھی۔ پندرہ منٹ میں چھوٹے سے منہ اور بڑے سے پیٹ کی ہانڈی تیار ہو جاتی۔ فاتحانہ انداز میں وہ سب کو دکھا کر سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتی۔ عورت پر جھکا ہوا مجمع تعریف میں تالیاں بجاتا۔ ان میں سب سے زیادہ تو (بعد میں با نے بتایا جو یہ تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھا)... گندمی پیالے دیکھ رہے تھے جو ''ایشور نے اتنی، کیا کہتے ہیں کہ کاریگری سے بنائے تھے،'' دیکھنے والوں میں سے ایک نے رقت سے آہ بھر کر کہا تھا، اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ہندوستان کی اَن لکھی، آدی تاریخ... ما نے سوچا... کتابوں کے بدلے ہر جگہ موجود ہے۔ اور کوئی دور بھی... اس نے حیرت کی کہ... ختم نہیں ہوا۔

بدھوار کی صبح، ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔ اُشا نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

’’باپ آیا ہے۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

ما بال جھاڑتی اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ اس کوٹھڑی میں بہت ہی کم آتی تھی، جہاں اگربتیوں اور تمباکو کی عجب ملی جلی خوشبو بسی رہتی تھی اور جہاں سہ پہر کی روشنی میں ایک دن اس نے دیوار پر عجیب نقش و نگار دیکھے تھے۔ اُشا نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ کچھ جھجھک کر اس نے پٹ کھولے۔ یہ کوٹھڑی کچھ ایسے زاویے سے بنی تھی کہ دوپہر تک باہر احاطے میں دور دور پھیلا ہوا اجالا، جس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا، کوٹھڑی کے اندر براجمان اندھیرے کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا تھا۔ اُشا کی کوٹھڑی کی نیم تاریکی میں اسے ایک ہیولا سا نظر آیا۔

’’اری مجھے کچھ نہیں دِکھ رہا،‘‘ ما نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار کہا۔ اسے ڈر تھا، زمین پر دھرے برتن بھانڈوں سے ٹھوکر نہ کھائے۔

اُشا نے اپنی کوٹھڑی کی بائیں دیوار میں جڑی کھڑکی کھول دی۔ اس کھڑکی کا اسے پہلے کیوں پتہ نہ چل سکا؟ شاید دیوار کے رنگ کی رنگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلنے کے ساتھ ہی روشنی کی ایک چورس، چوڑی ترچھی لکیر کوٹھڑی میں گھس آئی۔ پل بھر تک تو ما اس زرد روشنی ہی کو دیکھ سکی جس نے اچانک فضا میں معلق ان گنت نہ جانے کس قسم کی دھول کے خوردبینی ذرات روشن کر کے اسے بُجھا دیے۔ شاید اُشا نے ابھی جھاڑو دی ہو، ما نے سوچا۔ لیکن اب کمرہ روشن ہو چکا تھا۔

ایک ہاتھ سے اپنی مچمچاتی آنکھوں کو روشنی سے بچاتا ایک بہت بوڑھا، جھریوں کی پوٹلی سا آدمی ایک لمبی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو رہا تھا۔ اس کے تن پر ایک کسی ہوئی لنگوٹی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں، ہاتھ کے کتے اون کی ایک رنگ برنگی کملی اس کے برہنہ شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔

ما اسے نہایت حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے مٹھی بھر بال جن میں اب بھی، جیسے کسی حیاتی معجزے سے، کافی سیاہ بال موجود تھے، سکھوں کی طرح لمبے، جن کا اس نے تالو پر جوڑا بنا رکھا تھا، لیکن ڈاڑھی مونچھ نہیں تھی۔

لاٹھی اُشا کو تھما کر، بڈھے نے سینے کے ساتھ ایک ہاتھ کا پیالہ بنایا اور دوسرے بازو کی کہنی پیالے میں ٹکا کر بانہہ اپنی ناک کے سامنے لکڑی کی طرح سیدھی کر لی۔

ما کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے شدید سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ ایک سچ مچ کے آدی واسی کو دیکھ رہی تھی

جو شاید اسے سلام کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک بے بس قسم کی ہنسی کو اپنے اندر کروٹیں لیتی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی جو اس عجیب سلام سے پیدا ہو رہی تھی، جو اس کے اپنے تمام تر ثقافتی تجزیے میں کسی فحش اشارے سے مشابہ تھا۔

''بیٹھو بیٹھو!'' ما نے کہا۔

ہاں ہاں کرتا بڈھا بیٹھ گیا۔

مانے حیرت سے پوچھا، ''یہ ترائی سے، امبر گاؤں سے، اتنی اوپر پہاڑ پر چڑھ کر کیسے آ گیا؟''

''نہیں!'' اُشا ہنسی۔ ''بس میں آیا ہے۔''

ما اُشا کے پاس بیٹھ گئی۔

''کیا کرتا ہے تمھارا باپ؟''

''اب کیا کرے گا؟ بڈھا اتنا ہو گیا ہے۔ ہاں پہلے ... پہلے جنگل جلاتا تھا۔''

''جنگل؟''

اُشا ہنسی۔ ''کوئلہ! کوئلہ جانتی ہے نا آپ؟ جو انگیٹھی میں جلتا ہے۔ پیڑ پورا جلا کر کوئلہ بناتا تھا۔''

''اچھا،'' ما نے کہا۔ وہ جانتی تھی (اسے یاد آیا، کوئلہ وغیرہ تو کب کا استعمال کرنا چھوڑ چکے تھے شہروں کے لوگ... کم از کم جن شہروں میں وہ رہی پچیس تیس برسوں سے... کراچی اور دلّی... دلّی تک میں جہاں قدرتی گیس نہیں تھی، وہ گیس کے سلنڈر استعمال کرتے تھے) کہ کوئلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پتھر کا کوئلہ اور لکڑی کا کوئلہ۔ مگر یہ بنتا کیسے ہوگا؟ اس بات کے سوچنے پر اس نے اپنے جیون کے پندرہ منٹ بھی کبھی نہیں گذارے تھے۔ ایسا اس نے صرف کبھی بچپن میں نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ زندگی کیا اس قدر زیادہ لمبی تھی؟ اس ایک پل میں اس نے سوچا تھا۔ کچھ باتیں پڑھی ہوئی، سنی ہوئی، کیا مٹی کے کسی تودے کے نیچے دفن ہو گئی تھیں؟ لیکن اس کے باوجود... کس قدر چھوٹی محسوس ہوتی تھی زندگی! جیسے کل ہی کی بات ہو... سب کچھ!

''ہاں...'' اُشا کہہ رہی تھی۔ ''کوئلہ بنانا یہاں بس وارلیوں ہی کو آتا تھا۔ اب تو نہیں بناتے یہاں... سرکار نے منع کر دیا ہے۔ لیکن میرے چھوٹے ہوتے تک ہم پیڑ کاٹتے تھے۔ ہر رات الاؤ جلتا تھا۔ بہت بڑا الاؤ! اس میں پورا پیڑ پھینکتے تھے... ایک بار... ایک بار تو ایک آدمی کو پھینک دیا تھا۔''

''آدمی کو؟ کس نے پھینک دیا تھا؟'' ما نے مسحور سا ہو کر پوچھا۔
''کھاتے دار نے،'' بڈھے نے سادگی سے کہا۔

شنی وار۔ آج ما نے سویرے اشنان کیا۔ بال دھوئے۔ دھوپ میں بال سکھانے بیٹھی۔ پہاڑ کی کنکنی دھوپ۔ یہاں سویرا کتنی جلدی ہو جاتا تھا! با اور بچے اس سے بھی پہلے اٹھ گئے تھے۔ با نے بچوں کو جگایا تھا۔ ''بادل!'' اس نے اشتیاق سے اطلاع دی تھی۔ علی الصباح بادلوں کے ٹکڑے پہاڑ پر اتر آئے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے، بھٹکے بادلوں کے ٹکڑے کسی اپسرا کے چھپر کھٹ کی طرح، ولا کے دروازے کے عین سامنے اڑتے چلے آ رہے تھے۔ بچوں نے حیرت اور خوشی سے چیخیں ماری تھیں۔ پھر خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ کہیں بادل انھیں لپیٹ نہ لیں اور اڑا نہ لے جائیں۔ انھوں نے با کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سوچا ہوگا، با زیادہ بھاری ہے، اسے تو نہ اڑا پائیں گے۔ لیکن پاس آتے آتے بادل دھند نظر آنے لگے تھے۔ وہ اس کنبے سے ٹکرا کر وِلا کو پار کرتے چلے گئے تھے، جاتے جاتے سب کو گیلا چھوڑ کر۔ بچے چیخیں مار مار کر ہنستے رہے تھے۔ بادلوں نے انھیں سچ مچ چھوا! اڑتے بخارات کے لمس کی گدگدی وہ دیر تک اپنے بدنوں پر محسوس کرتے رہے تھے۔ اب سب اپنے اپنے پروگرام کے مطابق باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

ما دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ وہ برآمدے سے آرام کرسی گھسیٹ لائی تھی۔ پرانے زمانے کی لکڑی اور بینت کی بنی ہوئی کرسی احاطے میں گھسیٹ کر وہ سورج سے پیٹھ کیے بیٹھی تھی کہ تیز شفاف دھوپ آنکھوں میں نہ پڑے، اور کل کا باسی انگریزی اخبار الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جو با اسٹیشن سے متصل بازار سے لایا تھا۔ وہ خبروں پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ زیادہ تر فلموں کے اشتہار دیکھ رہی تھی۔ ما کا دھیان بٹا ہوا تھا۔

بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر انھیں سکھاتے ہوئے ما نے بلند آواز میں کہا:

''یہ تو صریحاً ناانصافی لگتی ہے... بالکل عقل کے الٹ بات ہوئی یہ تو... کہ جس چیز میں روح ہی نہیں، جو ناسمجھ ہے، بے شعور ہے، وہ تو پھلے پھولے اور بڑھے... اور جو چیز باشعور ہے، سمجھدار ہے، وہ بس ساکن و صامت رہے... ٹھنٹھ کی ٹھنٹھ، کسی سوکھے مارے پیڑ کی طرح... بلکہ پتھر کی طرح، جس میں تبدیلی نہیں آتی۔ پتہ نہیں باہمنوں نے اکیلے بیٹھ بیٹھ کر کیا الٹی مت کی باتیں سوچیں۔ دھوپ میں کھوپڑی پگھل گئی

ہوگی۔ مت ماری گئی ہوگی۔ ظاہر ہے۔''

''کون کہتا ہے، پتھروں میں تبدیلی نہیں آتی!'' بڑکی نے جھولا جھولتے ہوئے پکارا۔'' بالکل آتی ہے۔ مگر ہزاروں برسوں میں۔ ایسا ہماری جیوفزکس کی کتاب میں لکھا ہے۔''

''اور باہمن دھوپ میں نہیں بیٹھتے تھے، پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے،'' بانے لقمہ دیا۔

ماسکرائی۔ پھر بھی اسے مادے کی روح پر برتری پسند نہیں تھی... مادہ مرجاتا ہے۔ مگر صرف مرجانے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کے شعور کی زیریں رو میں یہ بات تھی کہ مرتو سب ہی جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد آتما نہیں مرتی تو نہیں مرتی ہوگی۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بات تو زندگی کی تھی۔ آتما کا مطلب اس کے ذہن میں شعور تھا... آتما کا مطلب اس کے مطابق تھا خیال، احساسات، وغیرہ۔ وہ انھی کو برتر سمجھنا چاہتی تھی۔ ادھڑائی عورت بیچاری! جب کششِ ثقل اور پیدائشِ بچگان کی مشترکہ بیہودہ سازش سے بدن ڈھل رہا ہو، تب وہ روح کی برتری نہ چاہے گی تو کیا بدن کی برتری چاہے گی؟ نہیں! روح ہی برتر ہونی چاہیے... اورصرف ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے، مانی بھی جانی چاہیے۔ لوگوں کی نظروں میں اس کی انترآتما نے خواہش کی، آتما ہی کی زیادہ قدر ہونی چاہیے۔

دور جامنوں کے جھنڈ پر لنگور ہڑدنگے مچا رہے تھے اور زقندیں لگا رہے تھے۔

تب ہی پاس مٹی میں کھیلتے چیکو نے الٹی کی۔ ''ہائیں! یہ کیا؟'' اخبار پھینک کر وہ گھبراہٹ میں کھڑی ہوگئی۔ اس نے چیکو کو گود میں اٹھایا۔ ستھری دھلی ساری پر چیکو کی الٹی سن گئی۔ چیکو کا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔

''ڈاکٹر نے کہا تھا، بخار ہوسکتا ہے،'' بانے اسے تسلی دی۔ ''تم نے اسے دوا کی صبح کی خوراک پلائی؟''

مانے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ چیکو کو ناشتہ کرا کے اسے دوا پلائی تھی۔ لیکن چیکو کو بخار ہوگیا تھا۔ اب چیکو آج سیر پر نہیں جاسکتا تھا... اور... ما بھی نہیں!

باکے تو پوبارہ ہوگئے۔ بے پناہ مسرت کو چھپاتا، چھپانے کی ناکام کوشش کرتا، وہ بے ربط جملے بولنے لگا۔ ''بہت ضروری ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا۔ سب کچھ لانا ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے تو دکانیں معلوم ہی نہیں۔ اُشا کو جانا ہے۔ اور ہاں، ِککلی کو تو بڑکی سنبھال لے گی۔''

بڑکی بال لہراتی آئی۔ آنکھیں مسرت سے تاروں کی طرح روشن۔ ''بالکل ما... تم فکر نہ کرو۔ ِککلی کو میں سنبھال لوں گی۔ میں اسے گھومنے والے جھولے پر بٹھاؤں گی۔'' اس نے چٹا چٹ ما کے

رخساروں پر بوسے دیے۔

ما کے آدھے دماغ نے سوچا: بڑکی رِککلی کو سیر کراتی ہوگی، اتنے دنوں بعد با کو اُشا کے ساتھ تنہا ہونے کا پہلا موقع ملے گا۔ لیکن اس کا آدھا دماغ چیکو کے بخار میں کب کا لگ چکا تھا۔ وہ چیکو کو بانہوں میں بھر کے اندر لے گئی۔ اُشا جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بجلی کی راڈ سے اس نے خود ہی بالٹی میں پانی گرم کیا۔ چیکو کے منھ اور بدن سے تولیہ بھگو کر الٹی صاف کی۔ پوڈر لگایا۔ اسے صاف کپڑے پہنائے۔ اپنی ساری اور بلاؤز تبدیل کیا۔ چیکو کو چھاتی سے لگا کر تھپکتے ہوئے جب ما نے کھڑکی سے جھانکا تو رِککلی، بڑکی، با اور اُشا کا چھوٹا سا قافلہ وِلا کی ڈھلان سے اتر رہا تھا۔ سب سے آگے رِککلی، سمجھداری سے جما جما کر قدم دھرتی ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑکی، رِککلی کی آہستہ روی سے بیزار، لنگوروں کی طرح زقندیں لگانے کے لیے بیتاب۔ اس کے پیچھے تھی اُشا، پُرتمکنت، حسین اور پُرسکون... آشنا راستوں پر لاشعوری اعتماد کے ساتھ قدم دھرتی۔ اور آخر میں با، جس نے دونوں ہاتھوں میں خالی سودے کی ٹوکریاں خود ہی اٹھا رکھی تھیں؛ جس کی باچھیں بالکل بڑکی ہی کی طرح کھلی تھیں، اور جو اتنی دور سے بھی اُشا پر واری صدقے ہوتا نظر آ رہا تھا... جس کا پیر بار بار رَپٹ رہا تھا کیونکہ اسے راستے کا ذرہ برابر دھیان نہ تھا۔

آن کی آن میں وہ سب ما کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ما کسی عامل کے معمول کی طرح چیکو کو تھپکتی رہی۔ ابھی تک اس کا دماغ چیکو میں لگا تھا، لیکن اب جب چیکو اس کے سینے سے لپٹ کر اونگھ رہا تھا، اور وہ سب جا چکے تھے، اس کے ذہن نے چیکو کی فکر سے آزاد ہو کر پوری صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا، با اور اُشا کے بارے میں سوچا تھا، اور ذلت اور غم میں ڈوبنے لگا تھا۔ ما کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔ سر کو جھٹکے دے دے کر اس نے غم کو بھگانے کی کوشش کی۔ چیکو اس کی بانہوں میں سو گیا۔ جانے کب سے سو رہا تھا چیکو، جبکہ وہ اسے گود میں لیے ٹہلے جا رہی تھی۔

ما نے چیکو کو اپنے بستر میں لٹایا۔ حفظِ ما تقدم کے طور پر اس کے نیچے ننھی سی چادر اور پلاسٹک بچھایا (کیونکہ چیکو پیشاب ضرور کرے گا)۔ اسے رضائی اڑھائی۔ پھر کچن میں چلی گئی۔ اس نے ایک بڑا سینڈوچ بنا کر کھایا۔ اسے اتنا نہیں کھانا چاہیے! وہ جرم کے احساس اور پچھتاوے میں ڈوبی۔ وزن نہیں بڑھانا چاہیے اپنا۔ اسے سر کے بل کھڑا ہونا چاہیے، کششِ ثقل کے اثر کو رد کرنے کے لیے... اس نے مایوسی سے سوچا... کیونکہ وہ ایسا سب کچھ کر نہیں پاتی تھی، بھول جاتی تھی۔ ما کا دھیان کہیں اور بٹا رہتا۔

اور ایک بار پھر بالکل ایسا ہی ہوا۔ دھیان بٹانے والی ایسی بات جس سے بڑی شاید ہی کوئی اور ہوسکتی۔ اگر روس اور امریکہ میں تیسری عالمی جنگ شروع ہو جاتی تو شاید ما کے ذہن کو کم جھنجھوڑتی۔ جب گول کمرے میں جا کر ما نے وقت ہلاک کرنے کے لیے ٹرانزسٹر ریڈیو لگایا، دوپہر کی خبریں ہو رہی تھیں، اور اسے پتہ چلا، ان مہاراشٹری پہاڑوں کی ترائی میں تھوڑے ہی فاصلے پر بھیونڈی میں شدید ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔

ہندو مسلم فساد تو ہوتے رہتے تھے۔ ہر مہینے کہیں نہ کہیں تو ضرور ہی ہوتے ہوں گے۔ اب اگر وہ بچوں کے اسکولوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر آئے ہوئے تھے تو بلوائیوں کو تو اس کی خبر اور پروا نہیں تھی نا؟ یا ہونی چاہیے تھی؟

ما پریشانی میں ریڈیو سنتی رہی۔ خبروں کے بعد فلم کے گیت اسے اچھے نہیں لگے۔ وہ ٹرانزسٹر کی،

اے مالک ترے بندے ہم
ایسے ہوں ہمارے کرم
نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں
تاکہ ہنستے ہوئے نکلے دم

کی پُرسوز التجا کو بد دلی سے سنتی رہی تھی، جو اسے پتہ تھا کہ ایک مراٹھا ہدایتکار وی شانتا رام کی فلم دو آنکھیں بارہ ہاتھ میں گایا گیا تھا۔ ما نے یہ فلم دیکھی تھی۔ ٹی وی پر دکھائی گئی تھی۔

''بڑا کمزور ہے آدمی... ابھی لاکھوں ہے اس میں کمی... پر تو جو کھڑا، ہے دیالو بڑا... تری کرپا سے دھرتی تھمی...'' ریڈیو کہہ رہا تھا۔

جی ہاں، ما نے سوچا تھا۔ آدمی اتنا کمزور ہے! شانتا رام نے اپنی حسین بیوی جے شری کو چھوڑ، سندھیا کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ داشتہ بنا لیا تھا اپنی! اس نے تلخی سے تبصرہ کیا تھا۔ یہ فلم بنا کر... اور یہ گیت گوا کر۔ اس نے سوچا تھا، آدمی جو کہتا ہے اس کے الٹ کیوں کرتا ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی، اور وہ سمجھنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی، جبکہ اسے اپنے ذاتی معاملات بہتر بنانے کی کم از کم کچھ کوشش کرنی چاہیے تھی، جبکہ اسے ذاتی حالات کا کافی غم تھا، حالانکہ زندگی کی رواروی میں غم تک کی فرصت آدمی کو کم ملتی ہے۔

گیت چل رہا تھا:

یہ اندھیرا گھنا چھا رہا
تیرا انسان گھبرا رہا
ہو رہا ہے بے خبر
کچھ نہ آتا نظر
سکھ کا سورج چھپا جا رہا

خالی خالی آنکھوں سے ما سفید دیوار کو تکتی رہی:

پر تو جو کرے گا کرم... تو (نہ جانے کیا) ہو جائیں گے ہم... نیکی پر چلیں، اور بدی سے ٹلیں...''

ما نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کر دیا۔

کھڑکی سے ما کو نظر آیا، ولا کی ڈھلان پر دو نفسوں کے خطوط ہابڑ تابڑ چڑھتے چلے آرہے ہیں۔ آگے آگے بڑکی تھی جس کی چمکدار آنکھیں چکر مکر گھوم رہی تھیں اور چہرے پر سنجیدگی اور کچھ برا منانے کا تاثر۔ گال سرخ ہو رہے تھے، شاید چڑھائی چڑھنے سے۔ لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھی پندرہ سال کی اس کی بڑکی۔

اور اس کے پیچھے با تھا... سبزی ترکاری، دالوں دودھ کے ڈبوں، چاکلیٹوں اور گوشت سے ابلتی ٹوکریوں سے لدا پھندا۔ ٹوکریوں سے مسالوں کے پیکٹ ابل ابل کر گرے پڑ رہے تھے۔ با کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں ابلی آرہی تھیں اور منہ سے مارے غصے کے جھاگ نکل رہے تھے۔

بڑکی اس سے کچھ کہے بغیر، تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ پورے برآمدے میں اس کی مشک نافہ کی سی خوشبو پھیل گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے میں جا کر با اسے پوری بات بتا پایا... اس کا غصہ اور گھٹن اس قدر زیادہ تھی۔

ہوا یہ تھا کہ بڑکی کے چڑیل پن نے سارا پروگرام تلپٹ کر دیا تھا۔ با کا ارادہ یہ تھا کہ خریداری کے بعد، یا خریداری کے دوران، بڑکی ِککلی کو سنبھالے گی۔ لیکن بڑکی نے ایسا کچھ بھی نہ کیا تھا۔ بڑکی نے اُشا کو پٹا اور رجھا کر پہلے ساری خریداری کرا دی تھی، اور جب با گوشت کی دکان میں گیا تھا اور اُشا ہندو ہونے

کی وجہ سے نہ گئی تھی، تب رِنکلی کو اُشا کے حوالے کر کے بڑکی رفو چکر ہو گئی تھی۔

گوشت کی دکان پر ایک کلو قیمہ اور ایک کلو گوشت تلوا کر، اسے چار پیکٹوں میں بندھوا کر، جب با باہر آیا تھا، اس نے رِنکلی کے سنگ اُشا کو کھڑے دیکھا تھا اور بڑکی غائب تھی۔ جیسا کہ کسی مثنوی میں ایسے موقعوں کے لیے لکھا تھا:

اڑتی چوکی پہ خاک پائی
پردے کی قنات چاک پائی

یعنی کہ داستان کی اصل ہیروئن اڑنچھو ہو چکی تھی۔

''بڑکی کہاں گئی؟'' اس استفسار پر اُشا نے شمال کی جانب منھ کر کے کہا تھا، ''وہاں... کہتی تھی، ابھی آتی ہوں۔''

گوشت کی دکان کے سامنے، جبکہ کاغذ کے تھیلوں سے خون رس رہا تھا، با، رِنکلی اور اُشا نے اتنے عرصے تک بڑکی کا انتظار کیا جو انھیں کئی گھنٹے معلوم ہوا۔ رِنکلی نے دونوں ہاتھوں کا جھولا بنایا اور انھیں دیر تک جھلاتی رہی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کنکروں کی قطاریں بنائیں۔ پھر اس نے پہلے جسامت اور پھر رنگ کے حساب سے کنکروں کی الگ الگ کئی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنائیں۔ مگر بڑکی شمال کی طرف سے واپس نہیں آئی۔ آخر رِنکلی کھڑی ہو گئی۔ اس نے سکون سے کہا، ''با، اب میں جھولے پر بیٹھوں گی۔''

با پریشانی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اتنی دیر تک اُشا سے فلرٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رِنکلی کے صبر پر اور بھی اس کا دل کٹا۔ (با بچوں پر جان دیتا تھا۔) مارے غصے کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بڑکی کہاں مر گئی؟ وہی تو لے جاتی تمھیں جھولا جھلانے!'' اس نے غم و غصے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

اُشا نے تسلی دی۔

''بابو صاب، پھکر نہیں کرو۔ بے بی کو میں سیر کراتی ہوں۔ آپ سامان لے کر بڑکی کو ڈھونڈ لیجیے اور واپس چلے جائیے۔''

رِنکلی خوشی سے کھلکھلانے لگی۔ اس نے جھٹ اُشا کی انگلی تھام لی۔

با ہڑبڑایا... لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ترکیب سوچ پاتا، رِنکلی اور اُشا جا چکے تھے۔

بڑکی کی تلاش میں، سامان کی کئی ٹوکریاں اٹھائے، با شمال کی طرف گیا۔ لیکن بڑکی وہاں نہیں تھی۔

با جنوب اور مشرق اور مغرب کی طرف گیا، مگر بڑکی ان چاروں سمتوں میں نہیں تھی۔ با پریشان ہو گیا۔ بڑکی کو آسمان کھا گیا کہ زمین نگل گئی؟ پریشانی میں وہ ان تمام جگہوں پر گیا جہاں پہلے جا چکا تھا۔ ٹوکریوں سے پیاز اور آلو لڑھک لڑھک کر گرتے رہے۔

اب اگر با بڑکی کو مزید تلاش کرتا تو وہ پریشانی سے بیہوش ہو سکتا تھا۔ اس نے دل کو سختی سے تسلی دی کہ کسی وجہ سے بڑکی واپس وِلا چلی گئی ہوگی، اور یقیناً وہیں ہوگی۔ جیسے ہی وہ ولا میں قدم رکھے گا، بڑکی اسے نظر آ جائے گی۔

با، لدا پھندا، ولا کی سمت جانے کے لیے پہاڑی کی چکراتی پگڈنڈیاں چڑھنے لگا، جو ریل کی چھوٹی گیج کی پٹڑیوں کے ساتھ اور کبھی ان سے ہٹ کر موڑ کاٹتی اوپر جا رہی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر با کیا دیکھتا ہے کہ ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ دو بڑے پتھروں پر بڑکی بیٹھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک سولہ سترہ برس کا سانولا، عینک پوش مگر اسمارٹ لڑکا بھی بیٹھا ہے۔ ایک سفید گھوڑا پاس کھڑا چر رہا ہے۔

بڑکی!

با نے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ بجلی کی طرح اطمینان کی لہر تن بدن میں دوڑ گئی۔ اور پھر مارے شدید غصے کے دل ہی دل میں زار و قطار رویا۔

''بڑکی!'' اس نے غصے کی دردناک چیخ ماری۔ بڑکی نے اچھل کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً کھڑی ہو گئی۔ پھر بغیر بال برابر افسوس یا ندامت کے خوش باشی سے مسکراتے ہوئے بولی، ''اوہ با!''

پھر بال لہرا کر بولی:

''رمیش، یہ ہیں میرے با۔ اور با، یہ رمیش ہیں۔''

انگریزی بول رہی تھی بڑکی، جیسے کہ انگریزی فلموں میں بوائے فرینڈ کا خاندان سے تعارف کراتے ہیں۔

سانولے لڑکے نے فوراً کھڑے ہو کر مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''گڈ مارننگ سر!'' اس نے نہایت خوش خلقی سے کہا۔

با غصے، اور اپنی ہیئت کذائی پر شرمندگی اور جھجک سے چکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مصافحے کی کوشش کا جواب دیا اور زبردستی باچھیں چیر کر مسکرایا۔ اس نے یہ تک کہا کہ اسے رمیش سے مل کر

نہایت خوشی ہوئی ہے، اور یہ کہ اس کا کیا اچھا گھوڑا ہے۔ دیگر یہ کہ ایرانی بیکری والے مسٹر کیقباد کی ولا میں شام کو وہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ ضرور چائے پییں گے۔

جس کے بعد سانولا عینک پوش لڑکا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ بڑکی نے ٹوکریاں اٹھانے کی پیشکش کی مگر با نے شدید غصے میں سر جھٹک جھٹک کر انکار کر دیا۔ وہ ولا کی طرف روانہ ہوئے۔ خوشی سے تقریباً اڑتی ہوئی بڑکی کے پیچھے با قہر و غضب کے بھیانک کالے بادل کی طرح برستا ہوا ولا کی طرف آیا۔

''غیر ذمے دار!'' با نے داستان سنانے کے دوران اور اختتام پر پچاسویں بار چیخ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے،'' اس نے شدید غم میں سر ہلایا، ''کہ یہ لڑکی جو اتنی بڑی ہوگئی ہے، اور در اصل بڑی نہیں ہوئی ہے، مگر پھر بھی کافی بڑی ہے، نہایت ہی غیر ذمے دار ہے۔''

ما خاموشی سے داستان سنتی رہی۔ اس کے دل میں ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ با کے رومانی ارادوں کی بڑکی نے اچھی درگت بنائی! لیکن یہ تو قصے کا ایک پہلو تھا۔ اب رہی بڑکی...

وہ بڑکی کے کمرے میں آئی۔

چالاک بڑکی نے چور نظروں سے بھانپا کہ ما کا غصہ اصلی ہے کہ مصنوعی۔ وہ لحاف اوڑھے بستر میں پڑی تھی۔ ما کے بارے میں وہ اتنا جانتی تھی کہ کوئی بھی دوسرا ذی روح نہ جانتا ہوگا۔ ما کب ہنستی ہے، کب غصہ کرتی ہے، کب پریشان ہوتی ہے، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ ما کی تیوریاں تک پہچانتی تھی۔ ہاں، ان تیوریوں کا اشارہ مانتی نہیں تھی تو یہ دوسری بات تھی۔ اس بار بھی اس نے ما کی روپوش مسکراہٹ کو اندرونی آنکھوں سے پڑھ لیا۔ فوراً خوشی سے چیخیں مارتی لحاف سے برآمد ہوئی اور ما کے گلے میں جھول گئی۔

جب وہ دونوں پلنگ پر بیٹھیں تو اس نے پھر ما کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشی سے بے قابو ہو کر کہا:

''میں رمیش سے... رمیش سے ہی بیاہ کروں گی۔''

ما کو اس بات کی توقع تھی۔ دونوں بانہوں سے بڑکی کو پرے دھکیل کر ما نے ماتھا پیٹا۔ ''پچھلے چھ مہینوں میں یہ بارھویں بار تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ اس بکواس کا میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی۔''

''نہیں نہیں ما، اس بار یہ بالکل سچ ہے!'' بڑکی نے بسور کر کہا۔ پھر وہ شدید رومانی ہوگئی... خلاؤں میں تکنے لگی۔ ''میرے اور رمیش کے درمیان ایک کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہے ما!'' اس نے اونٹ کی طرح گردن چھت کی طرف اٹھا کر کہا۔

''چپ، چڑیل!'' ما نے ڈانٹا۔ پھر زچ ہوکر بولی، ''دیکھ بڑکی، کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہو یا ایٹمی دھماکا ہو رہا ہو، میں یہاں تجھے رومانس وغیرہ نہیں چلانے دوں گی۔ اور بیاہ! ایک نہیں، ہزار بار کہہ دیا ہے، پہلے پڑھائی، پھر بیاہ۔ تم نے آتے وقت وعدہ کیا تھا کہ روز پڑھو گی۔ سپلیمنٹری آئی ہے۔ لڑکی دسویں فیل! کیا میرے جنم میں ٹھکوائے گی؟''

''میں دسویں پاس کرلوں گی،'' بڑکی چنگھاڑی۔ ''کہا نا!''

''جب سے آئی ہو، میں نے ایک بار تمھیں کتاب کھولتے تک نہیں دیکھا۔ سوٹ کیس بھر کتابیں میں ڈھوکر لائی ہوں۔'' ما کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ بڑکی سہم گئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

''میں رمیش کے ساتھ اس کے گھوڑے پر کل سویرے سیر کے لیے چلی جاؤں؟''

''نہیں!'' ما نے کہا۔ ''اکیلے اس کے ساتھ کہیں جنگلوں میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اور نہ تم شام کو کیقباد کے گھر جاؤ گی۔ اور اب بیاہ کی بات کی تو میں طمانچہ رسید کروں گی تمھارے منھ پر!'' ما نے غصے سے ڈانٹا۔ بڑکی کا منھ اتر گیا۔

بڑکی نے دانت پیس کر کہا، ''اُشا کو پٹا رہے ہیں با۔''

ما نے کوئی جواب نہ دیا۔ زور سے دروازہ بند کرکے چلی آئی۔ بڑکی اس کی راز دار بیٹی تھی۔ با کے ریشہ خطمی ہونے پر وہ مل کر ہنس سکتی تھیں۔ لیکن ما کو کوفت بھی ہوتی تھی۔ غصے میں بڑکی نے جان بوجھ کر ما کے چٹکی لی تھی۔ ما با کی حرکتوں پر بڑکی کے آگے شرمندہ ہوگئی۔ بڑکی نے بھی آج اچھی حرکت تو نہ کی تھی۔ یوں چپ چاپ غائب ہو جانا واقعی غیر ذمے داری کی بات تھی۔ حالانکہ بڑکی بچی ہی تو تھی، پھر بھی وہ با کے آگے شرمندہ ہوگئی تھی۔ ملا جلا غصہ اسے بڑکی پر ہی آیا۔

شام تک چیکو کا بخار اتر گیا۔

شام کو کیقباد کے گھر وہ بچوں کو نہ لے گئی۔ اس نے بڑکی سے بات چیت بند رکھی۔ کیقباد وسیع لان میں گجراتی جھولے پر جھول رہے تھے۔ بات لمبی نہ کرنے کے لیے وہ سفر میں کسی کو اپنی جلا وطنی کے بارے میں کچھ نہ بتاتے تھے۔ بس یوں کہہ دیتے تھے کہ دلّی سے آئے ہیں، کسی اسکول کالج میں پڑھاتے ہیں۔ دوسری بار کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ کسی کو کیا پتہ چلتا ہے! ان کے چہرے مہرے، بول چال والے ہزاروں لاکھوں مسلمان تو رہتے تھے انڈیا میں۔

کیقباد پارسی تھے۔ بمبئی میں رہتے تھے۔ ان کے دادا یا پردادا نے یہ ولا بنائی تھی۔ پھر ایرانیان بیکری بن گئی۔ سارے سال دھندا مندا ہوتا ہے، بس سیزن میں رونق ہوتی ہے۔ کیقباد گجراتی پارسی تھے۔ رمیش کے ڈیڈی سے خاندانی دوستی تھی۔ رمیش کے ممی اور ڈیڈی۔ ممی اچھے ولایتی عطر سے مہکتی، سونے کے زیوروں میں دمکتی، کشیدہ ابروؤں کی بیچ چوڑی بندی لگائے ہوئے۔ ڈیڈی لہجے سے میمن معلوم ہو رہے تھے۔ اور ما سے خوش اخلاقی کی بھلی باتیں کرنے کے دوران وہ آپس میں بہ سرعت 'سوں چھے، کیم چھے' کہتے ہوئے تبادلۂ خیالات کرتے جاتے۔ رمیش وہاں کچھ دیر بعد پہنچا تھا اور اب لکڑی کے تختے کی طرح سیدھا بیٹھا تھا۔ چھ مہینے میں بارھویں بار ما نے بڑکی کے پسندیدہ لڑکے کو شوق سے دیکھا۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ سب بڑکی کی بچپنے کی باتیں ہیں، لیکن پھر بھی شوق سے دیکھنے سے باز نہ آئی تھی، بس یوں ہی بیوقوفوں کی طرح۔ لڑکے میں، ماسوا لڑکا ہونے کے، پسند آنے والی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑکی کے لیے تو لڑکے کا لڑکا ہونا کافی تھا۔ لیکن لڑکے تو یہاں پہاڑی پر بہت سے آئے ہوئے تھے۔ پھر آخر رمیش ہی کیوں؟

''تم نے اس کا گھوڑا دیکھا؟ اس کا گھوڑا؟'' بڑکی نے منھ بسور کر تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

''تو گھوڑے سے کر لے بیاہ!'' ما نے پھٹکارا تھا۔ پھر اس نے بڑکی کو سمجھایا:

''یہ گھوڑا وہ ترائی میں نہیں لے جائے گا۔''

مسٹر کیقباد نے کیک پیسٹری کے بعد انھیں سیر کھانڈ کھانے کی دعوت دی۔ گہری زعفرانی مراٹھی میٹھی ڈش، ایک بڑی قاب میں ایک حسین اور جوان لڑکی لے کر آئی۔

خاموش اور پُرسکون لڑکی نے میز پر پیالے اور چمچے قرینے سے رکھے۔ اس کے لبوں پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کم قیمت مگر صاف ستھری ساری باندھ رکھی تھی۔ سیر کھانڈ بہت مزیدار تھا۔

''کس نے بنایا؟'' ما نے شوق سے پوچھا۔

مسٹر کیقباد مسکرائے۔ لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولے:

''گھر کی مالکہ نے، اور کس نے۔''

لڑکی اسی طرح خاموش، پُرسکون مسکراتی رہی۔

مہمان کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ لڑکی برتن لے کر چلی گئی۔ تب شرمندگی مٹانے کے لیے رمیش کے

باپ نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا:

''یہ وار لی لڑکی کب سے ڈال لی؟ ہیں؟''

''یہ؟ یہ تو تین چار سال سے...'' کیقباد ہنسا۔

ماکو یہ بے حیائی لگی۔

''مگر سال میں بس دو مہینے کی بیگم۔ کیا سمجھے؟'' کیقباد نے کہا۔

''اور بچے آئیں تب؟'' رمیش کے ڈیڈی نے پوچھا۔

''او ہو ہو... ہاں!'' کیقباد خوش دلی سے ہنسا۔ ''گائب کر دیتا ہوں اس کو۔ ایک دم گائب۔ زمین کے نیچے۔ ایک دم انڈر گراؤنڈ۔'' وہ اونچا اونچا ہنسنے لگا۔

''کہاں؟ جنگل میں؟'' با اور رمیش کے ڈیڈی خوشی سے ہنس رہے تھے۔ ما اور رمیش کی ممی میزبان کے لحاظ میں کھیسیں کاڑھ رہی تھیں۔ کیقباد نے اپنا داشتہ رکھنے کا راز، مہمانوں کی مرضی کے بغیر، کسی مذاق کی طرح ان کے سر پر دے مارا تھا، اور اب انھیں بھی اس کو مذاق ہی کی طرح لینا تھا۔ رمیش انھیں ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ گناہ اور ڈھٹائی کی یہ دنیا اس کی اپنی معصوم، بھولی بھالی دنیا سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی... یا شاید صرف چند برسوں کے فاصلے پر۔

''غار میں، غار میں،'' کیقباد نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا غار بھی ہیں؟'' ما نے حیرت سے پوچھا۔

''مذاق کرتے ہیں یہ!'' رمیش کے ڈیڈی نے ہنس کر کہا۔

''پن غار تو ہیں،'' کیقباد نے ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''برابر ہیں۔ غار کیوں نئیں ہوں گے!'' اس نے کہا۔

اور اگر بچہ ٹھہر جائے... تب؟''

ما نے یہ سوال دیر تک چپ رہنے کے بعد با سے پوچھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ تیزی سے ادلتی بدلتی پگڈنڈیوں پر اپنی ولا کی طرف آ رہے تھے۔ جب وہ کیقباد کے گھر سے رخصت ہوئے تھے تب صاف اجالا تھا۔ پگڈنڈی کا ایک موڑ کاٹا اور اچانک اندھیرا، گویا وہ وقت کے کسی علاقے کو اچانک پار کر گئے

ہوں۔ سورج اچانک ڈوب گیا، جیسے پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساتھ لائی ٹارچ کام آئی۔ اب وہ سوئے ہوئے درختوں کی شاخیں احتیاط سے پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ درختوں کے تنوں اور اندھیرے پتوں کے پراسرار گچھوں میں خوابیدہ جانداروں کو اچانک بیدار کرنے سے خوفزدہ۔ فاصلے سے ولا کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بج رہا تھا۔

انتظام کرتے ہیں...'' ذرا توقف کے بعد اندھیرے میں با کی آواز آئی۔ ''رکھیلوں کے ساتھ کچھ انتظام تو کرنا پڑتا ہے،'' با نے سکون سے کہا۔ اس کی آواز میں پُراعتماد دنیاداری تھی۔ ما پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا پیر رپٹ رہا تھا۔ لیکن اسے سہارا کون دیتا! اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو ما اس کی بانہہ تھام کر جلد سے سے جلد ولا پہنچ جاتی۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔ چیکو کو پھر سے بخار تو نہیں ہو گیا۔ ایک اور موڑ کاٹا تو سامنے واقعی بھوت سا نظر آیا۔ ٹارچ کی روشنی دو مردانہ قدموں پر پڑی۔ با نے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ ارے سوا جی!

سوا جی ٹنکی والا چپ چپاتے ولا کی طرف جا رہا تھا۔

''اس وقت کہاں؟'' با نے دوستی سے پوچھا۔ وہ محنت کش طبقے کے ہر آدمی سے پل بھر میں دوستی کر سکتا تھا، کوئی ایسا گُر آتا تھا اسے۔

ما نے جلدی سے بات بنائی۔ ''ٹنکی چلا کر آ رہا ہوگا۔ پانی ختم ہو جاتا ہے شام تک۔''

سوا جی کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہے۔ وہ آ رہا تھا کہ جا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمکیں موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں آپ کو دوسرا راستہ بتاتا ہوں۔ یہ بہت لمبا ہے۔ چلیے میرے ساتھ۔''

وہ انھیں ایک چھوٹے مگر زیادہ مشکل راستے پر لے چلا۔ لمبے ڈگ بھرتی ما سب سے آگے نکل گئی۔ وہ ڈال پکڑ پکڑ کر جلد سے جلد اوپر پہنچنا چاہ رہی تھی۔ شاید ڈال ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پل بھر میں وہ سوا جی کی بانہوں میں تھی، جس نے ما کو کھٹ سے جھیل لیا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ الگ ہو چکے تھے۔ ما کے نتھنوں میں پسینے اور میل کچیل کی ملی جلی مردانہ خوشبو رہ گئی تھی۔ کوئی پرندہ گھونسلا ہل جانے سے بے چینی اور وحشت سے پھڑ پھڑایا۔ لیکن اب وہ ولا تک پہنچ ہی چکے تھے۔ شاخوں میں تقریباً جھولتی، لمبے سے لمبے قدم بڑھاتی، وہ ولا کے احاطے کے اجالے تک پہنچی۔

برآمدے کے بلب کی کمزور روشنی احاطے میں پھیلی تھی۔ اُشا جھولے پر، اس کی گود میں چیکو۔ اُشا چیکو کو کھانا کھلا رہی تھی۔

''بخار تو نہیں ہوا اسے؟'' اس کی طرف لپکتے ہوئے ما نے پکارا۔ کتنی اچھی تھی اُشا! کیسے پیار سے سنبھالے بیٹھی تھی چیکو کو۔ لمحے بھر کو اُشا کی گود میں چیکو، ما کی آنکھ میں تصویر سا بنا۔ لگتا ہے جیسے یہی اس کی ماں ہے! یہ خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمک کر غائب ہوا۔ وہ ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔

''نہیں بائی،'' اُشا نے چیکو کو ما کی گود میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے لیے کھانا لانے چلی گئی۔

جگنو ابھی تک احاطے میں نہ اترے تھے۔ نو ساڑھے نو کے بعد جیسے گھڑی دیکھ کر ان کے دَل کے دَل احاطے میں راس رچانے آتے تھے۔ ِککلی کمرے میں تھی۔ پتہ چلا، ان کے نکلنے کے فوراً بعد رمیش سفید گھوڑے پر سوار آیا تھا۔ اس نے بڑکی کو اپنے ساتھ سیر پر لے جانا چاہا، مگر اُشا اور ِککلی نے بڑکی کو نہیں جانے دیا۔ ِککلی بڑکی کی قمیص سے لٹک گئی تھی۔

''نہیں! ما نے منع کیا ہے۔''

اوہو! تبھی تختہ بنا بیٹھا تھا لڑکا، ما نے سوچا۔ یہاں سے نامراد وہ کیقباد کے گھر آیا تھا۔ مگر راستے میں وہ انھیں نظر کیوں نہ آیا؟ شاید کوئی دوسرا راستہ لے لیا ہو، اس نے قیاس کیا۔ اس عمر میں کیا مشکل ہے ایک سے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالنا۔

غصے اور گھٹن سے بڑکی دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ اب دور جامنوں کے جھنڈ کے عین نیچے غصے سے پیر پٹک پٹک کر دیوانہ وار ٹہل رہی تھی۔ اسے لنگوروں تک سے ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اور جو کوئی لنگور اس لنگوری پر چھلانگ لگا دے تب؟ ما نے گھبرا کر سوچا۔ اس نے آواز میں غصہ بھر کر بڑکی کو پکارا، ''یہاں آ و نا ہنجار۔''

پہلے وہ نہ آئی۔ یونہی پیر پٹکتی ٹہلتی رہی۔ لیکن جب ایک لنگور سچ مچ کھڑبڑایا تو وہ بھاگی۔

لیکن دو گلاس پانی پی کر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ منھ بھر بھر کر چیونگم چباتی رہی، جو وہ جامنوں کے جھنڈ کے نیچے جانے کب سے چبا اور تھوک رہی تھی۔

''یہ آپ لوگ... کس قدر فراڈ ہیں آپ لوگ!'' وہ تلملائی، ''ڈیموکریسی... آپ لوگ ڈیموکریسی چاہتے ہیں؟ ڈکٹیٹر ہیں آپ! ڈک ٹے ٹر!'' اس نے میز پر مکے مارے۔ ''سب فراڈ!'' اس نے کہا۔

ما نے پتھریلی برفیلی سرد مہری اختیار کی۔ برف کی سل کی طرح خاموش ہوگئی۔

ولا میں با اکیلا ہی آیا تھا۔ ''سوا جی نہیں آیا۔ کہتا تھا، واپس چلا جاؤں گا،'' با نے بتایا۔

''ہوں،'' ما نے کہا اور برآمدے کی بتی کی طرف دیکھا جسے وہ کھانا کھانے کے بعد بجھا دے گی۔

بڑکی کھانے پر نہ آئی۔ ما نے بھی نہ بلایا۔ ایک رات کھانا نہ کھانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا، ما نے کٹھور پن سے سوچا۔

ِککلی کو سلا کر خبروں کے لیے ٹرانزسٹر لگایا۔ بھیونڈی کے فسادات کا ذکر نہ تھا۔ کئی منتری کئی دوسرے منتریوں سے ملے تھے۔ ان کی ہی کتھا سناتی رہی نیوز ریڈر۔ ما اور با نے اطمینان کا سانس لیا۔

''ختم ہو گئے ہوں گے فساد،'' با نے پُر امید ہو کر کہا۔ ''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

''کپڑا منتری رکھشا منتری سے ملے،'' نیوز ریڈر نے کہا۔ ما اور با پل بھر خاموش رہے اور پھر زور سے ہنس پڑے۔ انھوں نے چشمِ تصور سے ایک کپڑے کا گڈا اور ایک رکشا چلاتا آدمی دیکھا تھا۔ ان لفظوں سے ان کی زندگی بھر کی دوسری طرح کی پہچان انھیں ایسا ہی دکھا سکتی تھی۔

کمرے میں بستر پر با کے ساتھ۔ (ما نے برآمدے کی بتی بجھا دی تھی۔) جب انھیں یقین ہو گیا کہ پورا سنسار سو چکا ہے، تب انھوں نے اپنی بیدار خوابیاں کیں۔ ما نے اپنے آپ کو سوا جی ٹنکی والے کے سپرد کیا۔ ایک پل کے سیس لانگ، ایڑی سے چوٹی تک کے لمس میں اس پر یہ حیران کن انکشاف ہوا تھا کہ صرف دیکھنے ہی میں نہیں، چھونے میں بھی سوا جی ٹنکی والا با کے جڑواں بھائی جیسا تھا... وہی لانبا قد بت، چکلی چھاتی، لمبی لمبی ٹانگیں اور گٹھی بانہیں۔ ہاں، مگر وہ با نہ تھا۔ وہ اس کے سنگ جو چاہے کرے... انھیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کی ضرورت نہ تھی... بس ایک بدن تھا... اس مَتھن سے بچہ بھی نہیں ہوگا، ما نے سکون سے سوچا تھا۔

با نے اُشا کے سنگ... انجام دیے۔ پھر اس نے ما کی طرف دیکھا۔ ما ہموار سانس لیتی لیٹی رہی۔ اب با کیا کرے گا؟ اس نے شدید تجسس سے سوچا۔ تصور میں دوسرے آدمی کے ساتھ ہو کر ما کا دل پُر سکون ہو گیا تھا۔

با بستر سے اٹھا۔ ٹٹول کر چپل پہنے اور ذرا سی بھی آواز کیے بغیر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ما اندھیرے میں جی بھر کر مسکرائی۔ تھوڑی دیر میں فاصلے سے دبی دبی آوازیں۔ ذرا سی دیر میں با واپس آ چکا تھا۔ اس کا سارا اعتماد کہیں چکنا چور ہو گیا تھا۔ پھوہڑ پن سے دروازہ کھولا تو اندھیرے میں زور

سے چرچراہٹ ہوئی۔

''کیا ہے؟'' ما نے سوتی آواز بنا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں... باتھ روم'' با نے ہڑبڑا کر کہا۔

ما نے لمبی سانس لی۔ تو معلوم ہو گیا با کو، اُشا کی کوٹھڑی میں کون ہے! اس نے دل میں ہنس کر سوچا۔ تھوڑی دیر میں دونوں سو گئے۔

بدھوار۔

''اب میری باری،'' ما نے کہا۔

اس نے بچوں کی ایک نہ سنی تھی۔ بڑکی پر برفیلی نظریں ڈالی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ ایک دن صرف اپنے لیے نکال ہی لیتی تھی۔ ہر بات میں تھوڑے سے، بالشت بھر حصے پر میرا بھی حق ہے، برسوں پہلے اس نے منصفی سے فیصلہ کیا تھا۔ ما نے پہاڑ گھومنے کا یہ دن چنا تھا۔ چیکو ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا اور فرش پر کھیل رہا تھا۔ کِکلی جھولے پر بیٹھی تھی۔ بڑکی منھ تھتھائے بستر میں پڑی چھت کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔ ما نے ذرا پروا نہ کی۔ وہ با کو ساتھ لے کر نکل کھڑی ہوئی۔

چھوٹی بڑی سات پہاڑیاں تھیں جنھیں ملا کر یہ پہاڑی اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ ولا ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ پگڈنڈیوں سے اترتے اور چڑھتے وہ سب سے اونچی پہاڑی کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔

بس اسٹاپ پر وارلی عورتیں اور مرد قلی، بسوں میں سامان لادتے ہوئے۔ جانے کیوں ما کو لگا جیسے اچانک کئی سیاح واپس جا رہے ہوں۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے انھوں نے کاشٹے کے لنگوٹ باندھے وارلی عورتوں کو ایک قطار میں بوجھ ڈھوتے دیکھا۔ ما ان سے باتیں کرنے لگی۔

''آج شاید بارش ہو،'' اس نے آسمان پر اودے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

''بارش؟ ابھی کہاں!'' قلی عورت نے کہا۔ ''یہ مہینہ جائے، تب بارش ہوگی۔ تب تو یہاں آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔''

''کیوں؟'' ما نے حیرت سے کہا۔ ''پہاڑ پر تو بارش بہت اچھی دِکھتی ہوگی؟''

''اس پہاڑ پر نہیں!'' وارلی عورت ہنسی۔''بارش ہوگی نا بائی، تو یہ ساری مٹی بہہ جائے گی۔'' اس نے سرخ مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ما اور وارلی آدھی بات اشاروں میں کرتے تھے۔

''کیا سچ مچ؟ واقعی؟''

''ہاں مٹی بہہ جاتی ہے۔ پتھر نکل آتا ہے پتھر۔''

تبھی شاید یہاں کچھ اگتا نہیں، ما نے حیرت اور کچھ تاسف سے سوچا۔ جامنوں کے جھنڈ اور اکا دکا جھاڑ جھنکاڑ کے سوا، ان پہاڑوں پر ہریالی نہ تھی۔ ما نے چشم تصور سے ساری سرخ مٹی کو بہہ جاتے دیکھا۔ اس نے تصور کیا جیسے پہاڑ کی سفید سفید ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ جیسے بدن سے سرخ گوشت کی پرت ہٹ جائے۔ شاید ایسا نہ ہوتا ہوگا۔ اس نے خیال کیا۔ پہاڑ کی چوٹی سے، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر، ما نے دور دور نظر دوڑائی۔ چاروں طرف مہاراشٹر کے مغرور، بنجر، باسالٹ کے اونچے ہیبت ناک پہاڑ اپنی قدیم خاموشی میں کھڑے تھے... دور دور تک پانی کا، کسی ندی نالے کا نام نشان نہ تھا۔

''تب پانی کہاں سے آتا ہے یہاں؟'' اس نے سرگوشی میں گویا خود سے پوچھا۔

''کنواں کھودتے ہیں،'' سواجی ٹنکی والے نے بتایا تھا۔

''اور یہ اتنے گھنے ترائی کے جنگل؟''

''مون سون!'' بمبئی میں، سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ گوینکر نے بتایا،''اسی کارن مراٹھے جنگجو بن گئے۔ یہ علاقہ زرخیز نہ تھا۔''

''غیرت کے مارے نہیں؟''

وہ ہنسے۔''پتہ نہیں!'' پھر انھوں نے کہا،''غیرت تو سب میں ہوتی ہوگی۔ میرا مطلب ہے زرخیز میدانی علاقوں میں بھی۔ لیکن وہاں کے لوگ جنگجو نہیں ہوتے۔ اب اپنے پنجاب ہی کو لیجیے۔ اتہاس میں مستقل باہر کے لوگ حکومتیں کرتے رہے وہاں۔ اور مضبوط ہاڑ کے پنجابیوں نے انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ ذرا بھی نہ لڑے۔ تو کیوں؟''

''کیوں نہ لڑے پنجابی؟'' ما نے خود کلامی سی کی۔

''زمین زرخیز تھی،'' گوینکر ہنسنے لگے۔''یہ تھی اصل وجہ، نہ لڑنے کی!

''پھر سترھویں صدی میں اسی سرزمین سے سواجی مرہٹہ اٹھا اور طوفان کی طرح ہندوستان پر چھا گیا،

مغلوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا۔''

''عجیب وغریب تحریک تھی!'' کتابوں میں پڑھی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے ما نے تبصرہ کیا تھا۔ اسے سواجی کا دھوکے سے اورنگزیب کے سپہ سالار، فضل خان کو قتل کرنا یاد آیا۔ مغلوں کے اس ہندوستانی سپہ سالار سے معانقہ کیا تھا سواجی نے، اور پشت میں خنجر گھونپ دیا تھا۔

''ایک ہی حضرت تھے سواجی بھی!''

''اوہ! وہ...'' گوینکر ہنسے، ''سو تو ہر مراٹھی ہندو، اور ہر مسلمان کو آج بھی یاد ہے۔''

''مگر جے سنگھ کے ہاتھوں سواجی کی شکست کسی کو یاد نہیں،'' ما نے تبصرہ کیا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ ان جنگوں کو مذہبی رنگ میں نہ دیکھا جائے۔ (لیکن اس کی دلی تمنا کی کسے پروا ہوسکتی تھی؟) سواجی نے ہندو دھرم ہی کا نعرہ بلند کیا تھا... دیش کی آزادی کا، گئو رکھشا کا، ہندو دھرم کا، مراٹھا گوریلے نے باہمنوں کا شودروں تک کے ساتھ ملاپ کرا دیا تھا۔ کیسا رومانی کردار تھا سواجی کا! جے سنگھ کے ہاتھوں گرفتار ہوکر اورنگزیب کی قید سے پھلوں کی ٹوکری میں چھپ کر فرار ہونے والا نڈر، زیرک، پھرتیلا، جنگجو! پھر کیا تعجب ہے کہ مراٹھی مائیں اپنے بیٹوں کا نام سواجی رکھتی ہیں! اگر وہ مراٹھن ہوتی تب؟ لیکن اس کے دل نے کہا کہ وہ چیکو کا نام سواجی کبھی نہ رکھتی۔ لڑائی جھگڑے اسے پسند ہی نہ تھے۔ کیا رکھتی وہ چیکو کا نام، اگر وہ مراٹھن ہوتی تب؟

''گیان ایشور،'' گوینکر نے مدد کی، ''شاعر تھے۔ بھگوت گیتا کا مراٹھی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح مراٹھی زبان کی نوک پلک ٹھیک ہوئی۔ عجب اتفاق تو یہ ہے...'' انھوں نے کہا، ''سواجی سے دو صدی پہلے بھگتی تحریک ہندوستان کے انھی پچھمی گھاٹوں سے نکلی، اسی علاقے سے جسے آج مہاراشٹر کہتے ہیں۔ گیتا کو مراٹھوں نے سنسکرت سے پہلی بار عوامی بولی میں لکھا اور اس کا پیغام تھا محبت۔''

''گیان ایشور باہمن تھا؟'' ما نے تجسس سے پوچھا، ''آریہ؟''

''ارے نہیں بھئی، سب برہمن آریہ کہاں تھے! کتنے ہی تو یہی آدی واسی ہیں۔''

''آدی واسی؟ وہ باہمن کیسے ہو گئے؟''

''قبیلوں کے سردار بن جاتے تھے باہمن،'' گوینکر نے سمجھایا، ''باہمنوں کو پیسے دے دلا کر۔'' (سیدھی سی بات تھی۔ ما کی سمجھ میں کیوں نہ آئی؟) ''ایک بڑا سا سونے کا برتن بنایا جاتا تھا۔ گویا سمجھو

گربھ۔ سردار کو اس میں بٹھایا جاتا۔ بڑا سا یگیہ ہوتا۔ پھر سردار باہر نکلتا، گویا دوبارہ پیدا ہو رہا ہے۔ بس، بن گیا برہمن! اسے ہرنیہ گربھ کہتے تھے۔ یعنی سونے کا گربھ۔''

''اہا، جاتی بدل جاتی تھی!'' ما نے خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ بڑبڑائی، ''ہماری طرف بھی کئی شیخ پاکستان جا کر سید ہو گئے۔''

''تب آدی واسی ہندوؤں سے مل گئے ہیں کیا؟'' اس نے سوچ سوچ کر کہا۔

''بے شمار۔''

''شودر ہو کر؟''

''نہیں تو! کتنے ہی تو سورن ہندوؤں میں شامل ہیں۔''

وہ سوچتی رہی۔ الغرض کہ ایک لمبی چوڑی کھچڑی پک چکی ہے... بلکہ کھچڑا...

''تو پھر یہ کون ہیں؟ یہ آدی واسی؟''

''یہ جو رہ گئے۔''

سواجی کی ہندو دھرم کی تحریک کا ساتھ باقی ہندوؤں نے نہ دیا... کیوں نہ دیا؟ ایک باریک سا الجھاوا تھا... ایک قسم کا کیچ ٹوئنٹی ٹو۔ مراٹھوں کی نظر میں ہندو ہونا اور مراٹھا ہونا ایک ہی بات تھی، سو اسی لیے دوسرے علاقوں کے ہندوؤں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔

''کیا جواب دیا؟''

''انھوں نے کہا: ہشت!''

''تب پھر جو اگر سب کھچڑا ہے تو یہ جو تحریکیں چلتی ہیں کہ ہم ہی سب سے بہتر اور خالص اور اعلیٰ...''

''گدھا پن ہے!'' گوینکر مونگ پھلی کھانے لگے۔ پھر انھوں نے ما کو تسلی دی۔ ''کبھی کبھی لوگوں پر سوار ہو جاتا ہے۔''

ما نے مایوسی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ما سے بہتر کون جان سکتا تھا؟ ما تو پاکستانی تھی۔

لیکن یہ سب باتیں تو ہفتوں بعد بمبئی میں ہوئی تھیں۔ اس وقت تو ما نے صرف ایک لمبی نظر ان پہاڑوں پر ڈالی تھی جو کبھی کسی سمت رواں لاوے کی اچانک منجمد ہو جانے والی لہروں کی طرح ٹھٹکے کھڑے تھے، اور

اداسی سے واپس لوٹنے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا دل اتنا بھاری کیوں ہے... جب تک ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا نہ گزرا۔ کب سے اس کی نظر جامن کے تنے سے پھوٹتی شاخ پر لگی تھی۔ ہوا سرسراتی گزری تو بھاری گہرے کاہی رنگ کے پرانے پتوں پر اثر نہ ہوا۔ بس ایک نوخیز بلکہ دھانی رنگ کا پتہ مضراب سے چھڑے تار کی طرح شدت سے لرزنے لگا۔ ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کی آنکھوں میں پانی امڈ آیا۔ ''بڑکی...'' اس نے سوچا، ''بڑکی...'' اور پچاسویں بار اپنی بیٹی کو کبھی نہ ڈانٹنے کا عہد کیا... جسے وہ نبھا نہ سکے گی۔

با آگے آگے جا رہا تھا۔ اُشا کی کوٹھڑی میں سوا جی کو دیکھ کر اس کی ہمت پست نہ ہوئی تھی۔ دوسری بار سوچنے پر تو موقع اور بھی شاندار تھا۔ جبکہ عورت ہے ہی ایسی، تو پھر اب کیا مشکل تھی! اب تو مسئلہ صرف سوا جی کو ایک آدھ دن کے لیے کسی بہانے اِدھر اُدھر کر دینے کا تھا۔ اس کا ذہن ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

ما سر جھکائے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی... پریشان اور اکتائی ہوئی عورت! پہاڑ کی خوشگوار اوزون بھری ہوا نے بڑکی اور با کی جسمانی امنگوں کو بے مہار کر دیا تھا جو سرپٹ دوڑی جا رہی تھیں، اور ان میں کسی کا بھی رخ اس کے ذہنی سکون اور اس کے وجود کے اثبات کی طرف نہ تھا۔ دو رات پہلے ہی بیوقوف بڑکی مکالمے بول رہی تھی:

''آپ تو با کے ساتھ آئی ہیں۔ اور میں؟ میں کس کے ساتھ آئی ہوں؟''

''بھئی، اپنے بہن بھائی کے ساتھ۔''

''اونہوں، اس سے کیا ہوتا ہے!'' بڑکی شرمندہ ہو کر اور بھی جھنجھلائی تھی۔ ''آپ تو ان سب کے ساتھ آئی ہیں۔'' اس کی نظر میں فی الحال دنیا جوڑے جوڑنے کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔

''میں کسی کے بھی ساتھ نہیں آئی ہوں،'' ما نے کہنا چاہا تھا۔

ٹنکی جل گئی... پانی کی ٹنکی۔ صبح سویرے با اور سوا جی وِلا کی چھت سے لٹکے ٹنکی میں ہاتھ ڈال ڈال کر کوئی اسکرو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیچے وہ سب کھڑے تھے، اُشا، ما اور تینوں بچے۔ با اور سوا جی کے آدھے دھڑ ٹنکی میں گھسے ہوئے تھے۔ وہ سب آنکھوں پر سایہ کیے اوپر تک رہے تھے جہاں چار لمبی ننگی مردانہ ٹانگیں الجھ رہی تھیں... سانولی، لمبی بالوں بھری ٹانگیں۔

بہر حال، ما با کی ٹانگوں کو پہچان سکتی تھی (گو وہ اس سے کوئی دلی مسرت محسوس کرنے سے قاصر تھی)۔ کیا اُشا پہچان سکتی ہے؟ اس نے تجسس سے اُشا کو تاکا اور مایوسی سے محسوس کیا کہ اُشا کا چہرہ پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس کے خیالات کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ کب نفرت محسوس کرتی ہے، کس سے محبت کرتی ہے، کس بات سے خوش ہوتی ہے، کس بات پر اسے غصہ آتا ہے... ما یہ سب بالکل نہیں سمجھ پائی تھی۔ اس کے چہرے پر سدا یکساں شانت تاثر رہتا۔

لیکن با کی مراد بر آئی تھی۔ چھت سے چھلانگ لگا کر، کمرے کی منڈیر پر کھڑے ہوکر اس نے اعلان کیا کہ ٹنکی ٹھیک ہونے کے لیے جن فاضل پرزوں کی ضرورت ہے — اور جو جل گئے ہیں — وہ اس پہاڑ پر دستیاب نہیں ہو سکتے، لہٰذا سوا جی کو ترائی میں قریب ترین اسٹیشن جانا پڑے گا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے، جب دو مردوں کے آدھے دھڑ ٹنکی میں گھسے تھے اور ان کے الٹے لٹکے سروں کے نیچے تاریک پانی بلبلے بنا رہا تھا، تب انھوں نے کیا باتیں کی تھیں، اور با نے سوا جی کو کیا پٹی پڑھائی تھی۔ یوں بھی اُشا کون سی سوا جی کی بیاہتا تھی۔ وہ تو سوا جی کی محبوبہ بھی شاید نہ تھی۔ سوا جی یونہی اس کے پاس آ جاتا تھا۔ جو روپے با نے دوڑ کر اسے کمرے سے لاکر دیے، اس کو شاید مفت میں مل گئے۔ دھوتی کا لنگوٹ کسے، سوا جی ہنستا مسکراتا ولا کی ڈھلان اتر گیا، جامنوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ بچے سیر پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

''پانی زور لگا کر کھینچنے سے پہاڑی پر مشین بار بار جل جاتی ہے بائی،'' اُشا نے ما سے کہا۔

''پہلے بھی جلی ہے کیا؟''

''ارے ہاں، بہت بار!''

''تب تم پانی کہاں سے لاتی ہو؟''

''نیچے سے، کنواں ہے وہاں۔''

''اچھا تو...'' ما نے فیصلہ کیا، ''ہم تم دونوں نیچے کپڑے دھونے چلیں گے۔ با بچوں کو اکیلے سیر کرا لے گا۔''

اُشا اور ما احاطے میں کھڑے تھے۔ بڑی بڑی ہلکی بھوری آنکھوں والا ایک بھورا سا لنگور، بے تحاشا لمبی دم سانپ کی طرح پھٹکارتا، عین ان کے سامنے زمین پر دھم سے کودا۔ ہلکی سی چیخیں مار کر دونوں عورتیں پیچھے کی طرف دوڑیں۔ محفوظ فاصلے سے جھانک کر دیکھا تو لنگور زمین پر قلابازیاں سی لگا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہا ہے؟'' ما حیران تھی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا۔ لنگور کے منھ پر چیونگم تھپا ہوا تھا۔ اس

کے ہاتھ پر بھی چیونگم سن گیا تھا۔ ربڑ کی لمبی سی تار کی طرح لنگور بار بار اسے منھ کے نزدیک لاتا اور دور لے جاتا۔ تار اور بھی لمبا ہوتا جاتا۔ ذرا سی دیر میں لنگور نے اپنے آپ کو چیونگم کی ڈوریوں میں باندھ لیا۔

ما تھوڑی دیر دیکھا کی، پھر ہنسی سے دوہری ہوگئی۔ بڑکی کے تھو کے چیونگم... جامنوں کے نیچے... اسے یاد آیا۔

یہ لنگور با ہے، اس نے سوچا اور یہ چیونگم... یہ چیونگم... میں۔

با کی ایک نہ چلی۔ بچوں کو اسے اکیلے ہی گھمانے لے جانا پڑا۔ دونوں عورتیں میلے کپڑوں کی بالٹیاں سنبھالے پہاڑی اترنے لگیں۔ جب وہ ریلوے اسٹیشن جانے والی پکی سڑک تک پہنچیں تو انھیں عینک پوش رمیش اپنے سفید گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ ما اور اُشا خبردار ہوگئیں۔ انھوں نے راستے سے ہی خطرے کو لوٹا دیا۔ ''بڑکی با کے ساتھ بازار گئی ہے۔ آج نہ مل سکے گی،'' انھوں نے کہا۔ مایوس لڑکا سر لٹکا کر واپس جانے لگا، لیکن وہ گھوڑا موڑ کر پھر واپس آیا۔

''آنٹی، یہ بہت ضروری تھا۔ دراصل ہم... واپس جا رہے ہیں۔''

ما حیران ہوئی۔ حالانکہ اس کے دل سے بوجھ سا ہٹ گیا۔ شدید مطمئن ہوگئی ما۔ چلو ایک طرف سے تو فرصت ہوئی، اس نے سوچا۔

''ایسا تو تمھارے ممی ڈیڈی کا پروگرام نہ تھا؟'' ما نے کہا۔

''نہیں، لیکن... بمبئی سے فون آیا ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے،'' اس نے کچھ جھجک کر کہا۔ پھر اس نے جیب سے کاغذ نکالا۔ ''میرا ایڈریس ہے آنٹی، دے دیں گی نا آپ اس کو؟'' اس نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔ ما کا دل پگھل گیا۔ ''ضرور،'' اس نے کہا، اور کاغذ تہہ کر کے اپنے بلاؤز میں رکھ لیا۔ بمبئی میں تو ہرگز نہیں، اس نے دل میں سوچا، مگر دلّی پہنچنے پر وہ پتہ بڑکی کو دے دے گی۔ پھر اس نے اضافہ کیا، سپلیمنٹری کے بعد بھلے ہی قلمی دوستی کرے۔

''کیا آج ہی جا رہے ہو؟''

''ہاں، شاید آج ہی۔''

ما نے کچھ سوچ کر کہا، ''وہ لوگ بڑی مال روڈ پر گئے ہیں۔''

''تھینک یو آنٹی!'' رمیش نے ایڑ لگائی اور مشاقی سے اپنا شاندار گھوڑا دوڑاتا راستوں کے پیچ و خم

میں اوجھل ہوگیا۔ رمیش کو دھوکا دے کر (کیونکہ وہ لوگ کسی دوسری طرف گئے تھے)، یہاں بڑکی اور اس کی ملاقات کا امکان ختم کر کے دونوں عورتیں کچے راستوں سے سڑک سے نیچے اترنے لگیں۔ ما کو پہاڑی سے اس طرح اترنا نہ آتا تھا، جبکہ اُشا ہرنی کی طرح چھلانگیں لگا سکتی تھی۔ ما بار بار اُشا کا سہارا لیتی۔ کون اس بات کو سمجھے گا اور جانے گا کہ سرخ پہاڑ کی پوری مشکل ڈھلان ما نے اُشا کے سہارے طے کی۔

نیچے شاید کبھی ڈائنامائٹ سے پتھر اڑا کر شگاف ڈالے گئے تھے۔ وہ جیسے جیسے نیچے جا رہی تھیں، ہریالی بالکل ختم ہوتی جاتی تھی۔ ان کے چاروں طرف سرخ پتھروں کے شگاف بڑے بڑے دہانے کھولے ہوئے تھے۔ اس منظر میں خوبصورتی نہیں، ہیبت سی تھی، جو آدی واسی عورتوں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں کی آمد و رفت سے دب جاتی تھی۔ درمیانی شگاف کے بالکل تلے میں ایک بڑا تالاب سا تھا۔ کیا اسی کو کنواں کہتے تھے یہ لوگ؟

''کیا یہ بارش کا پانی ہے؟''

''نہیں، تازہ۔ برسات کا پانی تو مٹی میں پڑ کر دَھتیلا ہو جاتا ہے بائی۔ پینے جیسا نہیں رہتا۔ ادھر کی مٹی میں دھات ہے دھات، لوہا۔''

یہ لوہے کے پہاڑ ہیں! ما نے گرتے پڑتے سوچا۔ اس بنجر زمین سے روزی اینچتے یہ لوہے کے لوگ؟ اس نے خیال کیا۔ اور پھر اسے کچھ باتیں یاد آئیں۔

نسروانجی کے فورمین نے انھیں بلایا تھا۔ ژپر چیتیا... اور کون تھا؟ آٹھ دس دوسرے، بائی۔ مٹی کو روند کر نرم کرنے کے لیے۔ پانی پینے بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ حرامزادے، گھر سے پانی پی کر کیوں نہیں آتے؟ سورج ڈوبنے لگا۔ بیل کھیتوں سے نکل گئے۔ پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے۔ ژپر نے کہا، کیسے رکھیں انھیں اس زمین پر؟ کانٹے ہیں... بہت کانٹے ہیں یہاں۔ کھاتے دار کے مہتا نے سن لیا۔ ژپر کو ہل سے جوت دیا بائی۔ ژپر تو بالکل سوکھا تھا۔ ہل کا بھار! نہیں چل سکا۔ مہتا نے بھالے سے چھید دیا۔ رکت ہی رکت اُبل رہا تھا۔ ژپر نے دو بار پورے کھیت کا چکر لگایا۔ رکت مٹی میں مل گیا سارا۔ لال ہی لال ہو رہا تھا کھیت۔

کندھوں پر پیر رکھ کر دبا دیتے تھے۔ دو آدمی دونوں کندھوں سے لٹک جاتے... جھولنے لگتے۔ وارلی گر جاتا... سب کچھ مان جاتا...

جانو کے بھائی کو زندہ گاڑ دیا تھا۔ جانو کے بھائی کی عورت پر آنکھ تھی۔ کھاتے دار کے آدمی لینے

آ ئے تھے۔ جانو کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ عورت نے جانے کی مرضی نہ دکھائی۔ بال سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ شور سے سب آدی واسی گھروں سے نکل آئے۔ آگ کی روشنی میں دیکھ رہے تھے... چپ چاپ۔ اسے لے گئے۔ ہم تو سر جھکا کر روتے ہوئے اپنے اپنے جھونپڑوں میں آ گئے۔ دوسرے دن اس کا آدمی لوٹا۔ اس کی عورت کہاں گئی؟ اس نے کار بھاریوں کو بلایا... بستی کے بڈھوں کو۔ کھاتے داروں نے گڑھا کھودا... آدمی کو زندہ گاڑا... سب کے سامنے۔ جانو بچ گیا۔ جانو اور اس کی بھابی بستی سے بھاگ گئے تھے۔ کھاتے دار کہتا تھا، کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو ٹانگ اور بازو کاٹ لیں گے۔ پھر بھی بات نکل گئی۔ انگریز کا زمانہ تھا بائی۔ اسپتال کے ڈاکٹر آئے... پولیس آئی... گڑھا کھود کر ہڈیاں نکالیں۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا، جانور کے ہاڑ ہیں.... کھاتے دار کو کون کچھ کہتا؟

وارلیوں کو کھیت پر مار... معاملت دار اور تلاٹھی ان کے اپنے تھے۔ مہتا سخت گیر، کہیں سے لاتے تھے مہتا۔ اتر کے بھیّے ہوتے تھے... اور پٹھان... شریف خان کا نام سن کر وارلی کا پیشاب نکل جاتا تھا۔ ہانک کر تھانے لے جاتے تھے۔ مہینوں بند پڑے رہتے۔ ان کی عورتیں دوسروں سے بچے کے ساتھ ہو جاتیں۔ ان کے بچے مر جاتے... بیمار ہو کر اور بھوکے رہ کر...

کھاتے دار برجور کی زمینیں دھانوری گرام کے پاس تھیں۔ زمینیں کس کی تھیں، کون جانے؟ وارلیوں کی تھیں بائی۔ اکال پڑا تو آٹھ آٹھ آنے ایکڑ خرید لی تھیں کھاتے داروں نے۔ پانچ سیر چاول پر پوری زمین خرید لی تھی بائی۔ کھاتوں میں دیکھ لو۔ پرانے کھاتوں میں سب لکھا ہے...

برجور کی زمین پر معاملت دار سالوی ٹھہرتا تھا... دوسرے وردی والوں کے ساتھ۔ برجور سیٹھ کے گھر وارلیوں کو بلایا گیا۔ تمھارے پاس بندوق ہے؟ انھوں نے پوچھا۔ وارلی بندوق نہیں جانتے تھے۔ پن فوج میں جو گئے تھے، ان کے پاس ہوگی۔ وہ یہاں کہاں تھے؟ وہ نھو گھراٹ کو گھیر کر لے گئے۔ نھو کو مرغا بنا دیا۔ اس کی لنگوٹی اتار لی... مٹی کا تیل ڈال دیا... آگ لگا دی بائی۔ نھو گھراٹ جانور جیسا رو رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا چاروں طرف۔ ارے بندوق تو میرے دادا، پردادا، سگڑ دادا، نگڑ دادا کے پاس بھی نہیں تھی۔ کہاں سے نکالوں؟ وہ اَدھ موا ہو کر گر گیا۔ رات بھر نھو گھراٹ وہیں پڑا رہا۔ برجور سیٹھ معاملت دار سے کہہ رہا تھا، ٹھیک مار نہیں دی!... ڈنڈا ڈال کر ذرا ٹھونکتے، ایک چھوڑ دو بندوقیں نکل پڑتیں۔

سچی بات بتاؤں... چھوٹے وردی والے تک منھ چھپا چھپا کر رو رہے تھے۔ جب وہ اس کی ادھ

موئی جان کو اس کی جھونپڑی کے سامنے پھینکنے لائے۔ ہے بھگوان! ان لوگوں کو چھما کیسے ملے گی؟
ہے بھگوان!

اُشا کے باپ نے، بڈھے وارلی نے پانچ جماعت تک پڑھا تھا۔ کیسے پڑھا تھا؟ یہ ما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ کسی 'گوداوری مائی' کا نام لیتا جا تا تھا۔

گوداوری، جو ما کے علم کے مطابق ایک ندی ہے۔ ''کون تھی یہ گوداوری مائی؟''

''میں نے اس کو دیکھا تھا،'' وارلی نے کانکھتے ہوئے کہا۔ اس کی پوپلی باچھیں کھل گئیں۔

''دیکھا کیا، ہمارے ساتھ رہی تھی رات بھر۔ رات بھر رہی تھی گوداوری مائی... یہیں تو گھومتی پھرتی تھی، سانجھ سویرے، یہ لمبی لاٹھی ٹیکتی۔''

''بڈھی تھی؟'' ما نے پوچھا۔

''ارے نہیں! وہ تو پہاڑ پر چڑھنے اترنے کے لیے۔''

''اُشا ابھی نہیں جنمی تھی۔ ایک سانجھ پڑے اسے بھگوان نے بھیجا...'' وارلی نے اوپر اشارہ کیا۔ ''بھگوان نے بھیجا مائی کو... گوداوری مائی...'' وہ کوٹھڑی کی زمین کو بوسے دینے لگا۔

اُشا کے باپ کا نام وِٹھو تھا، وٹھو کربٹ۔ کوئی گوداوری مائی برسوں پہلے اس کی جھونپڑی میں آئی تھی۔ اور اسے اب بھی کچھ کچھ یاد تھا... اس کے آنے سے اجالا ہو گیا تھا۔

ایک شام:

جنگل کے کنارے کنارے وہ عورت نوگزی مراٹھا ساری لپیٹے، لمبی لاٹھی تھامے گھوم رہی تھی۔ ایک ننھے چرواہے نے اسے رات بتانے کے لیے پہاڑی پر جانے کو کہا تھا۔ لاٹھی کے سہارے وہ ڈھلان پر چڑھتی چک پھیریوں میں کوئی جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کے ایک ننگ دھڑنگ لڑکے نے اسے بتایا تھا، ''میری بستی پاس ہے۔'' عورت اس کے گھر رات رہنے کے لیے چل پڑی تھی۔

پہاڑی سے نیچے اترتے اترتے اندھیرا چھا گیا۔

وہاں ایک چھوٹی، آدی واسی بستی تھی۔ چھوٹی چھوٹی نیچی چھت والی، بانس اور پھوس کی جھونپڑیوں میں آگیں روشن ہو گئی تھیں۔ وٹھو کی جھونپڑی میں ہلچل مچ گئی۔ بڑا لڑکا کہیں سے کھٹولی لانے بھاگ گیا،

چھوٹا لڑکا وٹھو کو بتانے۔ وٹھو گھر پر نہیں تھا۔ لڑکا کھٹولی لے آیا تو بائی نے کھیس بچھائی اور بیٹھ گئی۔ وٹھو جھونپڑی پہنچا تو سلام کرنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔

''اٹھو اٹھو!'' گوداوری مائی نے کہا۔

وٹھو کی عورت اور بچے اسے کیا کھلائیں؟ پریشانی سے وٹھو کی عورت کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ اندھیرا پڑ گیا۔ اس وقت کہاں کچھ ملے گا؟

گوداوری مائی کو پتہ چل گیا۔ کیسے پتہ چل گیا؟ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ تو آپس میں کھس پھس کر رہے تھے۔ ''جو بھی گھر میں ہے وہی کھاؤں گی۔''

''تمھیں بھگوان نے بھیجا ہے بائی۔ تم خود بھگوان ہو بائی گوداوری،'' وٹھو کربٹ تتلایا اور رو پڑا۔ یہ چھوٹا سا کنبہ مصیبت میں تھا۔ فصل کا پورا حصہ کھاتے دار کو بھجوا چکا تھا۔ لیکن اس کو لالچ تھی۔ دو روز پہلے اس کے آدمی تلاشی کے ساتھ گھر سے چاول کا ایک ایک دانہ لے گئے تھے۔ پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ چاول وٹھو نے کہیں چھپا دیے ہیں۔ دھمکی دے کر گئے تھے: تین روز میں پورا حصہ نہ ملا تو گھر کے برتن بھانڈے، چھت کے شہتیر، بانس، عورت کے کپڑے، چاندی کے کڑے، سب کچھ لے جائیں گے۔ ہل کی پھالی اور گھڑے گھڑولیاں تک لے جانے کو کہتے تھے۔ وٹھو کربٹ بستی کے آدی واسی پنچوں کے پاس گیا تھا۔ پنچ کیا کرتے؟ کھاتے دار کا معاملہ...

''چاول کے ساتھ پتے ابال کر کھلائے مائی کو... کھٹے پتے... بھورے چاول... اگل اگل کر کھایا مائی نے۔ کھٹا چاول کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سارا کا سارا ہاتھ جوڑ کر لوٹایا۔ کافی بھوک نہیں لگی تھی مائی کو شاید۔ بچوں کو دینے کو بولی تھی۔ بچوں کے لیے تو آملی تھی نا بائی۔ بھورے چاول کا پیچ، تھوڑی پیاز کے ساتھ وہی آملی کھا کھا کر یہ اُشا بڑی ہوئی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ نوے پچانوے برس کے بڈھے وٹھو کربٹ کے بیان میں یہاں الجھاوا تھا۔ بستی کے سارے آدی واسی جمع ہو گئے تھے۔ بہت بڑی آگ جلائی گئی تھی۔ (کیا یگیہ؟ ماں نے سوچا تھا۔) وٹھو کربٹ کو کھانے پینے کی چیزیں لانے، چرائے جانے، چھینے جانے کی تفصیلات اچھی طرح یاد تھیں اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔

ما نے نظر اٹھا کر بھورے آسمان کو دیکھا۔ چاروں طرف سرخ پہاڑ اپنی دراڑوں کے منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ ان کی ڈھلانوں سے یہ مقام اب کسی سرخ پیالے کے تلے کی طرح تھا، جس پر آسمان کا بھورا سرپوش ڈھکا ہو۔ سرخ پیالے کو بدرنگ آسمان نے ڈھانپ دیا تھا۔

دونوں عورتیں لال پتھروں سے ابلتے، لال ہی نظر آتے پانی سے کپڑے دھوتی رہیں۔ کتنا ٹھنڈا پانی!... دھرتی کی جانو کوکھ سے نکلتا ہوا۔

''ہے پتالیسور،'' اُشا نے کہا۔ تھوڑا غور کرنے پر ما سمجھی... پاتال کا ایشور۔ یہ سب ...الگ الگ کیوں ہیں ان کے دلوں میں؟ اس نے غور کرنا چاہا... آکاش کا ایشور، اور پاتال کا؟

سرخ مٹی نے تمام کپڑوں کو ایک ہلکے گلابی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ نائلون کے صابن کی بٹی یہ رنگ اتارنے میں ناکام تھی، جسے مَل مَل کر، مٹھیاں مار مار کر وہ کپڑے دھو رہی تھیں... چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو... پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر ان کے منھ پر پڑ رہے تھے۔ ما نے یاد کیا... کوئی پرانا گیت...

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
میں میلی پیا اجلے ری، مرا کس بدھ ملنا ہوئے

یہ کپڑے بھٹی پر چڑھے بغیر صاف نہیں ہوں گے... زنگیا یا رنگ ہے، ما نے سوچا۔

تب ہی اس کی نظر اپنے پیروں پر پڑی۔ سرخ کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے اس کے پیر۔ اب جو اس نے اپنے پورے تن پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا۔ پہاڑی سے اترتے پھسلتے جو مٹی اس کے تن بدن پر تہہ بنا گئی تھی، اب کپڑے دھوتے ہوئے سرخ کیچڑ بن چکی تھی، جو جگہ جگہ سوکھ رہی تھی۔ یا خدا! اب وہ کیا کرے؟ اس نے اُشا کی طرف دیکھا جو سوکھی ساکھی بیٹھی تھی پتھر کے ایک بڑے چوکور، چبوترے جیسے ٹکڑے پر۔ نہ وہ پھسلی تھی، نہ مٹی میں لوٹی تھی، اور اسے کپڑے دھونے بھی اپنے آپ کو شرابور کیے بغیر آتے تھے۔

''دیکھو... میں تو بھوتنی بن گئی،'' ما نے کہا۔

دو شانت آنکھوں نے اس کا جائزہ لیا۔

''آپ نہا لیجیے، سنان کر لیجیے۔''

''مگر یہاں؟''

ما نے گھبراہٹ میں آس پاس نظر دوڑائی۔ ہر طرف مقامی لوگ تھے۔ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ

انھی کی طرح کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور پاس ہی لنگوٹی کسے یہ ڈھیر مرد لوگ کھدائی کر رہے تھے کسی قسم کی۔
اُشا نے اس کی بے بسی کو سمجھا۔
''یہاں ایک جگہ اور بھی ہے... پن تھوڑی دور...''
دھوئے ہوئے کپڑوں کو، جواب پہلے سے دو نے بھاری ہو چکے تھے، بالٹیوں میں بھر کر، انھیں اپنے سروں پر لاد کر، وہ اس دوسری جگہ کی طرف چل دیں۔ اسی گھڑی پہاڑوں سے بھدر بھدر بندروں کی طرح کودتے، جینز اور پتلونیں گھٹنوں تک اڑسے، بیسیوں جوان لڑکے پہاڑی سے اترتے پھسلتے ان پر نازل ہوئے۔ یہ سب سیاح تھے۔ اپنی وِلا سے نیچائی میں ما اور اس کے کنبے نے انھیں دیکھا تھا۔ آل انڈیا ٹورسٹ کارپوریشن کے بدحال خیموں میں ٹھہرے ہوئے مراٹھا طالب علم۔ چیختے اور گاتے ہوئے... کھجاتے ہوئے... منھ پر مہاسوں کی بھرمار... ایک سے ایک جوکر لگ رہا تھا۔ کسی نے بدھنا اٹھا رکھا تھا، کسی نے بالٹی۔ یہ سب پانی کی تلاش میں آئے تھے۔ ما کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لڑکے کیسے ہو جاتے ہیں جوان ہوتے ہوئے! ما نے ہنسی بھرے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اس کا چیکو بھی ایسا ہی ہو جائے گا ایک دن؟ یہ غریب گھروں کے لڑکے تھے۔ پتلی گردنوں میں نرخرے اوپر نیچے ہو رہے تھے سب کے۔ نوجوانی کی حیوانی پگلاہٹ نے غریبی امیری برابر کر دی تھی ان کے لیے۔ اسی بھیڑ میں اسے صاف وہ لڑکا نظر آیا... وہی جو اس پر برسا تھا۔ کیچڑ میں لپٹی ما جم کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس لڑکے سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔
اُشا کنارے لگی چپ چاپ کھڑی رہی۔ کپڑوں کی جستی بالٹیاں اس نے نیچے رکھ دیں۔
''اس دن... اس دن... تم نے اتنا غصہ کیا۔ میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے مراٹھوں سے کیا لینا دینا! مجھے تو تمھارا یہ پردیش اور تم سب لوگ... بہت ہی اچھے لگتے ہو'' اس نے انگریزی میں کہا۔
گہرا سانولا مراٹھی، کچھ گھبرا کر، لیکن کچھ خوش ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اتنے سارے ساتھیوں میں ایک، اس کے ساتھ ایک عورت باتیں کر رہی ہے... اور وہ بھی انگریزی میں! اس کے ساتھی اشتیاق سے کھسک کر ان کے گرد حلقہ بنانے لگے۔ لڑکے نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔
''آپ اِدھر کی لگتیں نہیں، میڈم!'' اس نے کہا، ''آپ بمبئی کی نہیں کیا؟'' اس نے اپنی جناتی انگریزی میں سوال کیا۔
''میں... میں؟'' ما چکرائی۔ پھر اس نے بہت سنبھل کر کہا، ''میں تو انڈین ہی نہیں ہوں۔'' اور یہ

الفاظ اس نے جتنی مشکل سے کہے تھے، شاید زندگی میں کوئی الفاظ اس کے منھ میں اس طرح ریت کی پھنکی بن کر نہیں بھرے تھے۔

مراٹھے نے کیچڑ میں لپٹی عورت کو حیرت سے دیکھا۔

''ناٹ انڈین؟ آپ کون ہیں؟''

''پاکستانی،'' ما نے کہا۔ لڑکے کا رنگ فق ہو گیا۔ پسینے چھوٹ گئے لڑکے کے۔ پاکستانی؟ یہاں؟

''سنو، سنو!'' ما نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''گھبراؤ نہیں... میں یہاں... ہم یہاں... انڈین حکومت کے علم میں ٹھہرے ہیں۔ پناہ لی ہے ہم نے... ایک طرح کی...''

لڑکے کی حالت اور بھی زار ہو گئی۔ یہ کس چکر میں پھنس رہا تھا وہ؟... یہ سب کیا تھا؟

گز بھر کے فاصلے پر کھڑے دوسرے لڑکوں نے کان کھڑے کر لیے۔ گردنیں شتر مرغوں کی طرح لمبی کر کے وہ سننے کی کوشش کرنے لگے۔

ما کا دل ڈوب گیا... لیکن وہ آخر ایک پختہ عمر کی عورت تھی۔

''ہم یہاں سے بمبئی جائیں گے،'' اس نے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں...''

لڑکے کی سیاہ آنکھیں اسے پوری توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔

''تمھارا پتہ؟ اچھا... تم اپنا پتہ شاید دینا نہ چاہو۔ میرا پتہ لے لو۔''

''میں شِو سینا کا سولجر ہوں۔''

ما چونک گئی۔ پل بھر کو اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ ارے، اس نے پہلے کیوں نہ سوچا تھا۔ یہ کوئی... یہ کوئی عام سا لڑکا نہیں تھا۔ جس طرح وہ بنا تعارف، بازار میں اس دن بھڑ پڑا تھا... عام لڑکے ایسا کہاں کرتے ہیں؟ کتنے شرمیلے ہوتے ہیں اس عمر کے لڑکے! لیکن وہ ایک ادھڑ وٹ تھی، اور عورت تھی، اس لیے ایک مذہبی جنونی پارٹی کا رکن ہونے کے انکشاف نے ما پر بس چند سیکنڈ کے لیے اثر کیا۔

''میں آپ کے بارے میں پتہ کروں گا،'' اس نے ٹھوڑی سینے سے چپکا کر پتہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا؟'' ما پھیکی ہنسی ہنسی۔ اس نے دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھا لی۔ ''کر لینا پتہ...'' اس نے لڑکے کے سراپے پر پیچھے ہٹ کر نظر ڈالی: دبلا، چھریرا، پھرتیلا، سانولا، جس کی چتون سے ذہانت اور بے خوفی

ٹپک رہی تھی۔ کیسا تھا یہ؟ سواجی مرہٹہ جیسا؟ گھوڑے کی پیٹھ پر کیسا لگے؟ جیسے دبلے بدن میں پارہ بھرا ہوا! لیکن... اسے خیال آیا... گھوڑے کی پیٹھ پر تو نہیں تھا یہ۔ گھوڑے پر تو رمیش تھا... گجراتی سرمایہ دار کا بیٹا۔ یہ تو پیدل تھا... پیدل بھگوڑ۔ ما دل میں زہر بھری ہنسی ہنسنے لگی۔ شوسینا کا سینک! ''تمھارا نام کیا ہے؟'' مانے جاتے جاتے مڑ کر پوچھا اور 'سواجی' سننے کی توقع کی۔

''دھر مانند،'' لڑکے نے کہا۔ پھر گروہ میں ملنے سے پہلے اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا، ''گڈ بائے، آنٹی۔''

آنٹی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ دور ہوتا گیا... تال کے کنارے تک پہنچ گیا۔ مانے دور تک فرقہ واریت کے سدا روشن الاؤ کے اس انسانی ایندھن کو دیکھا۔

دونوں عورتیں اپنا بوجھ ڈھوتی، بے برگ و گیاہ پتھریلی پہاڑی کا موڑ کاٹنے لگیں۔

انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ تھوڑے سے ہی فاصلے پر سرخ اوبڑ کھابڑ دھرتی پر، ما کو کچھ ہرا ہرا نظر آیا۔

''وہ ہے،'' اُشا نے اسی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

کائی تھی... کسی پرانے بدبودار جوہڑ پر جمی ہوئی کائی۔

دو ڈگ بھر کر وہ اس کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ ما کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ کتنی بھی گدلی ہو، اس پانی سے زیادہ تو گدلی نہ تھی!

''نہاؤں میں؟''

اس نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

اُشا نے جست کی بالٹیاں زمین پر رکھ دیں۔ پھرتی سے وہ ایک بالٹی کے کپڑے سرخ چٹانوں پر پھیلانے لگی۔ بالٹی خالی کر کے اس نے کنارے پڑی ایک چھڑی سے پانی پر جمی کائی ہٹائی۔ اس کے نیچے کائی کے ہی رنگ کا سبز پانی تھا۔

ما کے پیر میں اسی گھڑی جیسے کسی نے ایک تیز، لمبی سوئی گھونپ دی۔

چیخ مار کر مانے پیر جھٹکا۔ وہ دیوانہ وار پیر جھاڑنے لگی۔ اس کی چٹکی میں ایک چیونٹا آ گیا۔ سرخ، بڑا سا چیونٹا!

مانے گھبرا کر اسے دور پھینکا۔

اس کی پنڈلی کے پاس سوئی کی نوک کے برابر خون کا ذرّہ ابھر آیا تھا۔

''یا اللہ!'' اس نے کہا،''یہ کہاں سے آ گیا؟'' اچانک اسے یاد آیا۔ ایک بہت پرانی بات، کبھی بچپن میں اس کی ماں نے کہی تھی اس سے۔''اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ وہ کیڑے کو پتھر میں رزق دے دیتا ہے۔''

ما نے دور دور نظر دوڑائی اور تقریباً بے خیالی میں سوچا: کہاں دے دیتا ہے؟ دور دور رزق کا نام و نشان نہیں۔ یہ کیڑا یہاں کیوں آ گیا؟

اس کی نظروں نے چیونٹے کو ڈھونڈا۔''خون کھینچ لیا کمبخت نے،'' اس نے چیونٹے کو کوسا۔

اُشا خالی بالٹی میں پانی بھر رہی تھی۔ سر وقد کھڑے ہو کر اس نے کہا:

''لو، کروسنان۔ میں پانی ڈالتی ہوں۔''

ما کپڑے دھونے کا صابن مَل مَل کر اپنے شریر کی مٹی اتارتی رہی۔ اُشا نے پانی ڈال کر اسے نہلا دیا۔ ما ہلکی پھلکی ہوگئی۔ پانی تو آخر پانی تھا، چاہے کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو... سب کچھ دھو کر صاف کر دینے والا۔ ما بالکل تازہ دم ہوگئی۔

''ایک بار...'' اُشا نے کہا،''یہاں نہائی تھی گوداوری مائی۔'' وہ آدھ سوکھے کپڑے جھاڑ کر واپس بالٹی میں رکھ رہی تھی۔''باپ نے بتایا تھا۔''

ما کے دماغ میں ٹن سے کسی گوداوری کی تصویر آئی۔

''لیکن وہ یہاں کہاں؟'' ما نے اپنی بالٹی اٹھا کر پوچھا۔''وہ تو... اُدھر، امبر گاؤں کی طرف تھی۔''

''وہاں بھی تھی،'' اُشا نے آہستہ سے کہا۔

سرخ دراڑوں پر جما جما کر قدم رکھتی وہ اوپر چڑھنے لگی تھیں۔ پہاڑی پر چڑھنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ما کو اب اُشا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی۔ اشا کی بات پر وہ کچھ ہنس کر سوچ رہی تھی... یہ ایک تھی یا کئی عورتیں تھیں؟ شاید ایک سے زیادہ۔ شاید وہ کسی عیسائی مشن کی ننیں تھیں، ایک سی ساریاں باندھے... اگر وہ ٹھوکربٹ کے تخیل کی تخلیق نہ تھی۔

ٹھوکربٹ... ایک بھیانک خواب کی طرح وہ سب باتیں ما کے ذہن میں گھومیں۔ کس کی بیٹی تھی وہ؟ ٹر پر

چیتیا کی، کہ کسی اور کی؟ ارے بائی، تلاٹھی نے یوں پکڑا، اونچا اٹھایا، یہ دے مارا دھرتی پر۔ پھر اٹھایا، پھر دے مارا۔ دھپ! تیرے باپ کی بندوق کہاں؟ کہاں چھپائی؟ ارے کدھر ہے بندوق؟ ایک بار کہا۔ پر بولنے جیسی نہیں رہی۔ تڑچھا لوہا اس کی ... میں گھسیڑنے کو کہہ رہے تھے۔ لڑکی رکت میں نہائی۔ بچی نہیں بعد میں وہ۔ سارا رکت تو وہیں رس گیا... مٹی میں۔

ترائی کے گھنے بن اور وارلی...

یہ اکتوبر ۱۹۴۵ء کا قصہ ہے۔

تب ہی آس پاس کہیں ما اور با پیدا ہوئے تھے... کہیں بہت دور... دور دراز کے علاقے میں۔ گوداوری... جو چائے بہت پیتی تھی۔ چائے پیتی تھی مائی گھڑی گھڑی!

بچوں کی کھلکھلاہٹ۔ کہاں سے لائیں گے چائے؟ ہاں ہاں، ہمیں آتی ہے بنانی۔ پہلے تو کہیں سے پتی لاؤ۔ پتی آ گئی۔ اب چینی... چینی کہاں! گڑ بھی نہیں ہے۔ جاؤ جاؤ، گڑ لے کر آؤ۔ بائی گڑ کی چائے پیے گی؟ پی لے گی؟ ہاں ہاں، پی لے گی بھئی۔ خوشی سے۔ ہر طرح کی پی لے گی۔ بس چائے ہونی چاہیے۔ اب رہا دودھ۔ دودھ وارلی کے پاس کہاں! کسی ماں کا تھن نچوڑ لو تو دوسری بات ہے۔ کہیں سے دودھ خرید کر لانا پڑے گا۔ ایک لڑکا دوڑتا گیا۔ پات کے دونے میں آدھے گھنٹے میں دودھ لایا۔ پتی اور گڑ پانی میں کھول کھول کر تب تک کالے پڑ چکے تھے۔ مگر دودھ ڈالنے سے اجلے ہو گئے۔ مائی نے ہنس کر چائے پی۔

نہیں، وہ ایک ہی تھی... کئی تو نہیں ہو سکتیں، ایک ہی جیسی چائے کی شوقین۔ ایک بالکل نرالی دیوی...

چائے کی دیوی! ما نے دل میں سوچا۔ جب ہر چیز کے دیوی دیوتا ہو سکتے ہیں تو چائے کے کیوں نہیں؟

اچانک ما کو خیال آیا۔ ''جو آم کی پوجا کرتے ہیں، وہ گوت ... آم کھاتی نہیں کیا؟'' اس نے اُشا سے پوچھا۔

''کھاتے کیوں نہیں! آم کا پیڑ نہیں کاٹتے؛'' اُشا نے رسان سے کہا۔

''ہوں!'' ما نے چڑھتے چڑھتے ہنکارا بھرا۔ اسے گائے کا خیال آیا۔ اسے شوسینا کا خیال آ رہا تھا... سواجی مرہٹہ کا... بال گنگا دھر تلک کا، جنھوں نے دیش کی رکھشا اور گائے کی رکھشا کا نعرہ دیا۔ تلک تک پہنچتے پہنچتے وہ صرف مرہٹہ تحریک نہ رہ گئی تھی، پورے ہندوستان کی آزادی کی تحریک تھی۔ مگر گائے خور مسلمان اس تحریک سے بھی غائب! تلک نے ایسا نہ سوچا کیا، گائے کا سوال سامنے رکھنے سے

مسلمان بدظن ہو جائیں گے؟ ان کا ہندوستان کا تصور کچھ اور تھا۔ کانگریس میں، ما کو خیال آیا، سب کے خیال الگ الگ تھے۔ نہرو کے کچھ اور، گاندھی کے کچھ اور، تلک اور پٹیل کے بالکل جدا ... بس چند نکتوں پر متفق ہو کر وہ ایک ہی پارٹی میں تھے۔ اسے اسماعیل میرٹھی یاد آئے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

وہ دل ہی دل میں اپنے بھولے، خیر خواہ ہم وطن پر مسکرائی... تاسف اور پیار سے۔ شاید سوچتے ہوں گے، اس طرح مسلمان بھی گائے سے پیار کرنے لگیں! کم از کم عزت ہی کرنے لگیں۔ مسلمان گائے کو برا کہاں سمجھتے تھے؟ سب ہندو گائے سے پیار کہاں کرتے تھے؟ کتنے ہی ٹھیلے والوں کو، جن کی سبزی ترکاری میں کھلی چُھٹی پھرتی گائیں منہ مارتی تھیں، اس نے قمچیاں مار مار کے گایوں کو بھگاتے دیکھا تھا۔ اور بڑی عمارتوں کے سامنے (وہ یاد کرکے ہنس پڑی) پھاٹکوں کے سامنے، زمین میں گڑھا کھود کر لوہے کے جال لگائے گئے تھے۔ یہ 'کاؤ ٹریپر' کہلاتے۔ گایوں کے کھر ان میں پھنس جاتے۔ وہ اندر جا کر چمن کا ناس نہ کرسکتیں۔

بات شاید گائے کی نہیں تھی... بات شاید کچھ اور تھی... اس نے سنا تھا، آزادی سے پہلے بعض جگہوں پر بقرعید کے موقعے پر گایوں کو خوب سجا کر، ہندوؤں کے علاقوں سے جان جان کر مسلمان مذبح کی سمت ہنکا لے جاتے۔ فساد بھی ضرور ہوتے، مگر پروا کس کو تھی؟ لوگ سر سے کفن باندھ کر جاتے تھے۔ کیا گائے کو ذبح کرنے کے شوق میں؟ ما نے افسوس سے سوچنے کی کوشش کی کہ لڑائی اصل میں کس بات پر ہوتی ہوگی۔ تم ہمارے جذبات مجروح کرتے ہو، ہمارے منہ پر تھپڑ مارتے ہو! ہندو سوچتے ہوں گے۔ خواہ مخواہ کی 'اَڑی' (بقول سندھیوں کے)۔ اگر ایک گائے نہ کاٹیں تو ان کے خدا ان سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گے! (ارے اور بہت سے جانور ہیں قربانی کے لیے... بکری، بھیڑ، اونٹ...)

مسلمان بیٹھے بٹھائے ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنا نہیں چاہتے ہوں گے (ما نے قیاس دوڑایا)۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وقت اور پیسہ لگا کر دوسروں کے جذبات کو مجروح کرتا پھرے! شاید وہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ تم ہمیں کسی بات کے لیے زبردستی مجبور نہیں کر سکتے۔ اصل میں (ما نے فیصلہ کیا) ہندو اور مسلمان ... ایک دوسرے کا اصل مقصد ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے۔ (ما سے مشورہ کر لیتے!) پھر اسے ایک عجیب سا

خیال آیا، جیسے کوئی لطیفہ ہو۔ اصل مقصد سمجھ جاتے تب شاید اور بھی لڑتے۔ آخر ایک قوم کا دوسری قوم کی طرف، ایک جاتی کا دوسری جاتی کی طرف، ایک آدمی کا دوسرے آدمی کی طرف، اصل مقصد ہے کیا؟

کھا جانا کیا؟ مانے ہیبت سے سوچا۔ اپنے اندر دوسرے کو مٹا ڈالنا؟ زیر کر لینا؟ شاید ایسی شعوری خواہش نہ ہو یہ، لیکن پھر بھی کبھی کبھی ... یونہی تو لگتا تھا۔ جیو کا کوئی لامحسوس اُبال! گو ایسا ہو پاتا نہیں تھا شاید۔ یا تُو نہیں یا میں نہیں! اس منہ زور بہاؤ پر کوئی بند تھا کیا؟ تو بھی رہ جاتا اور میں بھی ... جنگ یا انسیت دونوں ہی قسم کے اتصال میں ٹکراؤ میں...

اسے پھر آدی واسیوں کا خیال آیا۔ ناگ پوجا کرتے تھے یہ۔ وہ ناگ کہاں گیا؟ دراوڑی دیوتا شوجی کے گلے سے جا لپٹا۔ اس طرح وہ اپنے پرانے (دراوڑوں کے نئے) دیوتا کو ماتھا ٹیکتے ہوئے اپنے نئے (دراوڑوں کے پرانے) ناگ دیوتا کو بھی ماتھا ٹیک لیتے تھے۔ ان کی پوجا آپس میں گھل مل گئی... مل کر ایک ہوگئی۔ لیکن کثرت اور ضرب در ضرب کے جناتی عمل سے، وہ ایک ہونے کے ساتھ دو بھی رہی۔ گلے میں ناگ لپٹائے شوجی کو ماتھا ٹیکنے کے بعد، اِدھر اُدھر دیکھ کر لوگ چپ چپاتے اپنے پرانے ناگ دیوتا کی، اس کی اصل، اکیلی صورت میں، پوجا بھی کر لیتے۔ اس طرح دیوتاؤں کی بھر مار ہوتی گئی۔

''کوئی شے کبھی ختم ہوتی نہیں،'' بعد میں باہمنوں نے نتیجہ نکالا، ''بس روپ بدل لیتی ہے۔'' اور روپ بدل کر پہلے جیسے بھی رہ جاتی ہے! مانے حیرت کی۔ اور باہمنوں نے ایسا مشاہدہ کیا... کتنی صدیوں پہلے! نہایت محنتی اور ذہین لوگ تھے، ما کے دل نے بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کیا، یہ باہمن... جو دوسری جاتیوں سے بڑھ کر تو ذہین نہ ہوں گے... لیکن اب ان کا پیشہ ہی سوچنا ٹھہرا تھا تو اسی میں لگ گئے ہوں گے۔ اور جن کی کسی سنتان کو آگے چل کر، وقت کی گھپ اندھیری کوکھ میں چکراتے ہوئے، صدیوں بعد، کسی تبدیلی سے گزر کر، شاعرِ مشرق علامہ اقبال بننا تھا اور اپنے پُرشور کلام کے بہاؤ سے پورے برصغیر کے ہم مذہبوں میں ... ایرانیوں، عربوں، افغانوں کی اولادوں اور آدی واسیوں سے بنیے اور باہمن اور کھشتری اور چوہڑے چمار، اور ان سے مسلمان بنے کروڑوں لوگوں میں... ایک نئی روح پھونکنی تھی... گنگا کنارے، الٰہ آباد میں مطالبۂ پاکستان پیش کرنا تھا۔

وِلا کی رات کا اندھیرا... جامنی اندھیرا... موٹے ریشم کا سا... مخمل جیسا...

اور سواجی ٹنکی والا نہیں تھا!

ما تھکی ہوئی... چیکو سوتا ہوا... رِنکلی اور بڑکی اپنے اپنے بستروں میں، کوئی سپنے دیکھتی ہوئی... ما کا دل پُرسکون تھا۔

اور بستر میں ما... اور بستر میں با...

اس نے کہیں پڑھا تھا، ایک عورت کا قصہ جس نے اپنے آدمی کو بے وفائی سے روکنے کے لیے، رات کو اس کے اور اپنے کپڑوں میں چپکے سے پن لگا دیا تھا... سیفٹی پن۔ رات کو جب آدمی اٹھا تو اس کی عورت کا دامن کھنچا۔ وہ بھی جاگ پڑی۔ با کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اس نے ہمت کی اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔

ما کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کے پاس تو کوئی پن نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو... شرم کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پاتی۔ اس کے ذہن میں ہر خیال دھندلا گیا۔ کسی تال کے ساکن، شفاف پانی میں ڈوبنے لگی ما۔ اس کے بال آبی بیلوں جیسے تیرنے لگے... نیچے، اور نیچے... پُرسکون پانیوں میں، جہاں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا... جہاں آرام تھا... اتھاہ آرام... نیند کے تال میں ڈوبتے ڈوبتے بے حد ہلکے پانی سے اپنا حیرت انگیز طور پر بھاری پڑا ہاتھ نکال کر ما نے ایک بڑا سا چمکدار، نقرئی پن با کے کپڑوں میں لگا دیا۔ ما سو گئی... نگہ داری کرنے کے بدلے سو گئی ما!

دوسری صبح، کچھ بھی کل رات جیسا نہیں رہا تھا۔

بھیونڈی کے فسادات ختم نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن کے وقفے کے بعد اور بھی شدت سے بھڑک اٹھے تھے۔ ایک کے بعد دوسرے قصبے میں وارداتیں ہو رہی تھیں۔

اور وجہ؟

وجہ کیا تھی؟ وجہ تو شاید کچھ بھی نہ ہو۔ بال ٹھاکرے کی تحریک کے شاخسانے... شوسینا، جو پچھلے ایک دو برس سے بمبئی کی، مہاراشٹر کی غریب بستیوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ یہ ہندو تحریک تھی، مگر بال گنگا دھر تلک کی کل ہند تحریک نہیں... ایک بار پھر مراٹھا ہندو تحریک!

بال ٹھاکرے کو تو کوئی سنجیدگی سے لیتا تک نہ تھا، کم سے کم دلّی میں ما اور با کے پڑھے لکھے ہندو دوست تو نہیں۔ ایک ناکام کارٹونسٹ، جو بہت عرصے سے ایک اتنا ہی ناکام سیاستدان تھا... لیکن تھا مسخرہ، اور پُرلطف بیان دیتا، جس پر سب ایک دو دن ہنس کر بھول بھال جاتے۔

کیا جادو تھا اس کے پیغام میں؟ جس نے اندھیری، غلیظ چالوں سے کھینچ کھینچ کر لڑکے نکال لیے تھے... اس نیم خواندہ سیاسی شعبدہ باز میں؟

عجیب بات یہ تھی کہ ایک ڈیڑھ برس پہلے شوسینا نے بمبئی کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ مل کر کچھ تقریبات کی تھیں۔ ہار پھول پہنائے تھے ایک دوسرے کو۔ ان دونوں جماعتوں میں قدرِ مشترک کانگریس کی مخالفت تھی۔

بال ٹھاکرے اپنے آپ کو سواجی مرہٹہ کا جانشین سمجھتا تھا... شاید تھا بھی... وقت کی دھند میں ملفوف تاریخ کے رومانی ہیرو اصل میں کیسے تھے، کون جانتا ہے؟ شاید ہم جیسے ہی تھے...

لیکن اب کی بار مسئلہ گائے کا نہ تھا، گنپتی کے تہوار کا تھا۔

''گنپتی بپّا موریا!''

مانے اور اس کے کنبے نے بمبئی میں رنگ برنگے، ہاتھی، گھوڑوں، پالکیوں کے جلوس میں گنیش جی کو جاتے دیکھا تھا۔ گنیش، جنھیں سارے وید منھ زبانی یاد تھے... اور جو اتنے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹو بھی بہت تھے۔ ایک بار کسی دیوتا نے دعوت کی تو اس کی میز کرسیاں پلیٹیں تک کھا گئے۔ کیونکہ ان کے اندر سب کچھ سما سکتا تھا... تمام خیالات اور تمام اشیائے خورد و نوش۔ گنیش، جو برصغیر کے قدیم انسانوں کے کوئی دیوتا تھے، اور جنھوں نے ہزاروں برسوں کے طویل اور سدا تر و تازہ اختلاط کے عمل میں مار بھگائے جانے سے انکار کر کے دراوڑی دیوی پاربتی کے گھر جنم لے لیا تھا، اور یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔ پہلے ان کا سر ہاتھی کا نہ تھا۔ پر ایک بار ان کی ماں نہانے بیٹھی تھی۔ ''کسی کو اندر نہ آنے دینا'' اس نے اپنی سنتان سے کہا۔ تب ہی وہاں شِو جی پہنچے۔ لیکن گنیش انھیں کہاں اندر جانے دیتے!

''نہیں، ماں نے منع کیا ہے۔''

وہ شِو جی کی قمیص سے لٹک گئے ہوں گے!

اب شِو جی کوئی بڑکی تو نہ تھے کہ لنگوروں بھرے جامنوں کے پیڑوں کے نیچے پیر پٹک پٹک کر ٹہلتے، پاربتی جی کے نہا کر، ساری لپیٹ کر، بال سکھاتے ہوئے باہر آنے کا انتظار کرتے۔ گھما کر انھوں نے جو کلہاڑی کا ہاتھ دیا تو گنیش جی کا سر تن سے جدا ہو کر... کہاں گیا؟ غرض، غائب ہو گیا... یا آکاش میں کہیں چلا گیا۔ پاربتی جی باہر نکلیں تو بیٹا سر کے بنا پایا۔ ''میرے بیٹے کے دھڑ پر سر لگا!'' انھوں نے شِو جی کو

جھنجھوڑ ڈالا۔ خون بھرے آنسوؤں کی برسات کر دی۔ شِو جی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھوڑی سہلانے لگے۔ اب کیا کریں؟ وہیں سے جھومتا جھامتا ایک سُندر رسا ہاتھی آ رہا تھا۔ شِو جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اس کا سر کاٹ کر گنیش جی کے دھڑ سے لگا دیا۔ ''یہ سنبھالو اپنا پورن بیٹا!'' انھوں نے گنیش جی کو ماتا پاربتی کے حوالے کیا، اور خود جامنوں کے جھنڈ کی اور چل دیے جہاں لنگور دانت نکالے ہنس رہے تھے... منھ چڑا رہے تھے شِو جی کا۔ کئی شتابدیوں تک وہ وہاں پیر پٹک پٹک کر ٹہلا کیے... عورت جاتی پر لعنتیں بھیجتے۔ افوہ! تریاہٹ!

لیکن اس تریاہٹ کی جیت تو ہونی تھی، اور تہذیب کے رحم کی کلبلاہٹ سے گنیش جی کو جنم تو لینا تھا... اور اب ان کے تہوار پر خون خرابہ!

کون بھلا یہ چاہتا ہوگا؟ کس کی خواہش ہوسکتی تھی کہ مراٹھے غریب غربا کا یہ خوشیاں مناتا، خوشیوں کا شور اٹھاتا جلوس ہنگاموں کی نذر ہو جائے، ان کے مٹھائیوں کے دُونوں میں دھول جا پڑے، ان کے رنگدار برف کے گولوں میں، جنھیں ان کے بچے پچاس پیسے میں خرید کر چوس رہے ہیں اور ''گنپتی بپّا موریا'' گا رہے ہیں، خون کے چھینٹے جا پڑیں، اور ان کاغذی محلوں کو عرب ساگر میں تعزیوں کی طرح ٹھنڈا نہ ہونے دے!

لیکن اصل بات تو یہ نہیں تھی... اصل بات کیا تھی؟

کچھ دنوں پہلے بمبئی کے ایک اردو اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ بال ٹھاکرے نے کسی جلسے میں مسلمانوں کی دلآزاری کے کلمات کہے ہیں۔ اخبار نے لکھا تھا کہ ایسا کسی مراٹھی اخبار میں چھپا ہے۔ اس کے بعد مراٹھی اخبار میں چھپا تھا کہ کسی اردو اخبار میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔

یہ دونوں گمنام سے، بہت کم تعداد میں چھپنے والے اخبار تھے، جنھوں نے دونوں فرقوں کے دلآزار کلمات کی خبریں چھپنے کی خبر شائع کی۔ اصل چھپے ہوئے مواد کو کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔

گنپتی تہوار سے کچھ دن پہلے اسی باعث ہندوؤں (مراٹھوں) اور مسلمانوں میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔

تہوار کے موقعے پر بھیونڈی میں ہندو مراٹھوں نے گنپتی جلوس کا راستہ طے کیا۔ انھوں نے جلوس مسلم علاقوں کے بیچوں بیچ سے نکالنے کی ٹھانی۔ دوسرے دن کی تیاری میں انھوں نے راستے پر بھگوا جھنڈے لگانے شروع کر دیے۔ مسلم علاقوں میں آن کی آن میں یہ جھنڈے اکھاڑ پھینکے گئے۔ ان کی جگہ جانے کہاں سے نکل

کر سبز جھنڈے لہرانے لگے۔ اس سرپھٹول میں دو تین مراٹھا ہندو لڑکے مارے گئے... یا زخمی ہو گئے۔

شوسینا کی تنظیم کے باعث مراٹھا نوجوان اتنے منظم ہو چکے تھے کہ دوسرے دن انھوں نے ایک ہولناک انتقام لیا۔

مہاراشٹر کے قصباتی علاقے کپڑے کی چھوٹی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ روزگار کی تلاش میں پورے ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر بے روزگاروں کی ٹولیاں بمبئی اور اس کے آس پاس چھوٹے بڑے شہروں میں آتی ہیں، اور انجان سرزمین پر کسی اپنے سے ...اپنی بولی بولنے والے یا اپنے ہم مذہب سے... دو وقت کی روٹی کی خاطر جڑ جاتی ہیں۔ یو پی، سی پی اور بہار سے لاکھوں مسلمان بھی یہاں آ بسے ہیں۔ زیادہ تر کپڑے کے کارخانوں میں چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔

وہ شاید ایک مسلمان چھوٹے موٹے سرمایہ دار کے کپڑے کے کارخانے کے مزدور تھے جنھیں خود پر حملے کا خطرہ تھا، جو اس دن صبح ہی سے وہ مضافات میں اس کی کوٹھی کے پاس، اس کے ہی کھیت میں جا چھپے تھے۔

صبح دس بجتے بجتے، ان سے تعداد میں چوگنا بلوائیوں کا ہجوم، مسلمان کارخانے دار کی کوٹھی کے گرد جمع ہو گیا۔ کارخانے دار کی کوٹھی خالی تھی۔ اپنے خاندان کے ساتھ وہ روپوش ہو چکا تھا۔

مشتعل ہجوم نے دور دور نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دور دور تک کھیت کی ہریالی تھی۔

تب انھوں نے کھیتوں کو آگ لگا دی۔ لپٹوں سے تپے مسلمان مزدور بوکھلا کر باہر بھاگے۔ بلوائیوں نے کھیت سے نکلنے والوں کو گھیر کر، ان پر چاقوؤں اور چھریوں سے حملہ کر دیا۔ زخمی تڑپتے ہوئے شکاروں کو انھوں نے واپس آگ میں جھونک دیا۔ شاید ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ نکل پایا تھا۔

پہاڑی ولا میں سہا ہوا ایک مسلمان کنبہ...

چیکو، ِککلی، بڑکی، ما اور با... بڑکی کی خوش طبعی رفو چکر ہو چکی تھی۔ اس کے چاند سے چہرے پر فکر کے بادل چھا گئے تھے۔ اچانک فسادات نے اس پر رمیش کے ہندو ہونے کا مطلب فاش کر دیا تھا۔ اس نے ما کے جلدی میں کہے ہوئے جملوں ''پاکستان میں، پاکستان میں ...وہیں ہوگا تمھارا بیاہ!'' پر پہلی بار سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی لڑائی اس کے نزدیک اس کی اپنی زندگی کے بےفکر، ندی کے پانی

کی طرح کلکلاتے بہاؤ میں ایک احمقانہ رکاوٹ تھی۔

''پاکستان میں لڑکے ہیں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''بے شمار!'' ما نے اسے تسلی دی تھی۔''ایک سے ایک ہینڈسم!''

ہمیشہ کی طرح ما کی تسلیوں کو بڑکی نے شدید شک و شبہے کی نظر سے دیکھا تھا، مگر اس پر یقین کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ پا کر، خود کو یقین کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی۔''چلو اس بار ما کو پاس ہوکر دکھا دو!'' اس نے بے پروائی سے فیصلہ کیا تھا۔

رِکلی کو کچھ مبہم سا اندازہ تھا... لڑائی ہو رہی ہے... کس کی، کس سے؟ وہ یہ سب نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مگر وہ ما کی مدد کرنا چاہتی تھی... چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے کپڑے تہہ کرنے لگی رِکلی۔

چیکو لڑھک اور رینگ کر احاطے میں جانا چاہتا تھا۔ یہ روزمرہ کی معمولی سی بات! لیکن آج با اور ما اسے اپنی آنکھوں سے ایک پل کے لیے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کی جان گلے میں اٹک گئی تھی۔ چیکو کو گھسیٹ کر انھوں نے اندر کرلیا۔ وہ سب ایک کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے... ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے۔ ما کا ہاتھ بٹانے کے لیے، چھوٹی سی رِکلی چیکو سے کھیلنے لگی۔

بدلی ہوئی صورتِ حال نے ما کے ذہن سے بیتی رات کے نقوش پل بھر میں مٹا دیے تھے۔ با اُشا کے پاس گیا یا نہیں ... آج کے دن گزری رات کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں بن رہی تھی، اور کسی حیرتناک شگاف کے ذریعے، جو دور رونما ہونے والے واقعات نے وقت کے تسلسل میں ڈال دیا تھا، کل کی رات کا آج کے دن سے کوئی رشتہ بھی نہیں بن رہا تھا۔ اُشا ان کے لیے ناشتہ لائی۔ ہمیشہ کی طرح پُرسکون... اس کے لبوں پر اسی طرح ایک روشن مسکان کی پرچھائیں تھی۔ ما مر کر دوبارہ زندہ ہونے پر بھی اس سدا شانت چہرے کو نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس نے با پر نظر ڈالی۔ اترے ہوئے چہرے سے، انگلیاں چٹخاتا با... شاید وہ کوئی محیرالعقول کارنامے انجام نہیں دے پایا تھا۔ شاید کسی بھی دو اجنبیوں میں پہلی بار ہونے والے جسمانی ملاپ کی طرح وہ ایک گھبرایا ہوا متھن رہا ہو... یا شاید ایسا نہ ہوا ہو... شاید با اپنی آتما خوابگاہ کی کھونٹی سے لٹکی چھوڑ گیا ہو... صرف بدن رہا ہو با! اس نے آکاش تک اڑان بھری ہو... اس کے بدن نے... گودھولی کو چھوآیا ہو با کا بدن اُشا کے سنگ۔

گودھولی ... کہکشاں، ویدوں کی پرانی تشریحوں میں یہ گایوں کے گلوں کی گزرگاہ تھی... نقرئی گھنٹیاں ٹنٹناتی، اپنے دودھ بھرے تھنوں سے آدمی کے منھ میں جاں بخش امرت ٹپکاتی... جو کسی ستاروں کے جنگل کی اور گئی تھیں۔ بعد کے تشریح کرنے والوں نے رگ وید میں گودھولی کا کچھ اور مطلب بتانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ دراصل یہ الجھاوا ایک لفظ کا غلط مطلب سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، 'گو' دراصل روشنی کو کہتے ہیں۔ گودھولی سے مراد یقیناً روشنی کا راستہ ہے، نہ کہ گایوں کا راستہ... بعد کے آنے والے ان زیادہ خیال پرست مفسرین کو شرمندگی ہوئی ہوگی کہ رگ وید کی حسین پرارتھنائیں کسی جانور کے لیے کی گئی ہوں۔ مگر دھرتی پر بستے، مٹی اور پانی اور پیڑوں اور جانوروں سے بندھے کروڑوں ہندوؤں تک ان کی تفسیریں پہنچی بھی نہیں تھیں، اور انھوں نے آکاش پر اس روشن، خمدار لکیر کو گایوں کا راستہ ہی سمجھا تھا۔

با بمبئی میں طاہر بھائی کے گھر فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ طاہر بھائی گھر پر نہیں تھے۔ با نے طیب بھائی کا نمبر ملایا۔ اتفاق سے طیب بھائی مل گئے۔ وہ ابھی باہر نکلنے والے تھے۔

''ہم لوگ تو یہاں پھنس گئے ہیں۔ بمبئی آجائیں؟''

''آجایئے'' طیب بھائی کی دکھی، گجراتی آواز میلوں سے اڑتی آئی، ''یا... جہاں ہیں وہیں ٹکنے کی کوشش کیجیے۔ فسادات تو ہر جگہ ہو رہے ہیں۔ بمبئی میں تو نام پوچھ پوچھ کر چاقو گھونپے جا رہے ہیں۔''

نام پوچھ پوچھ کر؟ ما نے حیرت سے سوچا تھا۔ شکلوں سے نہیں پہچانے جا سکتے ہندو مسلمان! اسے ایک اڑا مٹا خیال آیا تھا کہ کراچی میں، پٹھان مہاجر فسادات میں، دونوں قومیتوں کو، یا تہذیبی اکائیوں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھیں، انھیں پہچاننا بالکل آسان تھا۔ اسے یاد آیا تھا کہ پچھلے مہینے، یوپی کے قصباتی فسادات میں، پاجامے اتار کر بلوائی ہندو مسلمان کی پہچان کرتے تھے۔ اس نے ِککلی اور بڑکی کو ہدایت کی، ''بمبئی پہنچنے پر کسی کو نام نہیں بتانا۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں طیب بھائی؟''

''بھیونڈی... فسادات کے متاثرین کی مدد کرنے۔''

با اور ما سُن ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا۔ انھیں یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ فسادات کی

ناگہانی نے انھیں بالکل بھلا دیا تھا کہ عزم اور ہمت اور استقلال وغیرہ کوئی چیز ہوتے ہیں... جیسے بندھے ہوئے اسباب سے کھکھوڑ کر انھوں نے یہ سب ڈھونڈنے کی، سینے سے لگا لینے کی کوشش کی۔

رات پڑے... سبز جگنوؤں کے جھنڈ آکاش سے اترے تھے۔ اس جھلملاتی، حسین تابناک دیوالی میں، جامنوں کے پتوں کی پُراسرار سرسراہٹ تلے، وہ اپنے ٹرانزسٹر ریڈیو پر بڑھتے ہوئے فسادات کی خبریں سنتے رہے تھے۔

اگر کسی تال کنارے
آسمان اور زمین کی گہرائیوں میں
تم کسی کو پکارو
اور تمھیں کوئی آواز سنائی دے
تو سمجھ لینا
یہ کسی دوسرے انسان ہی کی آواز ہوگی

ماں نے نہ جانے کہاں پڑھی ہوئی سطروں کو یاد کیا۔ خوف اور ایک ناقابلِ وضاحت غم نے اس کا کلیجہ مسوس دیا۔ اس نے بڑکی پر نظر ڈالی جسے وہ رات پڑے گھر سے نہیں نکلنے دیتی تھی، جس کے کنوارپن پر سانپ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھی تھی... جیسے اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی، اور اس سے پہلے اس کی ماں... اور اس وقت وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر... اگر خدا نہ کرے کچھ ہو جاتا ہے تو... تو بس، اس کا مطلب کچھ بھی نہیں... یہ سب تو... یہ سب امن کے زمانے کی باتیں ہیں۔

تو سمجھ لینا... یہ کسی انسان کی آواز ہے...

کیسا انسان وِنسان! یہ ہندو مسلم فسادات تھے۔ اس میں انسان نہیں تھے... ہندو تھے اور مسلمان تھے... انسان کی انسانیت کو پکارنے کی کوشش بے سود تھی۔

ماں نے انسانیت کو نہیں پکارا تھا۔ چشم زدن میں اپنے خیال پرست ذہن میں کسی جھپاکے سے سما جانے والی حیران کن سوجھ بوجھ نے اسے آدمی کے حماقت خیز خواب کو جگانے، کوئی ڈور اٹکا کر اس سے لٹک جانے، اور اپنا کنبہ پار لے جانے پر اکسایا تھا۔ جوئے کی ایک اندھی بازی کی طرح اس نے سواجی ٹیکسی والے سے کہا تھا، ''بمبئی لے چلو گے ہمیں؟ ہم ایک فلم ایکٹر کے گھر جائیں گے۔''

سوا جی ٹیکسی والا، جو وہیں ترائی میں گھومتا پھرتا تھا، اور اس سے پہلے کبھی ماتھے پر سیندور مَلے نہ گھوما تھا، جس نے یہ سیندور شاید فسادات کے اعزاز میں لگایا تھا، اور جو یونہی فسادات کے جوش میں اینڈتا ہوا ٹیکسی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، فلم ایکٹر کا نام سن کر موم ہو گیا تھا۔ ایک جھلملاتا خواب اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔

''بائی، میرے کو ملائے گی؟'' اس نے ہنس کر کہا تھا۔

''ہاں... فلم ایکٹر بنو گے تم؟''

سوا جی ٹیکسی والا ہنسنے لگا۔ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا... اس مسلمان خاندان کو بحفاظت بمبئی تک لے جانے کے لیے، جسے وہ قتل کرتا یا نہ کرتا (کیونکہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھے)، کم از کم دو چار لوگوں کے ساتھ مل کر، انتشار کے اس لمحے میں، لوٹ تو ضرور سکتا تھا۔ لیکن فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں، فلم والوں سے ملنے کا موقع بار بار کہاں آتا ہے! اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ زیرِ لب ایک مراٹھی گیت گنگنانے لگا تھا۔

طیب بھائی نے تو انھیں ٹکے رہنے کو کہا تھا۔ سفر کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ پھر ما اور با کے پیر کیونکر اکھڑ گئے؟

کیقباد اپنی ولا میں قتل کر دیا گیا تھا۔

کیقباد... وہ کیسے؟ وہ تو مسلمان تک نہیں تھا!... اور یہ ہندو مسلم فساد تھے۔

''دھوکے میں بائی!'' سوا جی ٹنکی والے نے بتایا تھا۔

''دھوکے میں؟'' ما کا منھ حیرت سے پھٹا رہ گیا تھا۔ ''کیقباد کا نام ہندوؤں جیسا نہیں تھا... اس لیے کیا؟ دھوکے میں مارا گیا؟''

''ہاں، نیچے سے کوئی آیا تھا۔ اِدھر کا نہیں تھا بائی۔''

دوسری صبح کیقباد کو اس کے بستر میں خون میں نہایا، اکڑا پڑا دیکھ کر بات پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد کیقباد کی وِلا مقامی لوگوں نے ہی لوٹی تھی۔

اب ما اور با کے لیے وہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ جب ایک واردات ہو گئی تھی تو اب بات ختم ہونے والی نہیں، پھیلنے والی تھی۔ پولیس کا دھیان ترائی کے قصبوں میں لگا تھا۔ پولیس تو پہاڑی پر

موجود ہی نہیں تھی... نابود ہو چکی تھی پہاڑی سے۔ سو جب موت کا خطرہ ہر طرف ہو، تو جان بچانے کی ایک کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔

سب سے آخر میں وِلا چھوڑنے والی ماتھی۔ اُشا کا ہاتھ تھام کر، ہینڈ بیگ سے سو پچاس روپے نکال کر، اس کے ہاتھ میں تھما کر، وہ نیچے جانا چاہ رہی تھی۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ تب تک کچھ اور خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کاشٹے کا لنگوٹ کسے ایک قلی عورت ابھی ابھی اُشا کے پاس سے گئی تھی۔ گود میں بچہ سنبھالے وہ تھوڑی دیر خاموشی سے باتیں کرتی رہی تھیں۔

''کیا کہتی تھی؟'' ما نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ کسی انجانی بولی میں سرگوشیوں نے اس کے بدترین خوف جگا دیے تھے۔ اس کا دل دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال آتا: یہ ٹیکسی ڈرائیور... ہمیں کہاں لے جائے گا؟

''کیقباد کو...'' اُشا نے آہستہ سے کہا، ''سرلا کے باپ نے مار ڈالا ہے!... اس کی رکھیل تھی نا، اس کے باپ نے۔ وارلی رات کو پہاڑ پر چڑھا۔ اِدھر اُدھر چاقو گھونپے جا رہے تھے... بس یہی موقع دیکھا۔''

اس انکشاف کو اپنے خوفزدہ دماغ میں سمونے کی کوشش کرتی ما ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ وہ کیقباد کے قتل میں دھوکے کے عنصر کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کس نے کس کو دھوکا دیا؟ دھوکا تو تھا... شاید دوہرا دھوکا... کیقباد مسلمان ہونے کے دھوکے میں نہیں مارا گیا... وارلی نے لوگوں کو دھوکا دیا کہ یہ ہندو مسلم فساد ہے۔

پھر اس کے ذہن سے الجھاؤ کی پھانس نکل گئی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی ساری قوت گاڑی کے چلنے میں لگا دی۔

ٹیکسی کا دروازہ بھڑاک سے بند کر کے، مشین کو ایک بھاری غراہٹ کے ساتھ چلا کر، مراٹھی میں کوئی نعرہ مار کر، پہاڑی ڈرائیور نے گاڑی کو پوری اندھادھند رفتار سے دوڑا دیا تھا۔

مضبوطی سے بچوں کو تھامے بیٹھی تھی ما... فرّاٹے سے آیتیں پڑھتی ہوئی... جیسے ذہن کا کوئی بند توڑ کر اس پر آیتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کیا اسے واقعی اتنی آیتیں یاد تھیں؟ اتنی زیادہ... شاید ہی کوئی آیت دہرائی ہو! زندگی بھر مطلب کے خبط میں گرفتار رہنے کی وجہ سے اسے ان سب آیتوں کے معنی معلوم تھے۔ لیکن اس وقت وہ معنی سے ماورا تھی... بلکہ معنی اس کی یکسوئی میں رکاوٹ تھے۔ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ وہ

کیا کہہ رہی ہے: کہ خدا رب العالمین ہے، کہ اس نے جمے خون کے لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا، کہ انسان خدا کا راز ہے اور خدا انسان کا راز ہے...

سواجی ٹیکسی والا فلم ایکٹروں کی حسین، جگمگاتی دنیا کے خواب میں مسحور ہو گیا تھا۔ اس کا سراپا ہی جیسے بدل گیا تھا۔ چمکیلے خواب کی سرایت سے اس کا چہرہ جگمگا گیا تھا۔ آنکھوں میں کہیں دور کا منظر اتر آیا تھا۔ ٹیکسی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ ''میں ابھی آتا ہوں'' کہہ کر وہیں ایک جھاڑی کے پیچھے پیشاب کرنے گیا تھا۔ تب ذرا فاصلے سے مانے اسے دیکھا تھا۔ بھورے آسمان تلے، جنگلی جھاڑی کے پاس رفع حاجت کرتا ہوا آدمی جس کے گویا عین سر پر ایک خواب، کسی بڑی سی طلائی، جگمگاتی بھنبھیری کی طرح گونجار کر رہا تھا اور منڈلا رہا تھا۔

ٹیکسی اس کے کنبے کو گود میں بھرے، پہاڑی ڈھلانوں سے چکراتی ہوئی، اندھا دھند نیچے اتر رہی تھی۔

مانے سرخ پہاڑ پر نظر ڈالی جس کی پُرشکوہ دراڑوں میں اسے تال نظر آیا۔ اسے سرلا کا چہرہ یاد آیا۔ اور پھر اسے یاد آیا، وٹھو کربٹ... وٹھو کربٹ کی سنائی ہوئی، گھنٹوں پر محیط داستان... اس کا کانکھتا، کانپتا لہجہ...

''وارلیوں نے کھاتے دار کو جنگل میں گھیر لیا تھا۔ نئیں نئیں! مارا پیٹا نہیں تھا۔ بس کپڑے اتارے، لنگوٹی پہنائی، ایک گٹھا لکڑی اس کے سر پر رکھی اور بولے: اُدھر جاؤ۔ اب اِدھر آؤ۔ اب اُدھر جاؤ۔ ہاہاہا!'' وہ ہنسا تھا۔ یاد سے اس کی بجھتی آنکھیں اور بھی دھندلا گئی تھیں۔ ''اور بولے: ہل میں جوتیں تیرے کو؟ کھاتے دار رو رہا تھا... کانپ رہا تھا۔ گوداوری مائی ایک دم ناراج ہوئی سن کر... گوداوری مائی ناراج ہوئی۔ ایسا کرنے کا نئیں! بولی۔ پن بائی، وہ تھوڑا ہنسی بھی تھی۔

''وارلی اکٹھا ہوا نا بائی، تو کھاتے دار سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ لوٹ کر آیا معالمت دار کے ساتھ۔ پن ہم سب کو تو مالوم تھا، ایسا ہی ہونا ہے... وارلی ایک کے پیچھے ایک گیا۔ ہزاروں وارلی...''

''ہزاروں؟'' مانے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں، ہزاروں... ایک دم لیف رائٹ لیف رائٹ... سینا کے جیسے۔ اور گوداوری مائی نے ایک دم بولا: ڈرنا نہیں۔ ہٹنا نہیں۔ ایک دم سیدھی بات۔ ڈھائی روپیہ اور تین روپیہ مجوری، اور گھاس کی کٹائی ساڑھے چار روپیہ۔ اکھیر کو مانا۔ پن پہلے کہاں! کتنے سو کو تو جیل میں ڈالا تھا۔ کتنے سو کو...''

گوداوری مائی!

گوداوری مائی کوئی دیوی نہیں تھی۔ وٹھو کربٹ کی داستانیں، اس کے کہن سال شکست و ریخت کے شکار دماغ کی بنائی اَنمل بے جوڑ تصویریں نہیں تھیں۔

گوداوری مائی... گوداوری پرولیکر، دراصل گوداوری گوکھلے ...انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ایک کارکن تھی، جیسا کہ اس پہاڑی سے اتر کر، بمبئی میں سنچری بازار کے پاس پارٹی آفس کے ریکارڈوں میں آپ کو پتہ چل سکتا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دوران، دو برسوں میں، اس کے کام نے زمینداروں کی مار کھاتے، بیگار بھرتے، ان کے اور پولیس کے ہاتھوں آئے دن قتل ہوتے آدی واسی وارلی کسانوں کو ایک حیرت انگیز تحریک کی صورت میں منظم کر دیا تھا۔

پارٹی آفس ریکارڈ۔ گوداوری گوکھلے کی تحریر۔

''یہ نومبر ۱۹۶۲ء کی بات ہے، جب میں اور دوسرے ساتھی جیل میں تھے، کہ مجھے کچھ یادداشتیں لکھنے کا خیال آیا۔ ۱۹۶۵ء میں جب ہمیں یروڑا سینٹرل جیل بھیجا گیا، میں نے کچھ لکھنا شروع کیا... لوگ سوچیں گے، میں آدی واسیوں میں کیوں گئی تھی۔ دراصل جب ۱۹۴۲ء میں ہمیں جیل سے رہائی ملی تھی، تب میں نے اور کامریڈ شام راؤ نے مہاراشٹر کے کسانوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر جب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں ہمیں دوبارہ جیل بھیجا گیا، تھانے ڈسٹرکٹ سے علاقہ بدر کرنے کے بعد...''

آنسوؤں کی ایک موٹی چادر نے ما کی آنکھوں میں یہ تحریر دھندلا دی تھی۔ مسلسل قید و بند کی، علاقہ بدری کی، وارلی کسانوں کے جھونپڑوں میں راتیں گذارنے کی، گھنے جنگلوں کو پیدل پار کرنے، پہاڑیوں پر، کھلے آسمان تلے راتیں بتانے کی، عدالتوں میں گھسیٹے لیے جانے کی ایک ششدر کرنے والی، دل چیر دینے والی داستان۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک۔

گوداوری مائی... ما آنسوؤں کے بیچ ہنسی... جسے چائے کی عادت تھی... جو جھونپڑیوں میں پورے دو سال رہی... اسے کھلے جنگل جانے کی عادت نہیں پڑ سکی... اسے باتھ روم کی تکلیف ہوتی تھی۔

''مگر جیت وارلیوں کی ہوئی،'' آگے لکھا تھا۔'' گھاس کا گٹھا آخر کار، ساڑھے چار روپے میں ہی لیا جانے لگا۔''

پارٹی آفس کے دھول بھرے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے حنوط شدہ اور مدفون یہ ایک کہانی تھی۔ ایک بھولی بسری داستان، جواب کسی کو بھی یاد نہیں۔ واقعات کے اس گتھے ہوئے بافتے میں، جسے کوئی جُلاہا اپنے کرگھے پر اَن گنت سوت کے دھاگوں سے لگاتار بُنے جا رہا ہے... یہ صرف ایک ڈور تھی، جس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا... جو اَن گنت رنگوں میں مل کر ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی ہے۔ گوداوری کی یاد البتہ اس نسل کے بڈھوں کے دلوں میں تھی۔

اس تحریک کو یاد رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی... کیونکہ یہ ایک کامیاب تحریک تھی۔ یہ اپنا چھوٹا سا مقصد پورا کر کے ختم ہوئی۔ جیسا کہ گوداوری پرولیکر نے لکھا، گھاس کا گٹھا بہرحال ساڑھے چار روپے میں خریدا جانے لگا تھا۔ چند ہی برسوں میں مہنگائی نے بڑھ کر ساڑھے چار روپے کو ایک فحش مذاق بنا دیا تھا۔ پر اس کا گوداوری کے جیون سے، اس کی کل نقدِ حیات سے تعلق نہیں تھا جو اس مراٹھن نے دن اور رات کے چھنچھناتے سکوں کی طرح وارلیوں پر نچھاور کر دی تھی اور جدید ادب کے تمام ثقہ اصولوں کو سرِ مو خاطر میں نہ لا کر، ایک لرزہ خیز، بامقصد زندگی گذاری تھی۔ وہ شاید اب زندہ نہ ہو، اور اس کی شب و روز کی محنت کسی خرچ کی ہوئی کائناتی توانائی کے انبار میں کہیں خلا میں چکراتی ہو؛ کیونکہ فراٹے سے آیتیں پڑھتی ہوئی ما کو بمبئی پہنچ کر ایک بوڑھے فلم ایکٹر سے ایک مکالمہ سن کر بھونچکا ہو جانا تھا کہ ''کرم کبھی ناش نہیں ہوتا۔''

محفوظ مقام پر پہنچ کر جب ان کی جان میں جان آئی تو غصے سے ما اور با کا خون کھولنا شروع ہوا۔ اس قدر اتیاچار! گھور ناانصافی! فوراً ایک بیان تیار کر کے وہ اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں سے دستخط کرانے کی مہم میں جٹ گئے۔ (انھیں یہی کام آتا تھا!)

''ہم اس خونریزی کی مذمت کرتے ہیں!'' بیان کا لبِ لباب یہ تھا۔

دستخط کرانے کے لیے با اسے فلم اسٹوڈیو لے گیا۔ آرٹ فلموں کا ایک سندھی ہدایتکار اس کا دوست تھا۔

وہ ایک دانشور تھا۔ ایک پُرکشش، دانشورانہ ڈاڑھی کا مالک، تقریباً ادھیڑ سندھی، جو ابھی تک جوان ہی نظر آتا تھا۔ وہ با سے پہلے مل چکا تھا، با کے دیہاتی پن پر رشک کر چکا تھا۔ وہ اپنی سرزمین سے اکھڑا ہوا تھا۔ سندھی ہونے کا احساس اس کے لیے تقریباً ایک پوشیدہ احساسِ جرم تھا۔ وہ کامیاب تھا اور ہندوستان کی دانشور دنیا اسے پُوج رہی تھی۔ لیکن وہ اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بمبئی میں، پورے ہندوستان میں، ایک 'غیر' ہے۔ وہ حسین سے حسین اور بامعنی فلمیں بناتا تھا۔ آدی واسیوں کا

استحصال اس کا موضوع تھا۔ لیکن کہاں تھے وہ لوگ جو اس کے اپنے ہوں؟ سب جانتے تھے کہ وہ سندھی ہے۔ با کا دیہاتی پن دیکھ کر وہ اس کے ساتھ کھل گیا تھا۔ اکیلے کسی کونے میں با کو گلے لگا کر رویا تھا۔

''بھوں بھوں... میں سندھی ہوں...''

با نے اس کو تسلی دی، سمجھایا۔

''وہاں تو سب مسلمان ہیں۔''

لیکن آرٹ فلموں کا ہدایتکار کون سا اعتقاد کرنے والا ہندو تھا! وہ تو ناستک تھا... لادین، دہریہ۔ ہندو ہونا اس کی شخصیت کی صرف ایک منفی، چوٹ کھانے والی جہت تھی، جس کے باعث اس کے خاندان کو اپنی جنم بھومی خواہ مخواہ چھوڑنی پڑی تھی۔ کیا فرق پڑتا اگر وہ سندھ میں ہوتا؟ ان لوگوں میں جن کی بولی، ریت رواج، موسیقی، سب کچھ اس کی اپنی انتڑیوں سے نکلتے ہوتے؟

''فرق پڑتا!'' با نے اسے سمجھایا تھا، ''بہت اچھا ہوا تم وہاں سے چلے آئے۔ اگر وہاں ہوتے تو کبھی آرٹ مووی نہ بنا پاتے۔ فلمیں وغیرہ تو وہاں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے غور کرنا چاہا۔

با کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس وجہ سے فلمیں اس کے وطن سے تقریباً ختم ہی ہو گئیں۔

''اگر میں ہوتا... تب دیکھتے!'' سندھی ہدایتکار نے جوش میں آ کر کہا۔

با ہنسنے لگا۔ ''کیا دیکھتے؟ کچھ بھی نہ ہوتا۔ بھئی، وہاں مارشل لا لگا رہتا ہے زیادہ تر۔ اور پھر... تم ہندو ہو یار!''

آرٹ مووی کا ہدایتکار جی مسوستا رہ گیا۔ اس کی زندگی کا المیہ اس کی ذات سے پرے، کہیں اور تھا، اور وہ یہ کہ ایک صوبے کی اکثریت مسلمان تھی جس کی وجہ سے وہ پاکستان میں شامل ہو گیا تھا، اور اسے اپنے کنبے سمیت ہندوستان آنا پڑا اور نہ جانے کتنی نسلوں تک ایک کبھی تذکرہ نہ کی جانے والی، مگر پتھر کی طرح سخت بے وطنی کو اپنے پیٹ میں جھیلنا پڑا... اور اس سلسلے میں کوئی کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ڈیموگرافی نے آرٹ فلموں کے سندھی ہدایتکار اور بے شمار سندھی ہندو شاعروں، کہانی کاروں اور دانشوروں کے ساتھ ہاتھ کر دیا تھا، جو اپنا تہذیبی وجود بچانے یا جس بھی پردیش میں رہ پڑے ہوں ان میں مل جانے کی دو متضاد خواہشوں کی چکی کے پاٹوں کے بیچ پسے جا رہے تھے۔

سندھی ہدایتکار مارکسی تھا، آدی واسیوں کی زندگی پر فلمیں بناتا تھا، لیکن عورتوں کے لیے اس کے خیالات اپنی ہی طرح کے تھے۔ اس کی تمام فلموں میں عورتیں کسی نہ کسی چیز کا استعارہ ہوتی تھیں... زیادہ تر مردوں کی غیرت کا استعارہ، جسے پامال کر کے بالائی طبقہ محنت کشوں پر ستم ڈھاتا تھا۔ یا پھر اگر وہ کافی پُر گوشت ہوں تو چمکتے کاسٹیوم پہنا کر وہ دنیاوی حرص و ہوس کا استعارہ بن سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو، وہ چپڑ چپڑ تقریریں نہیں جھاڑتی تھیں۔

ڈائریکٹر نے ما کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انٹلیکچوئل ٹائپ کی ہے۔ وہ تلخ ہنسی ہنسا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس طرح کی عورتیں دراصل کسی جنسی کجروی کے رجحان کو دبا کر، اس کے نعم البدل کے طور پر، انٹلیکچوئل بن گئی ہیں۔

اس وقت وہ ایڈیٹنگ روم میں، ایک کامنی سی حسین معاون کے ساتھ اپنی نئی فلم کے رش پرنٹ دیکھ رہا تھا۔

ما پر اس نے ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ اس کے تصور کو دھچکا لگا۔ ما ذرا بھی گلیمرس نہ تھی۔ بے ڈھنگے کپڑوں میں، اجاڑ صورت لیے ایک عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جب دستخط کرنے کے لیے ما نے کاغذ اس کے سامنے بڑھائے تو اس نے ایک نظر ڈالی۔ پھر کہا:

''اور مسلمانوں نے جھگڑا کیوں کیا؟ اڑتیس برس بعد پہلی بار بیچارے مراٹھوں نے گنپتی کا جلوس نکالنا چاہا تھا۔''

آرٹ فلموں کا ہدایتکار نکسل وادیوں کا ہمدرد تھا۔ اس کا دل ان کی تشدد کی حکمتِ عملی کا ساتھ دیتا تھا۔ شوسینا میں بھی غریب مراٹھے شامل تھے۔ وہ ان کے تشدد کے بارے میں کیا محسوس کرتا تھا؟ یہ وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ تو صاف صاف یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بھیتر چوٹ کھایا ہوا، اپنی جنم بھومی سے بلاقصور مار بھگایا ہوا جی خونی انقلاب کی آرزو کرتا ہے یا صرف تشدد کے لیے تڑپتا ہے۔

''شاید مسلمانوں نے غلطی کی،'' ما نے دانت بھینچ کر کہا، ''لیکن کسی بھی غلطی کی سزا پیٹھ میں چھرا گھونپ کر آگ میں جھونکنا نہیں ہوتی... یا ہوتی ہے؟ کیا یہ ایک اقلیت کے ساتھ بدترین ظلم نہیں ہوا؟''

ہدایتکار اور اس کی کامنی سی معاون متاثر ہو گئے۔ ہدایتکار شعوری طور پر غیر طبقاتی خونریزی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل نرم تھا۔ ان کے چہروں پر گمبھیر دکھ اتر آیا۔ مگر وہ خاموش تھے۔ کمرے میں ہر شخص خاموش تھا۔

''آخر اس وقت...'' ما نے کہا،''کوئی بھی ہندو سچ کیوں نہیں بول رہا ہے؟''

جیسے بجلی کا کرنٹ چھو جائے، وہ سب اس طرح چونکے۔ وہ ہکابکا رہ گئے۔ برسوں سے کسی نے ان کے منھ پر 'ہندو' کا لفظ اس طرح دے نہیں مارا تھا۔ جن حلقوں میں وہ اٹھتے بیٹھتے تھے، وہاں خیالوں کی، نظریات کی باتیں ہوتی تھیں۔ کوئی کسی کے مذہب کا ذکر اس طرح نہیں کرتا تھا۔ ما کے ہاتھ سے بیان کا کاغذ لے کر انھوں نے فوراً دستخط کر دیے۔

''ویسے...'' ہدایتکار نے گہری کڑواہٹ اور دبائے ہوئے غصے سے کہا،''ہم سب ہندو جاتی میں اتفاق سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ تو شاید آپ بھی جانتی ہوں، یہ ایک پیدائش کا حادثہ ہے۔''

''بس تو پیدائش، جو ہمارے بس میں نہیں، ہم پر کچھ ذمے داریاں ڈالتی ہے، اور انھیں جوں توں نبھانا ہی پڑے گا،'' ما بڑبڑائی۔ یہ اسے کون سی نئی بات بتا رہے ہیں؟ لیکن اس کا کیا علاج کہ ازروئے اتفاق یہ ہندو ہیں اور اس کاغذ کو انھی کے دستخطوں کی ضرورت تھی۔

ما کے ذہن میں اس وقت نہیں تھا، مگر بعد میں اسے خیال آیا: یہ تو کوئی گیتا کی سطریں تھیں۔ ''بس تو اے ارجن! یہ یدھ تو تجھے کرنا ہی ہے۔ تو چاہے یا نہ چاہے، اس کے لیے ذمے دار ہو یا نہ ہو، مگر جو فرض حالات نے تجھ پر ڈالا ہے اسے پورا کرنا ہی تیرا دھرم ہے۔'' بے خیالی میں فلم والوں کو گیتا کا اُپدیش دے کر مسلمنٹی رفو چکر ہوئی۔

السٹریٹڈ ویکلی نے سیاہ سرورق چھاپا اور اس پر سرخ حرفوں میں لکھا:''شرم!''

ہندوستانی لیکھکوں، فنکاروں، دانشوروں نے اس خونریزی کی مذمت کی تھی۔ ہندوستان کے اخبارات اس بہیمیت کی مذمت سے بھرے پڑے تھے۔ مگر وہ زیادہ تر انگریزی اخبار تھے۔ مسلمان انگریزی اخبار زیادہ تر نہیں پڑھتے تھے... شاید پڑھ سکتے بھی نہیں تھے۔ قیاس یہی ہے کہ پڑھے لکھے، روشن خیال ہندو طبقے میں اپنے لیے بےساختہ اٹھنے والی ہمدردی کی لہر سے مسلمان بےخبر ہی رہے ہوں گے۔

رات کو با اور ما نے شامل جی کے گھر جانے کی ٹھانی۔ طیب بھائی نے بمبئی میں انھیں کسی دوسرے ہم فرقہ کے خالی فلیٹ میں جوہو کے پاس ٹھہرا دیا تھا۔ شامل جی ہندوستانی فلموں کے ایک کیریکٹر ایکٹر تھے، لیکن

وہ برسوں سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی تھے۔ تقسیم سے پہلے وہ لمبے عرصے کراچی میں رہے تھے۔

بڑکی اور ِککلی اپنے کمرے میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔ کل ہم باہر نکلیں گے، دونوں بچیاں پروگرام بنا رہی تھیں۔ ما نے کمرے میں جھانکا۔ ایک منٹ کے لیے وہ دونوں کی ہیئت کذائی دیکھتی رہی۔ بڑکی نے الٹی سیدھی اس کی ساڑھی لپیٹ لی تھی۔ ایک دوپٹے سے ِککلی کو لہنگا سا پہنا دیا تھا۔ دونوں کے ماتھے پر چوڑی چوڑی بندیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑکی اپنے خیال میں ہندو ہونے کا بہروپ بھر رہی تھی اور حسبِ معمول خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

''تمھارا نام سیتا اور میرا نام گیتا۔ کوئی پوچھے تو یہی بتانا... سمجھیں؟''

''اچھا!'' ِککلی نے خوشی سے سر ہلایا۔ اس کے کان چھدے ہوئے نہیں تھے۔ بڑکی نے اپنے لمبے بندے اس کے بالوں میں پن سے لگا دیے تھے۔ ِککلی انھیں جھلانے کے لیے سر ہلا ہلا کر ہاں اور نا کہہ رہی تھی۔

ما منھ پر ہاتھ کر ہنسنے لگی۔

''ایسے ہوتے ہیں ہندو؟'' ما نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

بڑکی اور ِککلی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بڑکی نے اپنا اور ِککلی کا دل بھر کر حلیہ بیڑا تھا۔ کاجل کی لکیریں پھیر پھیر کر بھنویں کانوں تک کھینچ دی تھیں۔ ہونٹوں پر لال سرخ لپ اسٹک لگا کر انھیں چوڑا بنا دیا تھا۔

کھی کھی کرکے بڑکی ہنسی۔

''نہیں تو، مگر ما! ہم تو بن رہے ہیں نا... جھوٹ موٹ۔''

ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کے دل میں ایک زہریلی آرزو دعا کی طرح لہرائی، مار دے کوئی بلوائی مجھے خدا کرے... راستے بھر وہ ڈر سے کانپتی رہی تھی بلوائی کے چھرے کے خوف سے۔ راستے میں انھوں نے جلے ہوئے مکان دیکھے تھے۔ راستے کے کنارے منھ کے بل الٹی پڑی ہوئی ایک لاش دیکھی تھی۔ اور پھر جیسے ان پر ترس کھا کر سورج ڈوب گیا تھا... ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا تھا... ان منظروں کو اندھیرے نے چھپا دیا تھا۔ سوا جی ٹیکسی والا ابتدائی گیت گنگنا کر رفتہ رفتہ خاموش اور مغموم ہو گیا تھا۔

با نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کھنچے ہوئے لہجے میں ہوں ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ اس چھوٹی سی کھٹارا گاڑی میں ما اور اس کا کنبہ ہی تو ایک ہندو کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا:

وہ خود بھی تو مسلمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بمبئی کا رہنے والا بھی نہیں تھا۔ مسافروں کو ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچاتے ہوئے راستے میں کسی مسلمان علاقے سے گزرنے کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ٹیکسی ڈرائیوروں کے مخصوص لاابالی پن اور بے جگری کے سے انداز میں پوری رفتار سے گاڑی چلائے جا رہا تھا۔ صرف شامل جی سے ملتے ہوئے، ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے، وہ جیسے دوبارہ زندہ ہوا تھا... پھر سے پہلے جیسا بنا تھا۔ ایسا نہیں جیسا وہ بلوے والے دن تھا... فسادوں سے محفوظ فاصلے پر، فسادوں کی خبریں سن کر بلا سبب انگڑائی لیتا اور اینڈتا ہوا۔ وہ ایسا ہو گیا تھا جیسا وہ بلووں سے پہلے تھا۔ احاطے کی روشنی میں ما کو اس کی پرانی شناسا ہنسی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی، جب پہاڑی اسٹیشن پر وہ سواریاں بھرنے کے لیے جھٹ پٹ آوازیں لگاتا تھا۔

ما اور با صرف اس سے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے، رات پڑے شامل جی کے گھر چلے آئے تھے۔ سوا جی ٹیکسی والے کو شامل جی سے ملا کر وہ طیب بھائی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تھے۔ پھر خوف نے اپنا پُراسرار وقت پورا کر کے، تھکا مار کے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اچانک... اب ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ما کے دل میں اب ایک حقارت بھری بے فکری سما گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس میں اچانک کوئی آسمانی طاقت بھر گئی ہو۔ اس وقت وہ اپنی اصلی طاقت سے کہیں بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی... اور شاید گردن تڑوا بیٹھتی، کیونکہ یہ ایک وہم تھا۔

با اور ما کو شامل جی نے گلے سے لگایا۔

بوڑھے سینے کی گرمی اور شفقت محسوس کر کے ما تھرتھرا گئی۔ اس کی آسمانی طاقت غائب ہو گئی۔ اس نے مشکل سے آنسو ضبط کیے۔

''دیکھیے... یہ کیا ہو رہا ہے!'' ما نے شامل جی کے جھریوں بھرے ہاتھ تھام کر کہا۔ پھر وہ غرائی، ''اور آپ لوگ... آپ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے!''

بوڑھے شامل جی نے حیرت بھری مسکراہٹ سے منھ پھاڑ دیا۔

''تو کیا کریں ہم؟ ارے بھئی، ہم کیا کریں؟''

ان کی آواز میں بڑھاپے کی ہلکی سی لرزش تھی۔ فلموں میں کتنی بھلی لگتی تھی، ما نے حیرت بھری مسکراہٹ سے سوچا۔ مگر یہ تو اصلی شامل جی تھے... اصلی شامل جی! بالکل ویسے جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ شامل جی

کو اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر اسے فسادات یاد آئے۔ اس کا دل پھر غم اور غصے سے تڑپا۔

''اب یہاں نام پوچھ پوچھ کر چھرے گھونپے جا رہے ہیں۔''

''تو تم سمجھتی ہو مجھے کوئی چھرا نہیں گھونپ سکتا؟ مجھے تو مسلمان بھی مار سکتے ہیں اور ہندو بھی۔ فرقہ پرست لوگ سیکولر آدمی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔''

ما یہ بات جانتی تھی، مگر اس کے سینے میں دل کسی پتھر کھائے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''دیکھو...'' شامل جی نے کہا، ''اب ہمارا راج تو ہے نہیں۔ ہمارا راج ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ جہاں کمیونسٹ حکومتیں ہیں، وہاں کبھی سنا بلوہ فساد ہوتا؟ کیرالہ ہے، بنگال ہے، وہاں کبھی سنا؟''

ما ڈبڈبائی آنکھوں سے شامل جی کا منھ تکتی رہی۔ یہ سچ تھا، نہ مغربی بنگال اور نہ کیرالہ میں... ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا تھا وہاں۔

شامل جی نے اسے اپنے بڑھے سینے سے بھینچ لیا۔ ''جب انقلاب آ جائے گا نا... تب نہیں ہوگا ایسا۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

جب انقلاب آ جائے گا!

ما جھٹکے سے شامل جی سے علیحدہ ہوگئی۔

''مگر انقلاب نہیں آ رہا ہے شامل جی!'' اس نے بے بس غصے سے کہا۔ اچانک وہ شامل جی پر اس طرح برسنے کے خیال سے شرمندہ ہوئی۔ لیکن وہ دہاڑیں مار مار کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی مشین کی طرح کہا، ''اور میرا خیال ہے کہ...''

''کیا؟''

''کہ بنگال اور کیرالہ میں بھی...'' اتنا کہہ کر بات اس کے ذہن میں پھر الجھ گئی۔

''یہ تو سچ ہے،'' ما نے مانا، ''کہ بنگال اور کیرالہ میں فساد نہیں ہوتے... کمیونسٹ حکومتیں اس میں حصے دار نہیں ہوتیں، لیکن... یہ اتفاق ہے۔''

''اتفاق؟''

''نہیں... کمیونسٹوں کا فساد نہ کروانا اتفاق نہیں۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ بنگال اور کیرالہ میں کمیونسٹ حکومتیں ہیں۔ میرا مطلب ہے، اصل میں تو یہ شمالی ہندوستان کے غلبے کے خلاف... ایک قوم پرست تحریک

ہے، بنگال میں اور کیرالہ میں۔ یو پی کی لیڈر شپ کے پیچھے نہیں چلنا چاہتے یہ لوگ...'' اس نے پریشانی میں وہ بات کہہ ہی ڈالی جو نہ جانے کب سے اس کے دل میں آ چکی تھی... جسے وہ کھل کر خود بھی تسلیم نہ کرتی تھی۔

''نہیں! نہیں نہیں!'' شامل جی نے نفی میں انگلی ہلائی۔ ''کیرالہ میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔''

''تعلیم!'' ما چلاّئی، ''تعلیم سے فرقہ پرستی کہاں جاتی ہے؟ آپ نے فرقہ پرست موضوعات پر ڈاکٹریٹ کی تھیسس نہیں دیکھیں؟''

اسے بنارس یونیورسٹی کی چھاپی ایک کتاب کا خیال آیا: ''اکبر کے دور میں ہندوؤں کی اصلی بدحالی۔'' کسی مہاشے نے ڈاکٹریٹ کے لیے لکھی تھی۔

''بات یہ ہے...'' اس نے خود کو کہتے سنا، جیسے یہ اس کی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ ''کہ نظریات سے فرقہ پرستی نہیں جاتی ہے۔''

اس وقت اس کے دل میں کوئی پھوٹ کر رو یا تھا۔ اپنی بات سن کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے دنیا اس کے سر پر گھوم رہی ہے۔

''بات یہ ہے کہ ...بات نظریاتی نہیں ہے۔ شامل جی!'' ما نے آنسو پی کر کہا، ''یہ تو انبوہ کی بڑی قدیم مادی جبلتیں ہیں... گلہ بنانے کی گلے سے جڑے رہنے کی... جو نظریاتی روپ دھارن کر لیتی ہیں۔''

''کیا؟ تم طبقاتی اتحاد کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو؟''

''طبقاتی ...ہاں،'' ما نے کہا، ''مگر نظریاتی ... نہیں!''

''بات یہ ہے کہ...'' ما نے سوچ سوچ کر بات منھ سے نکالی، ''لمبے دورانیے میں جو آپ دیکھو تو... شیعہ مزدور شیعہ سرمایہ دار کے خلاف ...دوسرے مزدوروں کے ساتھ اتحاد کر لیں۔ یعنی اگر کہیں فرض کیجیے بس یہی دو فرقے رہتے ہوں تو... پر ایک لمبے دورانیے میں ... سنی مزدور بھی اگر شامل ہو جائیں ... تو پھر وہ دونوں دیر تک ساتھ جائیں گے نہیں۔''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!'' شامل جی نے رسان سے کہا، ''وہ تو سب جانتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ مذہب افیون ہے معاشرے کے لیے...''

''اس کا تعلق مذہب سے کہاں ہے شامل جی!'' ما بے ساختہ چلاّئی۔

کس چیز سے تعلق تھا اس کا؟ یہ بات خود اس کے ذہن میں صاف نہیں تھی۔ دماغ کے کسی اندھیرے

گوشے سے، جیسے خون اور حرام مغز کے ذروں سے کھینچ کھینچ کر، نکال کر، اس نے کہنا چاہا: ''نا منطق سے... اس چیز سے جو سمجھ کے الٹ ہے... جو انتڑیوں میں ہے... خون میں، گوشت میں جو بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے... جو مرتا ہے... مرنے سے ڈرتا ہے... جو اندھا ہے... اندھا اور گونگا بہرا... مذہب تو سمجھ ہے۔ مذہب سے آدمی کا رشتہ ہے کتنا؟ شاید ایک فی صد بھی نہیں... جس نے آدمی کی کھال بھی نہیں کھرچی۔ اسلام نے نادر شاہ کو مجبور نہ کیا کہ دلی میں کھوپڑیوں کے مندر نہ چنے۔ اور بدھ مت نے جاپانیوں کو نہ سکھایا کہ سونے کی انگوٹھی کے لیے جنگی قیدیوں کی انگلیاں کاٹ لیں۔ اور عیسائیت نے امریکنوں کو مائی لائی میں نہ روکا کہ بڈھی ویتنامی عورتوں کو... مجبور نہ کریں جبکہ وہ درختوں سے بندھے ان کے بیٹوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوں ...مذہب ہو... یا نظریہ ...سو تو سمجھ ہے شامل جی۔ شاید روح ہوتی ہوگی...''

مبہوت سے کھڑے شامل جی اس کی بات سن رہے تھے۔ پھر وہ ایک لمبی تھرتھراتی سانس لے کر بیٹھ گئے۔

''تم اتنی باتیں کرتی ہو...'' انھوں نے کہا، ''آدمی ہندو ہے، مگر بنگالی بھی تو ہے۔ وہ مسلمان ہے مگر میمن بھی تو ہے۔ فلاں یہ ہے مگر وہ بھی تو ہے۔ لیکن ابھی... فی الحال، پہاڑ میں جانے کن ہزاروں سال پرانے چکروں میں پڑ کر، ایک بات تو نکلی ہوئی ہے تمھارے دماغ سے۔ بھئی، آدمی آدمی ہے، مگر سرمایہ دار بھی تو ہے۔ ہوتی ہے ایک چیز طبقاتی کردار بھی! کون کراتا ہے بھئی یہ فساد؟ جانتی ہو؟ پراپرٹی ڈیویلپرز... کنسٹرکشن کمپنیوں والے۔ جانتی ہو کیوں؟ جھونپڑ پٹیاں جو ہیں نا انھیں خالی کرانے کے لیے... ان پر کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے لیے۔ غریب مراٹھوں کو پیسے دے دلا کر، ٹھرا پلا کر کرواتے ہیں خون خرابہ۔ سرکاری افسروں کو، سیاسی لیڈروں کو، سب کو پیسہ کھلاتے ہیں... اور سب کھاتے ہیں پیسہ...'' پھر وہ تھم کر بولے:

''اس سے پہلے بھی ہوئے ہیں فساد۔ پہلے تاملوں سے ہوئے۔ وہ بھی مزدور سارے... بیچارے غریب... آگئے یہاں۔ بھئی روزگار جو ملتا ہے، اس لیے آگئے۔ مال گودی ہے یہاں۔ بڑا پورٹ ہے۔ جہاں پورٹ ہوگا، لوگ آ جائیں گے اِدھر اُدھر سے۔ کلکتہ میں دیکھو، کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں لوگ۔ پھر گھر بھی واپس جاتے ہیں رات کو۔ دن میں کلکتہ کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے۔''

ما نے تاملوں کے فسادات کا سوچنے کی کوشش کی... بس ایک بار ہوئے تھے... اس کے دماغ میں آیا... اور ہندو مسلم دنگے، ہر روز، ہر مہینے!

''یہاں پراپرٹی ڈیویلپرز... اور دوسری جگہ کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے۔ کہیں کی حکومت گرانی ہو تو ہندو مسلم فساد کرا دیتے ہیں۔ کہیں کانگریس کی مخالفت پیدا کرنی ہو، یا کہیں حمایت پیدا کرنی ہو، تب ہندو مسلم فسادات کرا دیتے ہیں۔ کسی کو مندر کے نام پر پیسے اکٹھے کرنے ہوں، تب ہندو مسلم... بلی کے بکرے ہیں مسلمان؟''

شامل جی کا منہ اتر گیا۔ ہوش سنبھال کر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے اپنے دل میں مذہبی نفرت نہ تھی۔ وہ مذہبی لڑائیوں کو سمجھنے سے قاصر تھے کیا؟ کیا انھیں پتہ نہیں چلتا کہ ... کہ کیسا لگتا ہے؟ مانے عاجز آ کر سوچا۔ پھر اسے یاد آیا۔ پتہ کیسے نہیں لگتا ہوگا! شامل جی خود سنہ سینتالیس کے فسادات میں کراچی سے آئے تھے۔ اسے خیال آیا کہ مسلمانوں نے بھی یہی کچھ کیا۔ اسے خیال آیا کہ کافی عرصے تک مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں نے ہندو مسلم فسادات جاری رکھے، بنگالی ہندوؤں کو مار بھگانے، ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لینے کے لیے ...اس کے اپنے والے حصے میں، مغربی پاکستان میں نہیں ہوتے ہندو مسلم فساد۔ لیکن وہاں اب ہندو ہیں ہی کتنے؟ دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ سندھ میں ہیں تھوڑے بہت، پڑے ہوئے کہیں کونے کھدرے میں۔ اور یہاں... یہاں ہیں مسلمان... کروڑوں ہیں، دور دور تک پھیلے ہوئے... عجیب طرح سے... گاؤں گاؤں... کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں مشکل سے ہوگا جہاں دو چار گھر نہ ہوں مسلمانوں کے۔

کتنے ہیں مسلمان یہاں؟ وہ سوچ رہی تھی۔ بارہ کروڑ۔ کوئی کہتا ہے پندرہ کروڑ۔ پھر بھی کم ہیں۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اسے گوینکر کی بات یاد آئی۔ یہ آدی واسی۔ آدی واسی بھی ہندو ہی بنیں گے؟ ایز از ویئر از کی بنیاد پر؟ کوئی ہندو مراٹھا بن جائے گا۔ کوئی ہندو تامل بن جائے گا۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ اور بڑھ جائیں گے ہندو! اس کا بس چلتا تو کسی جادو سے ایک ایک مسلمان کے ہزار ہزار بچے پیدا کر کے، آناً فاناً مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر کر دیتی... پھر دیکھتے، کیسے کرتے ہیں یہ خونریزی!

''کیا سوچ رہی ہو؟'' شامل جی نے پیار سے پوچھا۔ مانے بے بسی سے ان کا منہ تکا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ شرم کے مارے وہ شامل جی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ اصل میں کیا سوچ رہی تھی۔ آخر کیوں؟ دل کی کون سی تہہ اس کے خیالوں کو گھٹیا سمجھ رہی تھی؟ اس نے کوشش سے جھجک مٹا کر بے خوفی سے بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''سوچ رہی تھی کہ مسلمان کتنے کروڑ ہیں یہاں... برابر برابر ہوتے ہندو مسلمان تو اچھا رہتا۔''

''کیوں؟'' شامل جی ہنسے۔ ''تب خوب مقابلہ رہتا؟ برابر برابر کا؟''
ما گھبرائی ہوئی پھیکی ہنسی ہنس دی۔ ''نہیں... تب شاید نہ ہوتے فسادات...''
شامل جی اداسی سے ہنسنے لگے۔
''یہ گنتی مت کرو،'' انھوں نے کہا۔ ''گنتی سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے گنتی سے؟ جو تم سمجھ رہی ہو اس کا الٹ دیکھو...'' بوڑھے شامل جی نے اسے دھیان دلایا۔ ''جہاں مسلمان کم ہیں، بالکل کم، وہاں نہیں ہوتے فساد۔ تامل ناڈ میں نہیں... کرناٹک میں نہیں۔ جہاں زیادہ ہیں، برابر تک پہنچ رہے ہیں، وہاں بڑی زور سے ہوتے ہیں۔ ہے نا؟''
شامل جی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ما گڑبڑا گئی۔ اسے اپنا بچکانہ حساب کتاب بے سود لگا۔ پھر وہ بڑبڑائی:
''کچھ بھی ہو شامل جی، ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے... شدید عدم تحفظ کا عالم ہے...''
''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ چیزوں کو معروضی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ تم تو بالکل ہلی ہوئی ہو جڑ بنیاد سے اس وقت!'' شامل جی نے کچھ تاسف سے کہا۔
ما سچ مچ ہل گئی تھی... انسان ہی تو تھی وہ... کوئی فرشتہ تو نہیں تھی۔ آخر اس نے نگاہیں اٹھا کر کہا:
''معروضی کیا مطلب؟ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ قتل ہونے والوں سے آپ توقع کرتے ہیں کہ سمجھداری سے صورتِ حال پر غور فرمائیں گے! قتل ہونے والا سمجھداری سے نہیں سوچ سکتا۔''
''ہاں!'' شامل جی ہنسے۔ ''قتل کرنے والا بھی سمجھداری سے نہیں سوچ سکتا...'' لیکن شامل جی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات ان کے لیے بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہ تھی۔ وہ ایک نظریاتی آدمی تھے، پرانے کمیونسٹ۔ ساری فلمی مصروفیات کے باوجود پابندی سے پارٹی میٹنگ میں شامل ہوتے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ انسان تھے، پُرخلوص اور گرمجوش۔ ما کی سراسر غیر کمیونسٹ باتوں نے انھیں اندر سے جھنجھوڑ سا دیا تھا۔
شامل جی کمرے میں ٹہلنے لگے۔
''یہ... مسلمان... یہ مسلمان...'' شامل جی نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔
شامل جی کہاں کے رہنے والے تھے؟ کسی عجیب و غریب اتفاق سے وہ صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے۔ ان کی آنکھیں ہلکی بھوری تھیں۔ ان کے باپ دادا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ شین قاف

درست ہونے کی وجہ سے انھیں ہندوستانی فلموں میں مسلمان کا رول دیا جاتا تھا، جیسا کہ اکثر فلموں میں ٹوکن کے طور پر ایک نیک مسلمان بوڑھے کا کردار دکھایا جاتا ہے۔

''کیا کریں مسلمان؟'' ما بڑبڑائی۔

''پڑھیں... لکھیں...'' وہ ٹہلتے ٹہلتے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ پھر انھیں کچھ خیال آیا۔

''انگریزی پڑھیں، انگریزی۔ چھوڑیں یہ مدرسے و درسے کا کلچر... اردو مدرسہ، ہنھ!'' انھوں نے منھ پچکایا۔''آگ لگائیں اسے۔ بس انگریزی پڑھیں۔ کمپیوٹر!'' شامل جی کو سوجھا۔''کمپیوٹر سیکھیں۔ میں تو کہتا ہوں...'' انھوں نے اپنی ہلکی سی لرزش زدہ آواز میں کہا،''ہندوستان میں جتنے کھاتے پیتے مسلمان ہیں، جگہ جگہ، قصبے قصبے، شہر شہر... مسلم انگلش اسکول بنائیں۔ بس لگا دیں اس کام میں اپنے آپ کو۔ یہی حل ہے اس مسئلے کا۔''

بنا کسی وضاحت کے شامل جی اپنی بات کہے چلے جا رہے تھے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ کیا فسادات رک جائیں گے؟ ما کو انگریزی پڑھنے کا اور کمپیوٹر سیکھنے کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور نہ شامل جی کوئی تعلق بتا پا رہے تھے۔ آخر کیوں پڑھیں انگریزی؟ اس کے بدلے... اس کے بدلے ہتھیار کیوں نہ جمع کریں؟

مگر شامل جی ایک لمبی تقریر میں مصروف تھے، اور چھت کی طرف انگلی اٹھا کر تقریباً چھت سے لگے پنکھے سے مخاطب تھے۔ آخر ما سے نہ رہا گیا۔ اس نے شامل جی کا بازو ہلا کر کہا،''لیکن کیا اس سے فسادات رک جائیں گے؟''

شامل جی اچانک رک گئے۔ شاید انھوں نے اپنی بے ربط تقریر پر خود غور کیا۔ بات تو فسادات کی ہو رہی تھی۔

''فسادات... تو نہیں رکیں گے،'' شامل جی نے کاغذ کی طرح کوری آواز میں کہا،''لیکن...''

''لیکن کیا؟'' ما نے بیتابی سے پوچھا۔

''لیکن...'' شامل جی نے نہ جانے کس یقین سے کہا،''ہندوستان میں مسلمانوں کو آج... ایک نئے سر سید کی ضرورت ہے۔''

ما کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔''سر سید کی؟'' اس نے نہایت حیرت زدہ ہو کر یاد کیا کہ واقعی

سرسید... سرسید نے کہا تھا کہ انگریزی پڑھو... انگریزی... انگریزی تعلیم... یہ بات کبھی اسکول میں پڑھی تھی اور اب کب کی بھول چکی تھی۔

''مگر اُس وقت تو... اس وقت تو انگریز تھے یہاں شامل جی۔ اب تو شاید... ہندی پڑھنی چاہیے،'' ما نے بلا سوچے سمجھے کہا۔

''ارے نہیں!'' شامل جی جھنجھلائے۔ ''جھوٹ بول رہے ہیں سب کمبخت! یہ خود کوئی ہندی وندی نہیں پڑھ رہے ہیں۔ انگریزی پڑھ رہے ہیں سب... اور کمپیوٹر سیکھ رہے ہیں۔'' پھر انھوں نے سکون سے کہا، ''تب پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پچاس ساٹھ برس میں... رُل گُھل کر... ٹھیک ہو جائے گا۔''

ما کے ذہن میں کئی خیال اکٹھے آ رہے تھے۔ سرسید کے خیال نے اس کی منجمد یادداشت کو چونکا دیا تھا۔ اور دوسرا خیال اسے یہ آ رہا تھا — جس نے اسے تھوڑا سا محظوظ اور کافی حیران کیا تھا — کہ شامل جی بالکل مسلمان لگ رہے تھے۔ فلموں میں مسلمانوں کا کردار ادا کرتے کرتے بالکل مسلمان ہو گئے کیا؟

اور تیسرا خیال... چونکانے والا، آنکھوں میں پانی لے آنے والا خیال... تو شامل جی جانتے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ انقلاب وغیرہ نہیں آئے گا۔ یونہی اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں... دھوکا دیتے ہیں اپنے آپ کو... اور طیب بھائی... طیب بھائی بھی جانتے ہیں کیا؟ کیوں اپنے فرقے کی اصلاح کرنے کے پیچھے لگے رہتے ہیں؟ جانتے ہیں کہ رہے گا تو یہی فرقہ۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ انقلاب... انقلاب شاید نہیں آئے گا!

''اور دوسری بات یہ...'' شامل جی ٹہلتے ٹہلتے تھم کر بلند آواز سے کہہ رہے تھے، ''کہ کرم کبھی ناش نہیں ہوتا۔'' شامل جی کے اندر شاید اس گھڑی، جب وہ محتاط نہ تھے، ان کی نانی اور پرنانی اور دادی اور پردادی نے مل کر کہا تھا۔

ما بھونچکا رہ گئی۔

پھر دل کے کسی پاتال سے اچھلتا اس کی آنکھ میں پانی آ گیا۔

''ہندو ہیں شامل جی!'' اس کے دل نے سوچا اور ایک انجانی تعظیم سے خم ہو گیا۔

''رواداری سے کام لینا چاہیے... بھلمنساہٹ... رواداری...'' دھیرے دھیرے شامل جی کچھ کچھ کہتے جا رہے تھے... جیسے اپنے اپنے آپ سے...

ما نے سوچتے ہوئے کہا، ''اب تو یہ نیا تصور بھی نکلا ہے کہ کھچڑی کی دیگ...''

''کھچڑی؟''

ما شرمندہ ہوگئی۔ پھر اس نے کچھ ہنس کر کہا، ''میں... ایک اخبار میں مضمون تھا کہ ہم شاید کھچڑی کی دیگ نہیں ہیں...''

''پھر کیا ہیں ہم؟''

''سلاد کا پیالہ ہیں،'' ما ہنسی، ''یعنی سب کے ذائقے الگ الگ۔''

شامل جی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ دیر تک ہنستے رہے شامل جی۔ ان کے گلے میں پھندا لگ گیا۔ انھوں نے ایک گلاس پانی پیا اور کہا:

''الّو کے پٹھے ہیں ہم اصل میں تو...'' پھر انھوں نے کہا، ''کھچڑی کی دیگ میں اوندھا یا سلاد کا پیالہ! جو کسی سے نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔''

ما خاموش ہوگئی۔ اسے پھر سرسید کا خیال آ رہا تھا۔ گھنی سفید ڈاڑھی... اسکول کی کتابوں کے صفحوں سے نکل کر کوئی تصویر اس کی آنکھوں میں سما رہی تھی۔ اور یادیں... جھولی پھیلا پھیلا کر چندہ مانگتے تھے۔ انگریزی تعلیم... انگریزی تعلیم... مسلمانو، انگریزی تعلیم حاصل کرو... تحریک کامیاب ہوگئی۔ مسلمانوں نے — کچھ مسلمانوں نے — پڑھا لکھا اور پھر؟ ما کے دماغ میں ایک خیال چمکا۔ پھر انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا... پاکستان کا مطالبہ! ہندوستان کو تقسیم کرنے کا! ہندو اور مسلمانوں نے پڑھ لکھ کر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کا گیت نہیں گایا۔ پڑھنے لکھنے کے بعد ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں... بجّا دیا... ہے لخ لعنت تھک تھئی! ما کے ذہن میں سندھی لعنت کا طریقہ گھوما... اور ایک دوسرے پر تھوک کے الگ ہوگئے۔

سب ہی لوگ دن رات، ہر گھڑی کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونے کی فکر میں گرفتار... سندھی... بنگالی... اور انھیں بالکل اندازہ نہیں (ما دل میں قہہ قہہ کر کے ہنسی) کہ الگ ہو کر پھر وہ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہی رہ جاتے ہیں... جوں کے توں رہ جاتے ہیں حالات اس ہندوستان میں تو... کیونکہ یہ ایک جادو ہے (اس نے سوچا) جسے پراچین کالوں میں باہمنوں نے بنوں میں مچھر مارتے ہوئے کھوجا۔

''چیزیں بدلتی ہیں،'' انھوں نے کہا ہوگا۔ اور پھر اکتا کر جمائی لے کر اضافہ کیا ہوگا، ''اور پھر جوں کی

توں بھی رہ جاتی ہیں۔''

کیوں بھئی؟

''کیونکہ... چیزیں اور کائنات کے مظاہر ہی تو بھگوان ہیں۔ اب بھگوان کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ چاہے ایک سے دو ہو جائے... دو سے ہزار... اور پھر بھی ایک کا ایک ہی رہے۔''

ظاہر ہے، اس جواز کا ردتو ناممکن تھا۔

شامل جی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

''کھانا نہیں کھاؤ گی؟'' انھوں نے کہا، ''کہ اور کوئی بات رہ گئی ہے؟''

ما نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

''اور کوئی عالمی مسئلہ جسے ہم حل کر سکتے ہوں اس سمے؟''

ما کھسیانی ہوگئی... بری طرح شرمندہ... اپنے مچھر سے بھی کم حیثیت، بُھنگے جیسا ہونے کے انکشاف پر... اپنی بیہودہ بڑک بازیوں پر... شامل جی نے ان کے لیے کھانا بنوایا تھا اور وہ اسے کب سے ٹھنڈا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے منھ پر آئے ''کیا کچھ نہیں ہوسکتا؟'' کے قابلِ رحم لجلجے سوال کو دل میں واپس پھینک دیا۔

فسادات کی مردہ رات ان کے اوپر سے گھسٹتی ہوئی گزر رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ کرتے رہیں گے۔

اس نے سوچا:

آدمی آدمی کو کب قتل کرتا ہے؟

غصے میں؟ ہاں۔

لالچ میں؟ ہاں۔

خوف میں؟ ہاں۔

اور ویسے؟

اور ویسے... اس کی مرضی!

اور کب محبت کرتا ہے آدمی آدمی سے؟

اس کے تھکے دماغ میں ایک رقص سا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی پر الاؤ جلا کر ڈھیر سے آدمی واسی

اس کے گرد ناچ رہے ہوں... اوراوپر گھنگھور سیاہ گھٹاؤں میں بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں...

اس سوال پر جیسے پہاڑوں میں زور سے دھماکا ہوا ہو... دور تک تالیاں سی بجتی ہوئیں...

''آدمی آدمی سے محبت نہیں کرتا!''

جیسے خدا نے سختی سے کہا ہو۔

غلط ... ما نے سوچا۔ وہ اب کھانا کھانے جارہی تھی، شامل جی کی بانہہ میں بانہہ ڈالے۔ وہ شامل جی سے محبت کررہی تھی۔ اور درآں حالے کہ اس بات کا ٹھوس ثبوت، ... پرنتو یہ بات اس میز، اس کرسی، اس پلیٹ اور چاول دال جتنی حقیقی تھی۔

ما نے پلیٹ میں دال چاول ڈالے۔

اور آدمی میں سمجھ کب آتی ہے؟

کیا پیٹ میں روٹی پڑنے سے؟

ہاں، ایک طرح کی۔

کیا بھوکے رہنے سے؟

ہاں، ایک دوسری طرح کی۔

اور دونوں صورتوں میں ... ایک تیسری طرح کی سمجھ خبط ہو جاتی ہے۔

دیوتاؤں نے گرج چمک میں کوئی سریلا قہقہہ لگایا اور ناچتے رہے۔

''تم جیت نہیں سکتے،'' انھوں نے کہا۔

''اور آدی واسی... یہ آدی واسی جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہندوستان میں اناج بینتے، اور کاشت بھی کرتے، کسی نوبل سے وتیج (noble savage) کسی شاندار بن دیوتا کا جیون نہیں بتاتے تھے،'' کوسمبی نے کہا (اپنی کتاب میں)۔''ان کے قبیلوں کا سردار ہوتا تھا۔ پنچ ہوتے تھے، پر پنچ سرداروں کے خلاف مشکل ہی سے جاتے ہوں گے۔ یہ شاید اپنے دیوتاؤں پر انسانی قربانیاں بھی کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے جنگیں کرتے تھے۔

''یہ ایسا سانچا ہے منش کے جیون کا، کئی کالوں سے گزرتا ہوا، جس کی ایک پرت بالکل دوسری ہی پرت جیسی ہے۔

''اوران کا کچھ بھی سانجھا نہیں تھا۔ سب کے دیوی دیوتا الگ اور بولیاں...''

ہاں، بولیاں؟

''وہ...'' کتاب نے قہقہہ لگایا ''چودہ کوس پر سب کی الگ الگ بولیاں تھیں... اور ہیں...''

ما بھی خوب ہنسی۔

اتحاد کی، ماشاءاللہ سے، کسی قسم کی کوئی گنجائش چھوڑی نہیں گئی... یہاں، یعنی کہ اس برصغیر میں۔

کھانے کے بعد شامل جی نے انھیں خود کافی بنا کر پلائی۔ ان کی جھک سپید بالوں والی، دبلی پتلی، پٹھان پتنی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھیں۔

''ہندوستان کی موجودہ، کثیر التصادم صورتِ حال اگر باریکی سے دیکھا جائے تو قبل از تاریخ ہندوستان ہی کا ایک عکس ہے،'' کتاب نے کہا، ''دھرتی کے اس ٹکڑے پر جیون بتانے والے آدی واسیوں کی صورتِ حال کا۔''

''مارو سالوں کو!'' ما نے جیسے کسی نشے میں کہا۔

''اب دو بجے کہاں جاؤ گے؟ یہیں سو جاؤ۔''

''نہیں، بچے اکیلے ہیں شامل جی۔''

فسادات کی پُرخطر رات میں، شامل جی انھیں اپنی گاڑی میں خود ڈرائیو کر کے ان کے فلیٹ کی طرف لے چلے۔ ان کا ڈرائیور فسادوں سے گھرے کسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ چار دن سے نہیں آیا تھا۔

راستے میں شامل جی ان سے باتیں کرتے رہے... پیار بھری باتیں۔

''تم لوگ ضرور کامیاب ہو گے، کوئی کچھ بھی کہے۔''

(ہندوستان میں کچھ لوگ ان سے کہتے: ''جمہوریت؟ پاکستان میں؟ کسی دوسرے مسلم ملک میں بھی آئی ہے جمہوریت؟'')

''وہ لوگ بہت عظیم ہیں،'' شامل جی کہہ رہے تھے۔ ''جب میں کراچی میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں میں کام کرتا تھا...''

(لوگ بتاتے: ہر پارٹی میٹنگ میں شامل جی اپنی بات اسی جملے سے شروع کرتے تھے: ''جب میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری میں...'')

''اور میں تو کہتا ہوں...'' شامل جی نے کہا، ''یہاں، ہندوستان میں آئے یا نہ آئے ... لیکن وہاں، پاکستان میں انقلاب ضرور آئے گا... وہ لوگ... دوسری طرح کے ہیں وہ لوگ... مجھے ان سے پوری امید ہے۔''

شامل جی نے اپنا بوڑھا، اشتیاق اور یقین اور امید کی پوپلی مسکراہٹ سے روشن چہرہ پچھلی سیٹ میں بیٹھے اپنے مہمانوں کی طرف موڑ کر کہا۔

انھیں فلیٹ پر چھوڑ کر اندھیرے میں وہ اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

''تم نے کیوں اسے پتہ دے دیا؟'' با نے تلملا کر کہا تھا، ''نیچے فساد ہو رہے ہیں۔ یہ شوسینا کا لڑکا...''

ما نے دھر مانند کو کیوں بمبئی کا پتہ دے دیا تھا؟ ما کو خود ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ بس دے دیا تھا... شاید اس کی کئی وجوہات ہوں... ایک تو لڑکے کی بے خوفی پر، بازار میں، بغیر تعارف اس سے بھڑ جانے پر، ما کا دل اس لڑکے کی طرف کھنچ گیا تھا۔ اس کی بدحالی اور قومی جوش کے تضاد نے ما کا دل کاٹ سا دیا تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی تھی... خوف...

با خوف سے اپنے اندر سمٹ رہا تھا۔ وہ سوچتا: ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ کسی ہندو سے بات کرنا اس وقت ٹھیک نہیں۔

ما خوف سے پھیل رہی تھی۔ کہا جا سکتا ہے وہ خوف سے لڑ رہی تھی۔ وہ سوچتی: ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ اس وقت کسی ہندو سے فوراً بات کرنی چاہیے۔ اپنا آپ، چھپا کر رکھنے سے، اکیلا ہے، کانپ رہا ہے۔

لیکن دھر مانند نے تو سچ مچ اسے فون کیا۔ بمبئی کے ایک اخبار میں اس نے ان کے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھ لی تھی۔ اس طرح وہ اس کی نظر میں معتبر بن گئے تھے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس لیے ان کے فلیٹ پر آ گیا دھر مانند۔ دو تین دن فسادات کی لہر عرب ساگر کے کنارے بسے اس مہانگر سے ٹکرا کر لوٹ گئی تھی۔ بمبئی معمول پر آ گیا تھا۔ کوئی اپنا سر پیٹ پیٹ کر سوچ سکتا تھا: یا خدا، کیا یہی لوگ آپس میں لڑے تھے؟ اگر انھیں ایک دوسرے سے اتنی نفرت ہے تو اب کیوں نہیں لڑ رہے؟

شاید دوسرے راؤنڈ کی تیاری کر رہے ہوں...

لیکن یہ ایسی جھڑپیں نہ تھیں جن کی کسی آخری فیصلہ کن جنگ کے بارے میں سوچا جا سکتا۔

''میڈم... آپ تو یہاں کی ہیں بھی نہیں۔ میں آپ کو لیے چلتا ہوں اپنی چال میں۔ دس از دی ریوولوشن۔''

دھر مانند جز وقتی طالب علم تھا۔ کسی شام کے کالج میں پڑھتا تھا۔ دن میں تو وہ ایک ریستوران میں اسسٹنٹ مینجر کا کام کرتا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا۔ گھر کے دھلے، گھر میں استری کیے سفید پتلون قمیص میں۔ اس کے ماڈرن حلیے سے جلدی میں ماتھے پر ملا سیندور لگا نہیں کھاتا تھا۔

ما اور با اس کے ساتھ ایک 'معائنہ مہم' پر نکلے۔ دھر مانند نے اپنے دل میں انھیں غیر ملکی جان کر مقامی مسلمانوں سے الگ کر لیا تھا۔ غیر ملکیوں کے لیے تو اس کے دل میں بے حد جوش و خروش تھا، جیسا کہ اس پورے برِصغیر میں ہوتا ہے۔

اس کی چال دادر کے پاس تھی، جہاں وہ ٹاٹا کی صاف ستھری بس میں پہنچے۔

دھر مانند کی چال، بمبئی کی مخصوص، کھولیوں پر مشتمل، پُر پیچ راہداری تھی۔ دن کے دس بجے کھولیوں پر صرف عورتیں تھیں۔ کوئی بچہ پنگھوڑے میں جھولتا ہوا، اپنی کھولی میں رویا۔

''یہ باتھ روم ہے۔ یہ ڈسٹ بن ہم نے رکھوایا ہے۔'' دھر مانند اسے خوشی سے دکھا رہا تھا۔ ''اور یہ کپڑے دھونے کی جگہ...''

''یہ سب تو.... بہت اچھا کام ہے!'' ما کا دل ان کے لیے پگھل گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ فاصلے اور لاعلمی میں ہر چیز کیسی نظر آتی ہے!

''کیا بمبئی میں ایسی بہت سی چالیں ہیں؟'' با نے پوچھا۔

''بمبئی نہیں، مُم بئی!'' لڑکے نے سختی سے کہا۔

ما اور با حیران ہو گئے۔

''مُم بئی، مُم بئی... یہی اصلی نام ہے،'' لڑکے نے انھیں سمجھایا۔ ''دس از مراٹھا لینڈ، دس از مراٹھا نیم۔''

ما اور با نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی سمجھ میں خاک نہ آ رہا تھا۔ بمبئی ان کے ذہنوں میں، مُم بئی نہیں ہو سکتی تھی۔ بمبئی تو ... بمبئی تھی!

ایک دھچکے سے ما نے محسوس کیا، یہ لڑکے... تاریخ کے ایک حصے کو... کوئی سو ڈیڑھ سو برس کو... معدوم کرنا چاہتے ہیں، جس کے دوران بمبئی مُم بئی نہیں رہی تھی... کچھ اور بن گئی تھی ... بمبئی بن گئی تھی۔

شاید آنے والے وقت کو تو کسی طرح روکا، یا بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن آدمی کی یہ کیسی آرزو ہے؟ شاید سب سے طاقتور سب سے لاحاصل آرزو... ماضی کو مٹا دینے کی...

''تم مسلمانوں سے... کیوں نفرت کرتے ہو؟'' ما نے دھرمانند سے پوچھا۔ وہ ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے۔ دھرمانند انھیں اپنے شاکاہاری ریستوران میں نہیں لے گیا تھا جہاں اسے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا۔

''ناٹ ایٹ آل میڈم!'' دھرمانند نے مستعدی سے کہا، ''لیکن ہم چاہتے ہیں، وہ ہم میں گھل مل جائیں۔ دے شُڈ فیل مراٹھا... ہمیں ان کی پریئر پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر جیسا کہ شری بالا صاحب ٹھاکرے نے کہا ہے... وہ ہمارے تہواروں میں شامل ہوں... ہم ان کے تہواروں میں شامل ہوں گے۔''

''مگر اس کا یہ طریقہ تو نہیں ہے!'' کہتے کہتے ما نے زبان روک لی۔ کیا کہتا کوئی اس بچے سے؟ پھر اسے ایک دلچسپ سا خیال آیا۔

''تم جانتے ہو مسلمانوں کی پریئر کیا ہوتی ہے؟''

''یس میڈم... میرے کالج میں ہی پڑھتے ہیں مسلمان لڑکے۔''

''دوست ہیں تمھارے؟''

''نہیں...'' اس نے جھجک کر کہا۔ پھر پریشان ہو کر بولا، ''وہ لوگ دوسری طرح کے ہیں... وہ ہم سے دوستی کرنا ہی نہیں چاہتے...''

''تم کرنا چاہتے ہو؟''

دھرمانند حیران ہو گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ میز کو انگلیوں سے بجانے لگا۔

''تو ...ان کی پریئر کے بارے میں تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''میں نے دیکھی ہے!'' دھرمانند نے کہا۔

''دیکھی ہے؟'' ما نے حیرت سے کہا۔ اس ذہن میں 'سمجھنے' کا خیال تھا۔ ایک لمحے میں اس پر جیسے کوئی انکشاف سا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی تو ہیں لوگ ...بس دیکھتے ہیں!

دھرمانند کہہ رہا تھا:

''وہ لوگ کسی بلڈنگ کی طرف منھ کر کے کھڑے ہوتے ہیں، جو عرب دیش میں ہے۔ ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں۔ کانوں کو چھوتے ہیں۔ پھر آدھے جھک جاتے ہیں۔ پھر کھڑے ہوتے ہیں۔ کانوں کو

چھوتے ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ماتھا ٹیکتے ہیں گراؤنڈ پر۔لیکن ہماری طرح نہیں...'' دھر مانند نے کچھ شرما کر، ہنس کر کہا۔

دادر کے ایک سستے، شاکاہاری ریستوران میں بیٹھے، پلاسٹک کی میز پر اپنے سامنے چائے کی پیالیاں رکھے، ایک سناٹے میں آنکھیں پھاڑے، با اور ما نے ایک سترہ اٹھارہ سال کے مراٹھے سانولے لڑکے سے، جس کا نرخرہ بات کرنے سے اوپر نیچے ہو رہا تھا، اور جو اتنا کم عمر تھا، کہ اس کا دل زیادہ میلا، کینہ بھرا نہیں ہوسکتا تھا، یہ سنا کہ مسلمان اسے کیسے نظر آتے ہیں۔

دھر مانند تجسس سے پوچھ رہا تھا:

''کانوں کو کیوں چھوتے ہیں بار بار، میڈم؟''

با اور ما سناٹے سے نکلے۔ جیسے وہ صدیوں سے چپ بیٹھے تھے، جیسے ان کے منہ میں ریت بھر گئی تھی، اور ہڑبڑا کر کچھ آئیں بائیں کہا۔''پتہ نہیں...'' وہ بڑبڑائے۔ اور پھر دھر مانند سے رخصت ہوکر، سرپٹ اپنے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔

اس رات سونے سے پہلے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے، ما نے کہا:

''نئی نسل مسلمانوں کی تہذیبی اقدار سے افسوسناک حد تک لاعلم ہے۔''

با سونا چاہتا تھا۔

''روحانی اقدار کا کچھ مظاہرہ بھی نہیں ہو رہا ہے!'' اس نے مکھی سی اڑائی۔

''اور ان کی طرف سے ہو رہا ہے مظاہرہ؟'' ما تلملائی۔ وہ کہنی کے کنارے تقریباً بیٹھ گئی۔''یہ جو کرشن جی کے کھلے منہ میں بجلی سے گلوب گھماتے ہوئے جلوس نکالتے ہیں؟ بھئی، کہا تھا کسی نے کہ کرشن کے دہن میں تو کل کائنات ہے... تو یہ سمجھا ہے اس کا مطلب!''

''بات دراصل یہ ہے کہ...'' با اونگھتے ہوئے بولا،''کہ روحانی اقدار کا مظاہرہ...'' اس نے سوتے ہوئے کہا،''شاید ہو نہیں سکتا...''

ما دیر تک جاگتی رہی۔ سن سی لیٹی تھی... با کی کہی ہوئی بات پر بے بسی سے حیران۔ واقعی... اس نے اندھیرے میں سوچا... اسے اپنی استانی جی کا خیال آیا، جن کے لیے اس کی ماں کہتی تھیں،''خدا جنت نصیب کرے''... جنت ... جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں... اور موتیوں کے محل ہیں...

ما سوچتی سوچتی سوگئی۔

صدی کے آخر میں، بعد کے آنے والے مفسرین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے تھے کہ جنت دراصل خلا میں بنے ہوئے کھاد اور مٹی کے کسی باغ کا نام نہیں تھا، اور نہ وہاں کھجور کے درخت تھے، بلکہ یہ روحانی مسرت اور طمانیت کا ایک حسین استعارہ تھا جو نیک انسان کی روح کو محسوس ہوسکتی تھی۔ شاید ان زیادہ خیال پرست مفسرین کو شرمندگی ہوئی ہو کہ ان کے منزہ مذہب سے خلا میں بنے ہوئے ایک باغ کا تصور منسوب کیا جا رہا ہے! لیکن یہ تفسیریں اس گول، خلا میں چکراتی دھرتی پر جہاں تہاں بستے کروڑوں مسلمانوں تک پہنچ بھی نہ سکیں گی اور وہ ہمیشہ یونہی اپنی سیاہ آنکھوں سے ستاروں اور چاند سے جگمگاتے بے کراں خلاؤں کو تکتے اسی جنت پر یقین کرتے رہیں گے جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور جہاں بال سے بھی باریک ایک پل پر سے ایک بکرے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گزرا جا سکتا ہے جس کی وہ ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقعے پر قربانی دیتے ہیں۔

طیب بھائی دکھی اور اداس بیٹھے تھے۔ وہ بھیونڈی اور مالیگاؤں کا دورہ کرکے آئے تھے۔ حکومت یا کسی سرکاری ادارے نے ان کی ذرا مدد نہ کی تھی، حالانکہ کاغذی کارروائیوں میں فرقہ واریت کی آگ بجھانے والی تنظیموں اور افراد کی مدد کی سرخیاں، منصوبے اور دعوے، اور سرکاری دفتروں میں اس کھاتے میں خرچ ہونے والی رقومات کی فائلوں کا انبار موجود تھا۔ طیب بھائی اپنے ہی مراٹھا ہندو دوستوں کی مدد سے یہ دورہ کر سکے تھے جو ان علاقوں میں صلح صفائی اور حالات کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''افسوسناک صورتِ حال ہے اب تک...'' طیب بھائی نے گہرے دکھ سے کہا، ''بے اعتباری تو اتنی ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔ ایک گاؤں کے تمام مسلمان ایک مسجد میں اور سارے ہندو ایک مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔''

''آپ گئے تھے وہاں؟ مسجدوں اور مندروں میں؟''

''ہاں، ہم سب گئے تھے...'' پھر وہ کچھ یاد کرکے مسکرائے۔ ''مسلمان مارے ڈر کے ساری رات نعرے بلند کرتے رہے۔''

''کیسے نعرے؟''

''نہیں، کچھ اور نہیں... نعرۂ تکبیر۔''

''اچھا؟''

''اور ہندوؤں نے کہا... مسجد سے بلند ہوتے نعروں سے ان میں ہراس پھیل رہا تھا۔ مارے ڈر کے انھوں نے بھی نعرے لگائے رات بھر۔''

شوسینا میونسپل الیکشن حال ہی میں جیتی تھی۔ بائیس تیئس برس کے لڑکوں کی فوج جب مسلمانوں، تاملوں، گجراتیوں سے نہ لڑتی ہوتی تب، زمانۂ امن میں 'صفائی' کا کام کرواتی۔ انھوں نے کئی چالوں میں لیٹرین بنوائے اور کپڑے دھونے کی جگہیں۔ گلیوں میں ڈسٹ بن رکھوا دیے تھے انھوں نے۔ چالوں میں اپنے ممبروں کی کمیٹیاں بنا دی تھیں۔ ایک ایک چال میں کئی کئی... پندرہ تک کمیٹیاں بن گئی تھیں۔

وہ کچھ دن صفائی وغیرہ کرتے رہے، پھر بور ہوکر چھوڑ چھاڑ دیا۔ بمبئی میں ان کی تنظیم اتنی وسیع نہ تھی کہ وہ یہ کام شہر بھر کے پیمانے پر کر سکتے۔ ہاں لوگ، سارے مراٹھے، تقریباً سارے ہی ان کے ساتھ تھے، اور ووٹ بینک انھی کا تھا۔

یہ تحریک جو غریب مراٹھوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی، ایک سنہرے خواب میں لپٹی تھی... مراٹھا قومیت کی تجدید کا خواب، جس کی طلائی دھند میں، سواجی مرہٹہ ایک سفید گھوڑے پر سوار، دو پھل والی تلوار بلند کیے دور کہیں بادلوں میں پرچم لہرا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ ناانصافیاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ باہر سے آنے والے، غیر ہندو، غیر مراٹھے امیر ہو گئے تھے۔ جو امیر نہ تھے، کم از کم کھاتے پیتے تھے۔ اَن گنت فیکٹریاں اور کارخانے... کیا بے روزگار مراٹھے یہاں ملازمت نہیں پا سکیں گے؟ یہ سب کچھ ان کا اپنا نہیں ہو جائے گا؟ یا جو ان کی اپنی سرزمین پر بنا ہے؟ اور انھیں کوئی یہ یاد دلانے والا نہیں تھا کہ بھرا پرا صنعتوں سے دھڑکتا ہوا، مہانگر بمبئی، سو ڈیڑھ سو برس میں روزگار کی تلاش میں باہر سے آنے والوں ہی نے بنایا تھا... معیشت کی اندھی اور بہری قوتوں نے... جو افسوس، نہ مراٹھا تھیں اور نہ ہندو۔

شوسینا صوبائی انتخابات بھی جیت گئی تھی۔ لیکن کسی جادو کی چھڑی کو جنبش دے کر لاکھوں مراٹھا نوجوانوں کو روزگار تو نہیں دے سکتی تھی۔ پھر اب شوسینا کیا کرے؟ کیا تبدیلی لائے؟ آخر لیڈروں کی سمجھ میں آیا کہ بمبئی کی مراٹھیت بحال کرنے کے لیے بمبئی کو مُم بئی کہنا چاہیے، جو کہ اس کا قدیم نام ہے۔ انھوں نے مہاراشٹر پارلیمنٹ میں یہ قانون بھی منظور کرا لیا۔ کچھ دنوں تک مراٹھا نوجوان بمبئی کے گلی کوچوں میں

جوش بھرے نعرے لگاتے گھومے:

''بمبئی نہیں، مُم بئی!''

راجیو گاندھی جب بمبئی آئے تو پرچموں میں تحریر کیا گیا:

''ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں... بمبئی میں نہیں، مُم بئی میں۔''

لیکن کچھ دن بعد حالات پھر جوں کے توں ہو گئے۔ جو لوگ، اندرونِ مراٹھا لینڈ، بمبئی کو مُم بئی کہتے تھے، وہ مُم بئی ہی کہتے رہے، اور جو بمبئی کہتے تھے وہ بمبئی ہی کہتے رہے۔

آخر حکومت نے قانون کو سچ مچ رائج کرنے کے لیے محکمۂ ڈاک کو استعمال کرنے کی ٹھانی، لہٰذا یہ نوٹیفکیشن نکالا گیا کہ آئندہ صرف وہی ڈاک پہنچائی جائے گی جس پر مُم بئی لکھا ہو، بمبئی نہ لکھا ہو۔

اس حکم سے بمبئی کا ڈاک کا نظام بری طرح درہم برہم ہو گیا۔ ایشیا کا یہ گرانڈیل تجارتی اور صنعتی مرکز ہر روز ہزاروں کی تعداد میں بیرون ملک سے خطوط اور پارسل اور تار وصول کرتا ہے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی دو دن میں یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ اس کی جگہ یہ نسبتاً نرم حکم نکالا گیا کہ خیر، انگریزی میں بمبئی چلنے دیا جائے، لیکن ہندی میں مُم بئی ہی قابلِ قبول سمجھا جائے گا۔

لیکن یہ قانون نافذ نہ ہو سکا۔ مہاراشٹر کی حکومت کسی دوسرے صوبے پر اپنا قانون نافذ کرنے کی مجاز نہ تھی اور کسی دوسرے صوبے، مثلاً اتر پردیش یا راجستھان میں رہنے والے کسی شہری کو بمبئی کو مُم بئی کہنے یا لکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، اور دوسرے کسی راشٹر نے مہاراشٹر کے اس قانون میں ذرہ برابر دلچسپی یا ہمدردی کا چنداں اظہار نہیں کیا۔

(''ہشت!'' غالباً انھوں نے کہا۔)

بال ٹھاکرے کی تحریک اور فسادات کا کل حاصل جمع ضرب صرف یہی نکل سکا۔

مگر اس تحریک میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ سنہرے خواب کے سنگ اصلاحی امنگ، جسے نوجوان مراٹھوں نے حقیقت کا روپ دینے کی جی جان سے کوششیں کی تھیں۔ انھوں نے جات پات کی سخت درجہ بندیاں ختم کرنے کی کوشش کی اور امبیدکر کو اپنا ہیرو مانا اور پارٹی کے دفاتر میں ان کی تصویریں آویزاں کر دیں۔ امبیدکر... کانگریس کے بنیادی کارکن، ہندوستان کا آئین تحریر کرنے والے مراٹھا اچھوت...

شوسینا کے جوانوں نے چھوت چھات کی تقسیم ختم کرنے کی کوشش کی۔ سورن جاتی کے ہندو مراٹھوں

نے ہاتھ میں جھاڑو اٹھائی اور گلی گلی خود جھاڑو دی۔ لیکن پوری جان لڑا کر بھی وہ خود کو لیٹرین صاف کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ فضلہ اٹھانے کا کام انھیں بھنگیوں ہی کو سونپنا پڑا جنھیں ہندوستان کے بڑے شہروں میں اب سرکاری طور پر 'ہریجن' کہا جاتا ہے۔ جانے کس رومانی لہر میں، گاندھی جی نے انھیں یہ نام دیا تھا۔

امبیدکر ہریجن نہیں رہے تھے۔ ہندوستان کے آئین میں اپنے قلم سے، ایک کمرے کی تنہائی میں، معمولی میز کرسی پر بیٹھ کر یہ لکھ کر: 'اور اس دیش میں اب نہیں ہوگی کوئی چھوت چھات شودروں کی طرف'، امبیدکر نے ہندومت چھوڑ دی تھی... وہ بدھسٹ ہو گئے تھے۔ جیسے ان کے دل سے کوئی آہ نکلی تھی آدمی کی نیک خواہشوں کی اکل ناکامی پر، جسے اس کا لاشعور جانتا ہے۔

شوسینا نے شودروں کو مراٹھا قوم میں باعزت جگہ دینے کی پوری کوشش کی تھی (جیسی سوا جی مرہٹہ کے زمانے میں ہوئی۔) مراٹھوں میں سوراج سے قبل کے زمانے میں بھی سوا جی مرہٹے کی یہ تحریک بہت مقبول ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ایک عجیب وغریب، ناقابلِ وضاحت شاخسانہ، اس تحریک کے فوراً بعد ہزاروں مراٹھا شودروں کا ہندومت چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لینا بھی تھا! ہندومت میں باعزت مقام دینے کی کوشش پر انھوں نے ہندومت چھوڑ دیا۔

''مگر یہ تو حیرت انگیز بات ہے،'' ما نے سنیچری بازار کے پاس مسٹر گوینکر سے کہا تھا، ''بھگتی تحریک مہاراشٹر سے شروع ہوئی! میں نے زندگی بھر سمجھا کہ وہ تو کبیر داس سے...''

''ہوئی تھی... مہاراشٹر سے۔ مگر یو پی کے بھیّے مانیں بھی تو! نہیں مانتے۔''

''کیا کہتے ہیں؟''

''کرونولوجی کو تو ظاہر ہے، جھٹلا نہیں سکتے۔''

''تب پھر؟''

''بس یہی موقف ہے کہ مہاراشٹر میں چلی ہوگی بھگتی تحریک۔ لیکن ہندی بیلٹ والی تحریک کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہماری اپنی الگ چلی تھی... اپنی ہی وجوہات سے... باضابطہ کتابیں ہیں اس موضوع پر۔'' مسٹر گوینکر نے کھکھوڑ کر کتابیں اس کے سامنے ڈال دیں۔ ایک کتاب کھول کر صفحے پر پنسل سے سرخ نشان لگایا۔ ما نے نثری ٹکڑے پر نظر ڈالی۔

''اب گو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مہاراشٹر میں... مگر، چونکہ... چنانچہ... گویا کہ... حالانکہ... بس تو

ثابت ہوا... ہماری اپنی الگ تحریک تھی... جس کا بھی پیغام تھا... محبت... لیکن بالکل الگ تحریک... اس کا کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔"

ما قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ پیغامِ محبت پر شدید اختلاف! ما نے سوچا۔

بمبئی میں کہاں کہاں سے خلقت اُمڈی آتی ہے... نہ جانے کہاں کہاں سے۔ اور وہ سب ایک بار شاید جوہُو کے ساحل پر بھی آتے ہوں۔

ریت پر بچے رنگین بڑی بڑی گیندوں سے کھیل رہے تھے۔ نرم ریت میں دھنسی رنگ برنگی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ساحل پر تیرنے والے ٹائر پڑے تھے۔ تفریح کے لیے آئے لڑکے اور لڑکیاں ٹائروں کو لڑھکاتے، لہروں کی طرف دوڑ جاتے اور ان پر بیٹھ کر لہروں پر ڈولنے لگتے۔ لہروں کو دیکھ کر ننھی رِنکلی چڑیا کی طرح چہچہانے لگی تھی۔

بادلوں بھرے آسمان تلے بس سے اتر کر، نرم ریت پر بیٹھنے کا کوئی مناسب ٹھکانہ بناتے ما کا پورا کنبہ تتر بتر ہو چکا تھا۔

رانوں سے اونچی اسکرٹیں پہنے دو بمبیا لڑکیوں کو بھیل پوری کے خوانچے کی طرف جاتے دیکھ کر با، بچوں کے لیے بھیل پوری لانے کا اعلان کر کے، کسی جواب کا انتظار کیے بغیر، دور، بہت دور جا چکا تھا۔ اب وہ پام کے پیڑوں کے مور پنکھوں جیسی ہری، سلوٹ دار چادر پر ایک چھوٹا سا نقطہ تھا۔

کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی نازک سے پھول گاڑی، جس میں دو خوبصورت ٹٹو جتے ہوئے تھے، اسے دیکھ کر بڑکی نے خوشی سے چیخ ماری تھی۔

"پھولوں کی گاڑی، ما! وہ... وہ... وہ دیکھو... نیتو سنگھ اسی میں تو بیٹھی تھی، فلاں فلم میں... آپ نے نہیں دیکھی؟ رِشی کپور کے ساتھ؟ جب وہ گانا گایا تھا انھوں نے؟"

بندریا کی طرح چپڑ چپڑ کرتی، اشتیاق سے بیتاب، رِشی کپور اور نیتو سنگھ کا گانا گاتی بڑکی پھول گاڑی میں سواری لینے دوڑ پڑی تھی۔

ریت پر رینگ رینگ کر چیکو نیکر میں پیشاب کر کے رو دیا تھا اور پھر دونوں مٹھیاں بھر بھر کے پیشاب میں بھری ریت کھا چکا تھا۔

اور رِنکلی...

ما نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ کِکلی کہیں نہیں تھی۔
ما کے سینے سے ہوائی سی نکلی۔
''کِکلی کہاں... کہاں گئی کِکلی؟''

وہ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی، چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور کِکلی اسے کہیں نہیں دکھ رہی تھی۔

تب ہی دور... بہت دور لہروں کے سپید جھک جھاگ پر کِکلی کا لال اور نیلا ربن، شفاف نیلی ہوا میں لہراتا دکھائی پڑا... کِکلی کا ربن!

ریت کھاتے چیکو کو ریت پر پھینک کر، کھانے کے سامان اور باسکٹ گرا کر، دوپٹا جھٹک کر، ہوا میں اڑا کر، ما بے تحاشا لہراتے ربن کی سمت بھاگی۔ دونوں بازو پرندوں کی طرح پیچھے کیے ما پوری طاقت سے دوڑ رہی تھی... ہوا کے زناٹے کو چیرتی... بنا کسی سے پوچھے کِکلی دوڑ گئی تھی اور کنارے پر پڑے تیرنے والے ٹائروں میں سے کسی ایک کو دوڑاتی لہروں تک جا پہنچی تھی۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی، اپنے سے بہت بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی نقل میں، ٹائر پر بیٹھ کر لہروں میں اتر گئی تھی۔

دو تین سانسوں میں ما پانی کے اندر تھی۔ شڑپ شڑاپ... ما نے پانی میں دوڑ لگائی۔

پہلے گھٹنوں تک، پھر کمر تک، پھر اس کے سینے تک آیا پانی... جیسے کئی ہزار ٹن ریت کی بوریاں۔ پانی اتنا بھاری ہوتا ہے؟ یہ تو ما کو خبر ہی نہ تھی۔ اس کے کپڑے شرابور ہو کر کئی ٹن وزنی ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں اور منہ میں نمکیلا پانی چھپاک چھپاک پڑ رہا تھا۔

''کِک... لی...!'' اس نے پھیپھڑوں میں ساری ہوا بھر کر آواز لگائی۔ مگر ہوا نے اس کی آواز کو بکھیر دیا۔ ایک لہر نے اس کے منہ پر زوردار تھپیڑا مارا۔ ما کے گھٹنے مڑ گئے۔

ایک بانہہ کے فاصلے پر کِکلی کا ٹائر ہچکولے لے رہا تھا۔ منوں وزنی پانی کو چیر کر ما نے دونوں بانہیں اٹھائیں کہ کِکلی کو جھپٹ لیں۔

پانی کے شور کے اوپر، ہوا میں اوپر ہی اوپر اٹھتی کئی آوازوں نے اسے روکا۔
''نہیں بائی... نہیں... بچے کو ٹائر سے اتارو نہیں۔''

ما نے دونوں بانہیں ٹائر کے حلقے میں ڈال دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بیسیوں لوگ اس کے پیچھے پیچھے

پانی میں دوڑتے، تیرتے چلے آ رہے تھے۔ ما کو بدحواسی سے چیختا اور دوڑتا دیکھ کر آس پاس کھڑے لوگ، تفریح کے لیے آئے ہوئے سیاح اور خوانچے والے، اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے تھے۔ کئی بانہوں نے ٹائر کو سہارا دے دیا۔ آہستہ آہستہ ٹائر کو ٹھیلتے وہ اسے کنارے کی طرف لا رہے تھے۔

اتنے گہرے پانی میں ما کِکلی کو ٹائر سے اتار لیتی تب تو شاید وہ دونوں توازن نہ رکھ پاتے۔

کِکلی بسورنا بھول کر، چھپ چھپ پانی میں ٹانگیں چلا رہی تھی... چڑیا کی جیسی چہچہا رہی تھی... ٹائر پر جمی، کسی جَل بالکا سی... اس کی شیدیانی، اس کی ہیڈ ماسٹریانی... کتنے ہی سانولے، چھریرے بدن جس کی جل گاڑی کھینچ رہے تھے... ان کے نیلے پیلے لال لنگوٹ اور جانگیے سرمئی لہروں میں ابھر اور ڈوب رہے تھے...

نمکیلے پانی میں بھیگی، ننگے بدنوں کے اس ریلے میں پھسلتی آ رہی تھی ما... کچھ خود چلتی اور کچھ دھکیلی جاتی ہوئی... آوازوں کے شور میں... سمندر کی اور ہنسی کی ملی جلی آوازوں میں... ما کے ذہن میں آہستہ آہستہ یہ بات آئی، جیسے ہولے ہولے پانی کی تہہ میں ریت بیٹھتی ہو۔

کِکلی نے جواب تک اسے کبھی نہیں ستایا تھا، کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالا تھا، تو اس لیے... کِکلی نے ابھی تک سمندر دیکھا ہی نہ تھا! اور اب...

''اب میری باری ہے!''

ما نے کہا۔

کِکلی اور چیکو اور چولہے پر چڑھی ہانڈی کو بڑکی کے حوالے کر کے آج وہ سمندر کے کنارے خود گھومنے آئی تھی۔ بڑکی نے رات اس کے منھ پر کریم مَلی تھی۔ صبح کو چہرہ نرم اور تازہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا تھا، اور وہ اسے ٹھیک نظر آیا تھا۔ فکروں کا بوجھ اتار کر، فکروں کی ایک پوٹلی باندھ کر، جیسے گھر پر چھوڑ کر، ما نے اپنے حصے کا ایک دن وصول کیا تھا۔

ساری دنیا اور تقریباً اپنے آپ، سے چھپا کر اس نے اپنے لیے ایک شوخ بھڑکدار ڈریس خریدا تھا، جو اس نے شرم کے مارے اپنے بیگ میں چھپا رکھا تھا۔

با پوری دلجمعی سے اسے جوہُو لے چلا۔ جوہُو پر، نہانے کی زنانہ کیبن میں جا کر ما نے کپڑے بدلے۔ باہر آئی تو با اس کے بھڑکدار کپڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کپڑوں کی کیبن میں وہ جوتے، ہینڈ بیگ، سب چھوڑ کر آئی تھی... بالکل ہلکی پھلکی ہو کر...

با اور ما نے ساحل پر مونگ پھلیاں کھائیں... بانہہ میں بانہہ ڈال کر فوراً اترنے والی تصویر کھنچائی...

تصویر میں با اور ما نے اپنے آپ کو دیکھا... با کے چہرے پر شرمندہ سی بزدلی کا تاثر... اور ما کے بھڑکدار کپڑوں کو بالکل مائنس کرتا ہوا اس کا چہرہ... جس پر نامرادی کی پھٹکار پڑ رہی تھی... تصویر کو دیکھ کر دونوں شرمندہ ہوگئے۔ با نے تصویر بٹوے میں ڈال لی۔

ما پانی میں چلنے لگی۔

شپ شپ شڑاپ شڑاپ...

اس نے مڑ کر با کی طرف دیکھا۔

''آؤ...'' اس نے کہا۔

''کپڑے بھیگ جائیں گے۔''

''بھیگ جائیں!''

''بٹوا... بٹوا بھی تو بھیگ جائے گا۔ جوتے کہاں رکھوں؟''

''یہیں کنارے پر چھوڑ دو سب کچھ۔''

با نے پتلون کے پائینچے چڑھائے، جوتے ہاتھ میں تھامے، اور ما کے ساتھ ساتھ آنے لگا۔ ما کو با کی حالت پر افسوس ہوا۔ اس کے پاس بہت بوجھ تھا، اور وہ اپنا بوجھ کسی چھوٹے سے خانے میں تالا لگا کر کنارے پر چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ما پانی میں دوڑ لگانے لگی۔

وہ ہاتھ لہرا کر گانے لگی۔ اس نے اسی پل ایک گانا جوڑا تھا:

سمندر کی طرف آؤ
تو کچھ ہاتھوں میں مت لانا
سمندر تم کو
کچھ نہ کچھ دے گا
نہیں تو
کچھ نہیں دے گا...

یہ آخری حقارت بھری دھمکی با کی طرف دیکھ کر...

''بمبئی میں ملوگی مجھ سے؟''

''جی ہاں ضرور۔''

''تھوڑا گھومیں گے۔ ساتھ سیر کریں گے۔ جوہُو چلیں گے۔''

''اور... آپ کی بیوی؟''

ما سونہیں رہی تھی۔ ما تو صرف آنکھیں موندے دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ ما سے ملنے آنے والی صحافی لڑکی سے با جو باتیں کر رہا تھا، ما سب سن رہی تھی۔

''ما؟ اس کا کیا ہے۔ یہ تو مجھے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

ما نے با کو غور سے دیکھا۔ کیا وہ اسے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر پانی اچھالتے ہوئے محسوس کیا کہ بالکل! وہ ایسا ہی چاہتی ہے...

کیوں؟

پانی اب اس کی کمر کمر تک آ گیا تھا۔ لہریں زور پکڑ رہی تھیں۔ وہ جی جان سے پانی کو اپنے بدن سے لپ لپ ٹکراتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ ایک بڑی لہر کو اس نے اپنے پیٹ سے چھپاک سے ٹکراتا محسوس کیا۔ اس کے پیر پھسل گئے۔ بانہیں بڑھا کر اس نے با کو تھاما۔

نظر اٹھی تو با کی نگاہوں میں اسے ایک غیر متوقع حسرت نظر آئی۔ ما نے نظریں جھکا لیں۔

با جوہُو آنا چاہتا تھا... اس کے بغیر۔ وہ زندگی کا لطف لینا چاہتا تھا۔ اگر ما کے بدلے وہ اس انجانی لڑکی کے ساتھ آتا تو شاید اپنے جوتے اور بٹوا سنان گھر کی کیبنٹ میں خود بند کر کے آتا۔ وہ ما کی نگاہوں سے دور، بے فکری سے لہروں سے کھیلتا۔ آج جو اپنے بوجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکا... با کا سب سے بڑا بوجھ تو وہ خود ہے... خود ما... ما با کے شعور پر ایک بھاری بوجھ ہے... کیوں؟

اس نے با کی طرف مڑ کر دیکھا۔ فولاد سے مضبوط، مگر شیشے سے بھی شفاف، کسی انسانی آنسو کی دیوار کے پیچھے کھڑا تھا با۔ یونہی کھڑے تھے وہ دونوں... شفاف شیشے کے آر پار ایک دوسرے کو تکتے، مگر کبھی پار نہ کرتے نہ کر سکتے ہوئے...

ایک بڑی لہر آئی۔ ما کو اپنی بانہوں اور بالوں سے ان گنت ننھی منی مچھلیاں پھسلتی محسوس ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن سے با کا خیال محو ہو گیا۔ ایک ننھے سے پل میں اسے گوداوری کا خیال آیا اور اس کے تصور نے اس مراٹھن کو، لمبی لاٹھی تھامے، سرخ پہاڑ پر چڑھتے دیکھا۔ لمحے بھر کو اس نے اُشا کو تاریک کوٹھڑی کے دروازے سے سر ٹکائے، ستار جیسی ہنسی ہنستے سنا، جس کے عقب میں زرد روشنی میں دیوار پر گیرو سے بنے دیوی دیوتاؤں کے نقش چمک رہے تھے۔ سمندر کی اونچی نمکیلی لہر میں بہتا ایک سوکھا آبی پودا اپنے سینے سے جدا کرتے ہوئے اس نے کچھ اور اہم باتوں کے بارے میں سوچا جن کا سمبندھ موت اور زیست سے تھا۔ اسے خیال آیا کہ کس طرح بڑکی اور ٹکلی اور چیکو کی پیدائش کے درد جدا جدا تھے۔ کون سا والا پیٹ میں الٹ گیا تھا اور خون کا دوران بڑھ جانے کی وجہ سے کون سا پیدائش کے وقت سے دو ہفتے پہلے... پیدا کیا گیا تھا...

لہروں میں شپ شپاتی ما کافی دور تک گئی... اکیلی...

کراچی

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میرا وطن ملیر

وقت کے جادو گھر میں تحلیل ہوتی صدی کے آخری برسوں، اس برس کے آخری مہینے، اس مہینے کے آخری دنوں کی بات ہے۔

بحیرۂ عرب کے ساحل پر آباد، تیسری دنیا کے ایک غریب، بین الاقوامی مالی اداروں سے مستقل امداد خواہ ریاست کے ایک عظیم الجثہ شہر کے نوتعمیر اور شاندار ہوائی اڈے سے ایک جہاز علی الصباح، منھ اندھیرے پرواز کرنے والا ہے۔

اس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کس کر حفاظتی پیٹی باندھ رکھی ہے۔ اس کے بغیر، اسے یقین ہے کہ وہ اپنی سیٹ ہی سے نہیں بلکہ جہاز سے نیچے گر پڑے گی، اور شاید اس گول کرۂ ارض سے پھسلتی ہوئی، زمین کی کشش پکڑنے میں ناکام، کہیں خلا میں گم ہو جائے گی۔

برطانیہ جانے والی اس پرواز میں، جو آدھے گھنٹے کے لیے دبئی میں رکے گی، بہت کم مسافر ہیں۔ عورت اپنے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر مہینہ بھر برطانیہ میں رہنے کی غرض سے جا رہی ہے۔ (چھٹی بڑھانے کی درخواست، بہ سببِ علالت، وہ برطانیہ سے بھجوا دے گی۔)

وطن چھوڑتے ہوئے وہ کافی خوش ہو رہی ہے۔ شہر میں کئی برس سے بدامنی پھیلی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے اور لوگ مارے جاتے ہیں۔ چوریاں، ڈاکے، اغوا، غرض تمام پُرتشدد جرائم یا واقعات اکتا دینے والی یکسانیت سے مسلسل ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی ہے۔ چند دنوں سے

قتل کی وارداتوں میں تیزی آ گئی تھی۔ ہر روز اوسطاً آٹھ، سات، لوگ مارے جا رہے تھے۔اس لیے وہ تشدد اور قتل و غارت گری کے شعلوں میں جھلستا ہوا شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے تازہ ہوا کھانے کے خیال سے بہت خوش تھی؛ اس بات پر تو اور بھی خوش کہ جہاز کا رخ مغرب کی طرف تھا۔''گڈ اولڈ لنڈن!'' اس نے بخوشی ایک گھسا پٹا جملہ دہرایا (منھ میرا کعبے شریف کی طرف، اللہ اکبر!) اور لندن جانے کی نیت باندھ لی۔

زمین پر تیزی سے دوڑتا جہاز اب ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے شہر تھا، جو اس کی نظروں کے سامنے تیزی سے آڑا ترچھا ہو رہا تھا۔گڑیا گھروں کی طرح چھوٹے دکھائی پڑتے مکانوں، فیتوں میں بدلتی سڑکوں، کھجوروں کے مور پنکھوں اور ترچھے ساحلِ سمندر کو کھڑکی کے شیشے سے بغور دیکھتے ہوئے، جن پر دسمبر کے کمزور سورج کی پہلی کرنیں دمک رہی تھیں، عورت نے آنکھوں میں گرم پانی آتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے شہر سے محبت اور سینے میں لاحاصل محبت کی شدید تکلیف محسوس کی، گویا کوئی تیز دھار چیز سینے میں پیوست ہو اور کوئی اَن دیکھا ہاتھ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہو۔مگر یہ کیفیت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ گرم آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ انگلینڈ پہنچ کر کیا کیا کرے گی، اسے لینے کون آیا ہوگا، اور دیگر یہ کہ اب چائے ملنی چاہیے۔

عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کی دو نشستوں پر ایئر ہوسٹس نے نہ جانے کیوں (اتنی بہت سی خالی سیٹیں چھوڑ کر صرف اسی کے ساتھ کیوں؟) دو مسافر بٹھا دیے تھے جو کسی اور پرواز سے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے اشتیاق سے جھانک جھانک کر کھڑکی کے نیچے دور کہیں ڈگمگاتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وہ نیچے لانڈھی نظر آ رہا ہے کیا...؟'' دبلے پتلے مسافر نے بڑے اشتیاق سے انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

عورت چکرا گئی۔ اتنی بلندی سے وہ لانڈھی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔

''نہیں تو... پتا نہیں...'' اس نے کہا۔ پھر ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈال کر سوچا کہ کیا وہ لانڈھی سے آئے ہوں گے۔عورت نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اسے خیال آیا۔ لانڈھی کا کیا مطلب ہے؟ اس نے سوچا کہ وہاں اب رہنے والے یہ بات مشکل سے جانتے ہوں گے کہ سندھی زبان میں لانڈھی کا مطلب کوئی صاف ستھرا، آرام دہ جھونپڑا ہے جو گاؤں کے راستے میں مسافروں کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔شاید، اس نے سوچا، صدیوں پہلے، اس علاقے میں ایسی کوئی گھاس پھوس کی کٹیا ہو جہاں مسافر

پل بھر آرام کرتے ہوں۔ اس نے ایک پُرسکون راستے کا تصور کیا جہاں دو رویہ کھجوریں کھڑی ہوں اور جھاڑیوں میں کالے تیتر بولتے ہوں۔

لانڈھی... اب شہر کا ایک خطرناک علاقہ، گولیوں کی بوچھاڑوں سے دھواں دھار۔

دور ہوتا گیا کراچی، مقتولوں کے خون سے جا بجا شرابور، وارداتوں کی کثرت اور اسرار پر بھونچکا۔

وہ حفاظتی پیٹی کو تھوڑا سا ڈھیلا کرکے، کرسی کی پشت پیچھے کھسکا کر، آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی دیر کے لیے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کیے کیے عورت نے تصور کیا— نہ جانے کیوں یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، شاید اس لیے کہ شہر کی حالت واقعی بہت خراب تھی— گویا کوئی اس سے سوال کر رہا ہو:

''بھئی کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟''

یہ ایسا سوال تھا جو دراصل اس سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس شہر کے بارے میں لوگ سوال نہیں پوچھتے تھے بلکہ صرف تبصرہ کرتے تھے: کراچی کی تو حالت اتنی خراب ہے، وغیرہ۔ مگر عورت کے تصور نے اس سے من چاہا سوال پوچھ لیا۔ (پورا تصور یہ تھا گویا کوئی اس سے انٹرویو لے رہا ہے۔)

عورت تصور میں اپنے تئیں ایک نہایت اہم اور معتبر شخصیت محسوس کرتے ہوئے مفصّل جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا:

''دراصل یہ ایک پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ ایک سطح پر تو... کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسیوں کی لڑائی ہے...''

''کیسی ایجنسیاں؟'' اس کے چوکنے تصور نے سوال کیا، کیونکہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ایک پاکستانی لڑکی نے حیرت زدہ ہوکر اسے بتایا تھا کہ وہ ایجنسیوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے، دیگر یہ کہ اس کے اپنے باپ کی ایک اسٹیٹ ایجنسی تھی۔ لہٰذا عورت نے بلا تامل وضاحت کی:

''بھئی خفیہ ایجنسیاں... جن کے ایجنٹ ہوتے ہیں...''

''جیسے؟'' انٹرویو کرنے والے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ گڑبڑا گئی۔ ایجنسیوں کو حروف تہجی سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ انھیں گڈمڈ کر دیتی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کرکے، حواس مجتمع رکھتے ہوئے (کیونکہ وہ انٹرویو لینے والے پر اپنی حماقت زدگی اور کم علمی کو کسی قیمت پر فاش نہیں کرسکتی تھی) کہنا شروع کیا:

''بھئی بہت سی ایجنسیاں لڑ رہی ہیں... سی آئی اے ہے، آئی بی ہے، آئی ایس آئی ہے...'' پھر کچھ جھجھک کر اس نے اضافہ کیا، ''سی آئی ڈی ہے...'' حالانکہ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس قدیم ادارے کو کہیں برسوں پہلے ختم ہی نہ کر دیا گیا ہو۔

''اس کے علاوہ...'' اس نے کہا، ''ایم کیو ایم کے دو متحارب گروہ ہیں۔ پھر شیعہ اور سنّی، سیاسی اور نیم سیاسی جماعتیں ہیں۔ اور پھر...'' وہ کچھ رک گئی، اس احساس کے ساتھ کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا، ''پھر پولیس ہے، رینجرز ہیں، شہری ہیں... اور... اور امریکی ایجنٹ ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں، افغان ایجنٹ ہیں... تو یہ سب... یعنی کہ... لڑ رہے ہیں...''

انٹرویو لینے والے نے قہقہہ لگایا۔ عورت ہنس رہی تھی۔ خود ہی تو لے رہی تھی وہ اپنا انٹرویو۔

''لاحول ولاقوۃ،'' اس نے کہا، ''کیا بکواس کر رہی ہوں میں!''

''تو پھر، کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟''

''واللہ اعلم!'' عورت نے سر کھجایا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا، ''فائرنگ ہو رہی ہے۔ روز کتنے ہی لوگ مارے جاتے ہیں، دس بارہ، دس بارہ، ہر روز...''

اسے اپنے پڑوس کی مسجد پر حملہ یاد آیا۔

روانگی سے دو دن پہلے اس کے محلے کی مسجد میں اکٹھے آٹھ آدمیوں کو مارا گیا تھا۔ مرنے والے کہا جاتا تھا سپاہ صحابہ کے تھے۔ کیا مارنے والے یقیناً شیعہ رہے ہوں گے؟ اس سے پہلے شیعوں سے بھری بس میں بم پھٹا تھا۔ اخباروں میں روزانہ مرنے والوں کی تصویریں چھپتی تھیں اور حالانکہ شہر کے لوگ مدتِ مدید سے ان اموات میں دلچسپی کھو بیٹھے تھے، پھر بھی کوئی کوئی شخص (مثلاً یہ عورت ہی) شہر کے معمّے کو سمجھنے کی کوشش میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ مرنے والوں کا تعلق کس فرقے یا سیاسی جماعت یا لسانی گروہ سے ہے۔ بعض اوقات خبریں اس طرح ہوتیں:

''مرنے والوں میں دو ایم کیو ایم کے کارکن، ایک ایم کیو ایم حقیقی کا کارکن، تین شیعہ اور دو سنی ہیں۔''

پڑھنے والے اس گورکھ دھندے کو حل کرتے۔ یہ بات ناقابلِ یقین تھی کہ شہر میں مدّت سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ہلاک کرنے والے افراد نہ صرف ایم کیو ایم کے خلاف ہیں بلکہ حقیقیوں، شیعوں اور سنیوں کے بھی جانی دشمن ہیں۔ پھر وہ کھی کھی کر کے ہنستی: ''ارے نہیں بھئی ... آپس

میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں لوگ!''

کبھی لڑکپن میں وہ شمع معمے حل کیا کرتی تھی۔ یہ سب سے پہلے معمے تھے جن پر ہزاروں روپوں کے انعام ملتے تھے۔ اُس زمانے میں ہزاروں روپے بڑی بات ہوتے تھے۔ حروف تہجی کے الفاظ خانوں میں بھرنے ہوتے تھے۔ شمع نامی رسالہ نئی دہلی سے نکلتا تھا اور پاکستان میں بکتا تھا۔ جس صفحے پر معما شائع ہوتا تھا اس کی پشت پر صحیح حل کے لیے کچھ ''سجھاؤ'' درج ہوتے تھے؛ ان کا دلچسپ اور خیال انگیز عنوان ہوتا تھا: ''اشارے۔''

کراچی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی اب معما تھا۔ یوں ہی دل بستگی کے لیے لوگ اخباروں میں ''اشارے'' ڈھونڈتے، جبکہ صحیح حل پر انعام ملنے والا نہ تھا۔ بلکہ شاید صحیح حل کوئی تھا ہی نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے یہ بلا حل معما ہو جسے صرف بے وقوف بنانے کے لیے پیش کر دیا گیا ہو؟ لوگ برسوں دماغ پچی کرتے رہیں اور پھر پتا چلے... اوہو! ہمیں یوں ہی اُلو بنایا گیا۔

تھوڑی دیر میں فضائی میزبان چائے لے آتی ہے۔ ایک ٹرالی پر اخبار بھی ہیں۔ لڑکی اسے اخبار پیش کرتی ہے۔ خوشی سے تقریباً کپکپاتے ہوئے عورت نے اخبار لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ پہلے سے جانتی تھی اخبار میں کیا لکھا ہوگا (وہی دوشیعہ، ایک ایم کیو ایم، شاید ڈیڑھ حقیقی وغیرہ)، بلکہ اس لیے کہ اب وہ جاننا ہی نہیں چاہتی تھی، کم از کم مہینے بھر تو نہیں۔ ارے بھئی وہ باہر جا رہی ہے... کوئی یوں ہی تو نہیں! اس اکتا دینے والے مسلسل تشدد سے بچ کر ہی تو وہ جا رہی ہے... بلکہ (اس نے تفاخر اور تحقیر کی لہر میں ناک اٹھا کر سوچا) وہ جا چکی ہے۔ یہ بات اب ماضی بعید کی ہوئی کہ وہ کراچی میں تھی۔ اخبار کے بدلے وہ فضائی کمپنی کے رسالے میں ''کمسن مسافروں کے لیے'' کے عنوان سے چھپے بندروں اور طوطوں پر لکھے باتصویر مضامین پڑھنے لگی۔ مضمون بے حد معلوماتی تھے اور تصویریں بہت دلکش تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان میں کھو کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ دبئی اترنے پر محصول معاف دکان سے وہ اپنی نواسی کے لیے مخمل کا بندر خریدے گی، کرسمس کا تحفہ!

وہ کرسمس کا دن تھا۔ اس کی بیٹی، داماد اور نواسی اس جگمگاتے دن اسے لینے ہوائی اڈے پر آئے ہوں گے۔ ''فادر کرسمس کے بدلے مدر کرسمس آ رہی ہیں!'' اس کی بیٹی نے دور دراز ٹیلیفون پر خوشی سے چیخیں مارتے ہوئے کہا تھا۔ عورت خوشی سے مسکرانے لگی۔ دور کہیں، اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر، خوشی

اس کا انتظار کر رہی تھی؛ ایک سجے ہوئے شہر میں، جیسے اسے اس کی آمد کے لیے خاص طور پر سجایا گیا ہو۔ اس وقت وہ ہرگز نہیں جاننا چاہتی کہ کل کراچی میں کون کون مارا گیا، لانڈھی میں اور ملیر میں...

ملیر تو وہ خود گئی تھی، حیرت! حیرت! وہ ملیر کیونکر جا پہنچی؟

مقتول کے گھر تعزیت کے واسطے، جبکہ لاش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی۔

اُن دنوں دو تین روز سے قتل کی وارداتوں میں تیزی تھی۔ اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ جس دفتر میں وہ بیٹھتی تھی وہاں کام کرنے والا ایک کلرک مارا گیا ہے۔ کون تھا وہ؟ اسے اس کی صورت بھی یاد نہ آئی تھی۔ یہ خبر اس نے ٹیلی فون پر سُنی تھی، اور اس کی عجیب تفصیلات۔

سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے کم گریڈ کے زیادہ تر ملازم دفتری اوقات کے بعد، مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پورت کرنے کے لیے، کوئی اور بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کلرک بھی — جس کو زید، بکر یا عمر کہیے — دفتر کے بعد نمکو بیچتا تھا۔ تلی ہوئی دالیں، مرمرے، سیو، پاپڑ، نمک پارے وغیرہ وہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں اسٹیپل کے دھتیلے تار کے دانت سے بند کر کے (تاکہ وہ ہوا اور نمی سے محفوظ رہیں) اپنی موٹر سائیکل پر لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچایا کرتا تھا۔

واردات والے دن (مگر واردات والا تو ہر دن تھا! یعنی جس روز اُس کے ساتھ واردات ہوئی) زید، بکر یا عمر گھر نہیں پہنچا تھا۔ گھر والوں نے بہت دیر تک، یعنی اگلی صبح تک، انتظار کیا۔ جب وہ صبح تک گھر نہ پہنچا اور آسمان پر سفید اور سیاہ ڈورا نمودار ہوگیا، اور پھر وہ بھی پگھل گیا اور سورج مشرق سے جھما جھم طلوع ہوگیا، اور چڑیوں نے پچھواڑے میں اُگے امرود اور کیلے کے تین پیڑوں میں گانا اور چہچہانا بھی ختم کر دیا اور ان کے بدلے کراچی کے آسمان کی وہی شناسا چیلیں اور کوے چکر کاٹتے قصائی کی دکان کا رخ کرنے لگے جہاں دکان کے باہر پڑے چھیچھڑوں پر بلیوں سے لڑتی ہوئی چیلیں اپنے حصے پر جھپٹے مارتی ہیں، اور روشنی میں سب کچھ صاف نظر آنے لگا تو زید، بکر یا عمر کی بیوی نے پوری طرح دہل کر ملگجے، ملے دلے بستر پر سوتے دیور یا جیٹھ کو جگایا اور کہا:

''وہ نہیں آئے۔''

گھر والوں نے دفتر کھلنے کا انتظار کیا۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ انھوں نے باہر کسی دکان سے دفتر فون کیا۔ انھوں نے استفسار کیا، کیا بات ہے، وہ دفتر سے گذشتہ رات گھر کیوں نہیں پہنچا؟ دفتر

والوں نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ تو دفتر کے وقت کے بعد سب لوگوں کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ بھائی، حالات کچھ اچھے تو ہیں نہیں، خدا کرے سب خیریت ہی ہو، مگر آپ لوگ ذرا کسی ہسپتال میں بھی معلوم کر لیجیے۔ گھر والوں اور عزیز و اقارب نے ہسپتالوں سے رجوع کیا۔ دس بجتے بجتے ایک ہسپتال میں زید، بکر یا عمر کی لاش کی شناخت ہوگئی، اور یہ خبر بارہ بجے نکلنے والے اخباروں کے دفتروں میں بھی پہنچ گئی۔ وہیں سے کسی نے ٹیلیفون پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دفتر کا ایک آدمی بھی کل رات...

بے تابی سے اس نے اپنے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں اسے مزید تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ یہ سب سن کر عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے۔ بہرصورت، وہ روتی دھوتی دفتر چل دی تھی۔

دفتر کا نچلا اسٹاف تجہیز اور تکفین کے لیے بسوں میں ملیر جا چکا تھا۔ صرف ڈائرکٹر اور ان کے نائب بیٹھے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ جائے اور جنازہ اٹھنے والا ہو تو پھر وہ بھی ملیر جائیں۔ ملیر — جو پہلے شہر کے مضافات میں تھا۔

ملیر جاتے ہوئے وہ سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ یہ رکشا والے اور ٹیکسی ڈرائیور، اور اپنی گاڑیوں میں جاتے ہوئے لوگ، یہ سب جیسے کسی جنازے میں جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سختی سے الم میں منجمد تھے۔ راستے میں اسے اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ لاش علی الصباح ہسپتال لائی گئی تھی۔ واردات شام کو ہوئی تھی جب زید، بکر یا عمر نمکو تقسیم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ رات بھر لاش سڑک کے کنارے پڑی رہی تھی۔

راستے میں اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہم سفر ڈائرکٹر سے کہا، ''فلاں بھائی...'' (جیسا کہ اس کے شہر کا قاعدہ تھا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا، جسے اس نے غیر شعوری طور پر اپنا لیا تھا) ''آپ کو یاد ہے کئی برس پہلے... یہاں ملیر میں... ایک صاحب کے گھر ادبی محفل ہوتی تھی...'' اس نے ٹوٹے ہوئے جملوں میں کہا۔ یاد میں ایک چھوٹے سے گھر کا ایک نیم تاریک کمرہ بجلی کے پیلے، مدھم بلب سے روشن ہوگیا۔ فرش پر بچھی دری، اس پر سمٹ کر بیٹھے ہوئے لوگ۔ نظم یا افسانہ پڑھنے والے۔ سننے والوں کے تبصرے۔ اسے یاد آیا، کتنی کتنی دور سے جاتے تھے لوگ وہاں۔ خود کتنی دور سے گئی تھی۔ تب دھوراجی کالونی میں رہتی تھی وہ۔ ڈائرکٹر صاحب ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر ان کی ٹوٹی ہوئی سی آواز آئی۔

''ہاں صاحب، خوب یاد ہے۔ میں خود وہاں جاتا تھا۔''

''پھر ان صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اور محفلیں ختم ہوگئی تھیں،'' عورت نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ آخری بار اس گھر میں وہ سب تعزیت کرنے گئے تھے۔

''نہیں، ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی نے جاری رکھی تھیں،'' ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

کامریڈ تھے وہ صاحب، اسے مدھم سا یاد آیا۔ یہ ایک سوشلسٹوں کا حلقہ تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات پر وہاں طویل بحثیں چلتی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی ملیر میں داخل ہوگئی۔

علاقے میں مرگھٹ کا سا سناٹا تھا۔ اکا دکا دکانوں کے سوا تمام دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ آگے جائے یا نہیں۔ یہ ایک فساد زدہ علاقہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک آدھ جگہ لوگ گچھا سا بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کو مشکوک نظر آ رہے تھے اور خود انھیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی انھیں سامنے سے ایک کھٹارا بس آتی نظر آئی جس میں چند مسافر بھی تھے۔ بس اسٹاپ پر نہ جانے کہاں سے ایک عورت آ کھڑی ہوئی۔ سڑک پر عورت: امن کے آثار! انھوں نے ہمت کر کے آگے جانے کی ٹھانی۔

لاش ہسپتال سے یا تو آ چکی تھی یا وہاں سے روانہ کر دی گئی تھی، اسے ٹھیک سے پتا نہ چل سکا کیونکہ اسے گھر کے اندر عورتوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ چھوٹی سی کچی انگنائی پار کر کے گھر تھا، عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عورتیں۔ کسی نے اشارے سے اسے بتایا: ''یہ ان کی اماں اور وہ بیوی ہیں۔''

بیوی تیس کے پیٹے میں رہی ہوگی؛ روتے روتے نڈھال، لانبی اور چھریری۔ اس کی ناک میں کیل چمک رہی تھی۔ موٹی ململ کا گلابی دوپٹہ، ٹانگوں میں سفید لٹھے کا پہناوا، چست پاجامے کی کفایتی شکل جو گھٹنا کہلاتی ہے۔ ارے واہ! اس نے دل میں سوچ کر حیرت کی۔ یہ تو بالکل سونی پت یا ریواڑی کے کسی مسلمان محلے سے نکلی تصویر لگ رہی ہے، مومیائی ہوئی۔ پچاس برس میں ان گھروں کی اندرونی حالت جوں کی توں رہی کیا؟ مگر نہیں، یہاں پہلے گھر تھے کہاں؛ جھگیاں ہی جھگیاں تھیں چند دہائیوں پہلے تک۔ اور اب ہر طرف پکے گھر کھڑے تھے۔ راستے میں وہ یہی تبصرہ کرتے آئے تھے، اس کچی آبادی پر جو اَب

کھوکھراپار تک جا پہنچی تھی۔

کھوکھراپار—ہجرت کی سرحد!

بیوی نے ہاتھ اٹھایا۔ کلائی میں کانچ کی چوڑیاں چھنکیں۔ اس کے زانو پر اسی چہرے مہرے کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ یہ زید، بکر یا عمر کی بیٹی تھی۔ دو چھوٹے بچے وہیں کہیں دوسرے بچوں میں رُل گھل رہے تھے۔ اب یہاں تک پہنچ کر عورت کو بالکل رونا وونا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چبا چبا کر تعزیتی جملے بھی کہہ دیے تھے۔ یہاں اسے رونا چاہیے، اس نے سوچا۔ اس قدر رقّت انگیز سین ہے، اور اسے رونا نہیں آ رہا۔ وہ غور کر رہی تھی کہ مجمعے میں لوگ زیادہ تر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ زید، بکر یا عمر کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا دھڑے سے نہیں تھا۔ باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ مردوں میں بھی یہی باتیں ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ملی جلی رائے یہ بن رہی تھی کہ زید، بکر یا عمر دراصل اس روز نمکو والوں سے وصولی کر کے آ رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا اور پیسے لے کر فرار ہو گئے۔ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

واپسی میں اس کے ہم سفر ڈائرکٹر صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ ''کچھ نہیں صاحب، محض غنڈہ گردی کی کارروائی ہے، پیسوں کے لیے۔''

تعجب اس پر تھا کہ یہ بات سب کے لیے باعثِ اطمینان کیوں تھی۔ دیگر یہ کہ اس بات پر مقتول کے عزیز اتنے مُصر کیوں تھے اور اس قدر جلد بازی سے، جبکہ ابھی جنازہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا، شرکائے جنازہ کو کیوں یقین دلانا چاہ رہے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا؟

خیر، اس نے سوچا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مقتول کے عزیز واقارب ڈرتے ہوں گے۔ اگر کسی پر قتل کا الزام آتا ہے تو انتقامی کارروائی میں دوسروں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جنازے میں شریک معتبر، بااثر، اعلیٰ افسر قسم کے لوگ اس بات پر کیوں مطمئن نظر آ رہے تھے کہ یہ محض غنڈہ گردی ہے، اور اس قتل کا اس شہر کے تار و پود میں پڑی سیاسی گرہ سے کوئی تعلق نہیں؟

اس بات میں عجیب سا اطمینان تھا۔ نہیں صاحب، محض غنڈہ گردی ہے! سارا زور ''محض'' پر تھا۔ کیوں؟ دوسری صورت میں سیاسی الجھاؤ اور اس کے ممکنہ حل کو فوکس میں لانا ناگزیر ہو جاتا تھا، اس لیے اس منطق پر قدم بہ قدم چلا جائے کہ:

(۱) اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔
(۲) کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔
(۳) ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے، اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم خصی نہیں ہو گئے۔
(۴) اس قتل میں، یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمے داری نہیں۔

ایک محلے والا سفّاکی اور عیاری سے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور رازداری سے گویا ہوا:
''خوب صاحب، پیسوں کے لیے قتل کیونکر ہوا ہوگا؟'' جیب میں اس کی تین چار سو روپوں سے زیادہ رقم نہ تھی۔ گولی بہت قریب سے ماری گئی ہے۔ قمیص کی جیب کے پاس خون کا معمولی سا داغ ہے۔ ''یہ تو...'' اس نے سرگوشی میں کہا، ''کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔''

کیا یہ بدبخت اس قتل کو سیاسی ثابت کرنا چاہتا ہے؟ آنے والوں نے سنسنا کر سوچا تھا۔ خوفزدہ آنکھوں سے انھوں نے متحارب گروہوں کے اس گڑھ میں فاصلوں پر کھڑے لوگوں کے مشکوک گچھوں کو دیکھا تھا اور سرعت سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں انھوں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ زید، بکر یا عمر کیونکر گولی کھا کر مرا۔ کئی امکانات تھے:
(۱) کہ یہ محض ایک ڈاکے جمع قتل کی واردات تھی؛ (۲) کہ وہ ایم کیو ایم کا تھا اور حقیقی والوں نے قتل کر دیا؛ (۳) کہ وہ حقیقی والوں کا تھا اور ایم کیو ایم نے مار دیا؛ (۴) شیعہ تھا، سنیوں نے قتل کر دیا؛ (۵) سنی تھا، شیعوں نے مار دیا؛ (۶) حالات خراب کرنے کے لیے بغیر نشانہ لیے چلائی گئی گولیوں کی زد میں یوں ہی آ گیا۔

زید، بکر یا عمر کو کس نے قتل کیا؟

اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ عورت نے سندھ کے شاعر شاہ لطیف کی ایک نظم یاد کی جو انھوں نے کراچی پر لکھی تھی۔ کیا تب بھی ''کراچی'' تھا؟ ہاں تب بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گوٹھ کلاچی۔ وہاں ایک مچھیرا اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر سمندر میں مچھلیاں پکڑتے اور شام پڑے گھر لوٹتے۔ کہیں سے سمندر میں ایک مگرمچھ آ نکلا۔ اور پھر ایک دن وہ مچھیرا گھا تو گھر نہ لوٹا۔ یہی نظم تھی۔

گھا تو گھر نہیں آیا
شام پڑ گئی اور پھر رات

گھاتو گھر نہیں آیا

کار کے بونیٹ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔

مسئلے کا حل

''سیاسی مسئلہ حل کرنا ضروری نہیں ہوتا،'' فلائٹ پی کے سات چار پانچ میں بیٹھی عورت نے ذاتی، تقریباً نجی مشاہدوں پر مبنی ایک نجی، سنہرا نتیجہ اخذ کیا۔ ''مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کچھ عرصے بعد، آکسیجن کی کمی کے باعث، وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش گلنے سڑنے لگتی ہے۔ بدبو پھیلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے گلا سڑا گوشت کھانے آ نکلتے ہیں۔ غرض جب تک مسئلہ خاک میں ملے، خوب گند پھیلاتا ہے۔''

وہ اس نادر و نایاب نظری تشکیل پر خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی، شہر میں ہر روز پابندی سے گرتی لاشیں یاد کر کے، جو اس شہر میں رہنے والوں کے وجودی نظاموں میں گرتی رہی تھیں۔ انتظامیہ تمام آثار و شواہد کے مطابق معدوم ہو چکی تھی، اور چند دنوں میں محسوس ہونے لگا تھا کہ کراچی کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، جبکہ قتل و غارت گری کی قوتیں بلا جھجک یا روک ٹوک ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

اس شہر کی (ایک حد تک پوری ریاست کی) آبادی پر ٹھونسی ہوئی بےعملی (درحقیقت بےبسی) کی پینک میں عورت نے اس طرح کی کئی سنہری عمرانی نظری تشکیلات پلّو میں باندھ لی ہیں جن پر وہ گاہے بگاہے خوش ہونے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی تنظیمیں مار کھانے سے ختم نہیں ہوتیں۔ اگر طویل عرصے تک کوئی سیاسی جماعت کچلی جاتی رہے (بقول سندھیوں کے، ''موچڑوں میں رہے'') تو وہ مرتی نہیں بلکہ لولی لنگڑی، اندھی کانی یا گونگی بہری ہو جاتی ہے۔ پھر جب طاقتور عناصر اسے اپنے کام میں لانا چاہیں تو وہ لکڑی کی ٹانگ یا کانچ کی آنکھ لگائے، پھدکتی ہوئی، میدانِ عمل میں آتی ہے۔ وہ پہلے جیسی باقی نہیں رہی ہوتی۔ دیکھنے والے کچھ ہی عرصے میں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اب اپنا ہی ایک نوحہ ہے، اپنے ماضی کا ایک مسخ خاکہ۔ پھر آپ اگر اسے حکمران بھی بنا دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی اصل طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حکمران بن کر تو اَور بھی بےضرر ہو جاتی ہے۔ موچڑوں کی یاد اس کے حیاتیاتی خلیوں میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ متوقع جھانپڑ سے بچنے کے لیے وہ ہمیشہ کہنیوں سے منھ ڈھانپ کر بات کرتی ہے۔ متواتر مار کھانے کے بعد آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ وہ جنّات یا آسمانی طاقت سے بہرہ ور

پہلوانوں کا گروہ نہیں تھا، محض فانی اور انسانی کمزوریاں رکھنے والے لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہی تو تھی۔

ہوائی میزبان ان کے لیے ناشتہ لائی۔ عورت کا خیالی انٹرویو ادھورا رہ گیا۔

انٹرویو کا خیال دراصل اسے اس لیے آیا تھا کہ چند دن پہلے اخباروں میں مولانا عبدالستار ایدھی کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ کراچی سے پُراسرار طور پر لندن جا پہنچے تھے۔ ان کی بات غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر بھی ہوئی تھی۔ ملک کے نامور، ہر طبقے میں محترم، عمر رسیدہ سماجی فلاحی شخصیت، وہ اپنے گجراتی لہجے میں کہہ رہے تھے: ''میرے کو قتل کرنے کا پلان ہے۔ پھر مزار بھی بہت بڑا بنوائیں گے۔ پھر کہہ دیں گے کہ ایم کیو ایم نے یا کسی مذہبی جماعت نے مارا۔ ارے، میں کہتا ہوں یہ سب مت کرو۔ اس سے تو ڈائرکٹ آجاؤ۔ بات یہ ہے بھائی کہ پاکستان میں سچ لکھا نہیں جا سکتا۔''

پاکستان سناٹے میں آگیا تھا۔ یہ کیا ہوا! اس نے تو بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ ناگفتنی بات کہہ ڈالی۔ لوگ دم بخود، منھ پھاڑے، دن بھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل اخبارات کی تھی جو آزادیِ اظہار کے اس جمہوری دور میں عاقلانہ اور فاضلانہ مقالات کے ذریعے عرصے سے کچھ نہ کہنے کی سعی میں مصروف تھے۔ پھر لوگ ذرا کھانسے، گلا صاف کیا، کسمسائے۔ اخباروں نے مرے مرے لہجے میں کچھ تبصرہ کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے اداریے میں لکھا: ''مولانا نے ایجنسیوں کی طرف اشارہ کیا ہے،'' وغیرہ وغیرہ، ''اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔''

پھر بڑی سرعت سے اخباروں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس بدقسمت شہر کے روگ کی تشخیص سے گریزاں تھے جس کی بدامنی ضرب المثل بن چکی تھی۔ شہر کراچی پاکستان ہی کا سب سے بڑا نہیں، اپنی گنجان آبادی اور حیرت انگیز پھیلاؤ کے باعث دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ریاست کی معیشت کی شہ رگ، ریاستی خزانے کو سب سے زیادہ رقم فراہم کرنے والا، ملک کا سب سے زیادہ (درحقیقت واحد) جدید شہر، موٹر کاروں سے رواں، کسی بھی جدید کاروباری میگا پولس کی طرح غریب سے غریب اور مالدار سے مالدار شہریوں کا مسکن جس کی اب برسوں کی بے توجہی اور بدامنی سے ادھڑی ہوئی سڑکوں پر ننھی منّی مورِسوں اور بیتے برسوں کے کسی تہہ خانے سے ثابت و سالم اور صاف ستھری نکل آئی فوکس ویگنوں کے ساتھ ساتھ سالِ رواں کے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو گاڑی بھی نظر آ سکتی ہے، جہاں ملک کے مہنگے ترین فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ سستی ترین نہاری بھی میسر آ سکتی ہے، اور جہاں برسوں سے، کبھی

تیز تواتر کے ساتھ اور کبھی رک رک کر، سڑکوں پر، محلّوں پر گولیاں برسا کر بیک وقت متعدد مقتولوں کی لاشیں گرائی جاتی رہی ہیں۔ محلے محلے میں وارداتیں۔ ایسا زمانہ جب شہری سانس روک کر سوچتے تھے: ''آج کس علاقے کی باری ہے؟'' جس شہر کی خبریں پڑھ کر... صرف خبریں پڑھ کر... محفوظ فاصلے پر واقع ملک کے دوسرے شہر اب نفرت کرنے لگے تھے (ملک کے امورِ خارجہ کے سیکرٹری بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم تو کراچی کو اتنا چاہتے ہیں کہ کوئی نہ چاہتا ہوگا۔'' غیر ملکی نشریاتی ادارے کے سامنے اعتراف کی مانند، گویا دنیا سے یا غالباً سماج سے چھپائے ہوئے اپنے شہر سے اس عشق کے اظہار پر تشدد کی لپیٹ میں آئے ہوئے شہری زار و قطار روتے اور ہنستے ہوئے!)؛ جہاں ہمیشہ گڑبڑ رہتی ہے؛ جہاں سے لاشیں لوٹائی جاتی ہیں اور گجرات اور پشاور، جانے کہاں کہاں بھیجی جاتی ہیں؛ جہاں کے شہری پاگل ہیں، جنونی ہیں؛ جہاں مسلّح لڑکوں کے ٹولے، اور شہریوں اور راہ گیروں پر بندوقیں تانے سپاہیوں کے ٹرک، یکساں دہشت پھیلاتے، برسوں سے گھوم رہے ہیں، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

پاکستان میں کیا سچ نہیں لکھا جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔ کیا یہ کہ دہشت گردی کی وارداتیں حکومت کو متزلزل کرنے، بدلنے کے لیے، حالات کو ایک نیا، من چاہا موڑ دینے کے لیے طاقتور اداروں کی جانب سے استعمال کی جا سکتی ہیں، جیسے کرسی کے نیچے سے قالین گھسیٹنے کے لیے جھٹکے دیے جائیں؟ (جیسے ہندوستان میں بعض اوقات ہندو مسلم فسادات کرا کے کیا جاتا ہے، یا جیسے اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی کو فوری طور پر وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھانے کے لیے مبینہ طور پر کانگریسیوں نے سکھ ہندو فسادات کروائے تھے؟) یا یہ کہ گو بظاہر ملک میں جمہوریت ہے (''فری ورلڈ'' کی ایک اور کامرانی، مسلّح آمریت کے دقیانوسی نظام سے نکال کر جمہوریت میں داخل کی ہوئی ایک اور شادماں ریاست، نئے عالمی نظام کے تاج میں سُرخاب کا پر، جس پر یورپ اور امریکہ کے حساس اور نازک دل انسانیت پرست مہذب حلقے سکون کا سانس لے سکتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کو مبارکباد دے سکتے ہیں)، مگر درحقیقت سابق حکمراں فوجی جنرل کی ایک دن اچانک فضا میں دھماکے دار تحلیل کے باوجود ملک میں حکومت کسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی نہیں ہے، اور یہ کہ انتخابات کے متعدد بار انعقاد کے باوجود، جس کے بعد حکومتیں کرسیِ اقتدار پر بٹھائی اور اُٹھائی اور پھر بٹھائی جاتی رہی ہیں مگر اس تمام اٹھک بیٹھک کے کھیل میں اصل قوت ہنوز روپوش ہاتھوں میں ہے؟

کراچی کیوں تشدد کے سفاک خونیں پنجے میں سسک رہا ہے؟ اور اس کے شہری... اس کے شہری کن

حالات سے گزر رہے ہیں؟

کہا جا سکتا تھا، عورت نے سوچا، کہ آمریت سے جمہوری جدید ریاست بننے کا عمل ہموار نہیں ہوتا اور اس میں رکاوٹوں کا در آنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر شاید، اس نے سوچا، منفی حالات اس قسم کے ہر ملک میں اس طرح اپنے عروج پر نہیں ہوتے جیسے اس کے اپنے وطن میں ہیں، اور ممکن ہے تضادات بھی لازماً اتنے متنوع اور متعدد نہ ہوتے ہوں۔

اس کے ذہن میں بنگلہ دیش کا خیال آیا، جو طویل مدت بعد فوجی حکومت کے دور سے نکلا تھا، ایک تقریباً یک قومی ریاست جو کئی لحاظ سے اس کے اپنے وطن سے بہتر صورت حال رکھتی تھی؛ جب کہ اس کا وطن کسی لاطینی امریکی یا نو آزاد افریقی ریاست سے زیادہ مماثل تھا جہاں آزادیِ اظہار ملنے تک اظہار کے وسائل مسخ اور برباد ہو چکے تھے۔ خفیہ ایجنٹوں سے بھرے ہوئے، خوفزدہ، دولت مند مالکان کے یہ اخبارات سچ لکھنے سے معذور تھے۔ قومی زبان کے اخبارات، جنھیں ملک کی خواندہ آبادی کا بڑا حصہ پڑھ سکتا تھا، سنسر شپ کی طویل، ریاست کی تقریباً تمام تر زندگی پر محیط، روایت سے جاں بر نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار توازلی و ابدی طاقتور عناصر کی خوشنودی کا اتنا عادی تھا کہ اسے فسطائی رجحانات کی چھت کا مضبوط ترین ستون قرار دیا جا سکتا تھا۔ انگریزی اخبارات، جو آمریت کے اختتامی دور میں حکومت پر نکتہ چینی کے لیے نسبتاً آزاد تھے، مقامی قارئین کی کم تعداد تک پہنچ سکتے تھے، مگر مغربی دنیا، خصوصاً امداد دینے والے ملکوں کے واسطے، جو امداد کے ساتھ حقوقِ انسانی کی تخ لگا رہے تھے، اس ملک میں آزادیِ اظہار کے مزین نمائشی جھروکے کا کام دے سکتے تھے، اپنے بہتر شعور اور روشن خیالی کے باوجود بے بس اور حد درجہ محتاط تھے اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ حقیقت ناگفتنی تھی کہ اصل طاقت کن عناصر کے پاس ہے۔ اس غیبی اور طاقتور ہاتھ کے لیے انھوں نے، حیاداری کے ساتھ، ''اسٹیبلشمنٹ'' کی ترکیب اختراع کر لی تھی تاکہ پہلو بچا کر اس کا ذکر کر سکیں، یا گاہے گاہے اس کو کوئی دردمندانہ مشورہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت سے پڑھنے والے ان میں شائع شدہ تبصروں کی رپورٹوں تک پر اعتماد کرنا چھوڑ چکے تھے اور انھیں محض یہ اندازہ لگانے کے لیے پڑھتے تھے کہ ان گنت ایجنٹوں کے ذریعے داخل (پلانٹ) کی گئی یہ خبریں کس خفیہ ادارے نے لکھوائی ہیں اور ان کی بنیاد پر آئندہ حالات کے کون سا رُخ اختیار کرنے کی پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔

ملک کی سیاسی جماعتیں، جن کا مفاد سونے کی چڑیا، اس شہر کراچی، سے وابستہ تھا، گو صالح نہ تھیں، مگر ان کی کم شعوری یا نا اہلی کو اس پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا کہ کم از کم تیس برس کے طویل عرصے میں ظاہر یا پس پردہ آہنی طاقتور ہاتھ نے عوامی حمایت رکھنے والی ہر سیاسی تنظیم کو بزورِ طاقت کچلنے اور پھر ساز باز، اندر ہی اندر گٹھ جوڑ، رسہ گیری، دھمکی، بلیک میل اور نزخرے پر گھٹنا رکھنے کے مسلسل عمل کے ذریعے... اس سے قبل کہ وہ سنبھلے اور روپوش ہاتھ کے پسِ پردہ اشاروں اور امداد کے بغیر کاروبار حکومت چلا سکے... اپاہج بنا دیا تھا اور برسوں اس بات کا پروپیگنڈا کیا تھا کہ دراصل یہی پوری قوم کے مفاد میں ہے۔ تیسری دنیا کے نو آزاد، عوام دوست نظام قائم کرنے کے لیے تڑپتی ریاستوں میں وہ ادارے جنھیں ماضی میں خود مغربی جمہوریتوں نے پالا تھا، اپنے تسلسل اور عام لوگوں کی ان تک نارسائی کے باعث اب ایسے قائم بالذات طبقے بن چکے تھے جن کے دانت معیشت کی رگِ گلو میں پیوست تھے اور جو نو آزاد ریاستوں کا ایک بالکل نیا فنامنن (phenomenon)، ایک جدید مظہری وقوعہ تھے جو ابھی مغرب کی عمرانی کتب میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

مگر کراچی ہی کیوں؟ آخر یہ شہر اس ہولناک تشدد کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟

کیونکہ یہ سچ بھی لکھنا ہمت کی بات ہے کہ کراچی تیسری دنیا کے کسی عام سے ملک کا عام سا شہر نہیں تھا۔ یہ ایک خاص الخاص ملک کا خاص شہر تھا؛ دنیا کی دو بڑی ریاستوں کی رسہ کشی میں سامنے کا فریق بننے کا اعزاز رکھنے والے ملک کا ایسا شہر جس پر سرد جنگ کو اختتام پذیر کرنے والی افغان جنگ اور اس کی خاطر جلد بازی میں کی گئی کچی تعمیروں کے ٹوٹ کر دھڑام سے زمیں بوس ہونے کا تمام دھما کا خیز ملبہ برسوں سے گر رہا تھا؛ ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگجو حکمرانوں نے جرائم، تشدد اور مذہبی جنون کی تاریک جہالت کا زہریلا فضلہ پھینکنے کے لیے کوڑے دان کی طرح استعمال کیا تھا، جبکہ وہ خود ایک خوابِ خرگوش میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اور اس وقت جب وہ جرائم، تشدد اور تاریک جہالت کو کام میں لاتے ہوئے، دنیا کو یک قطبی (uni-polar) بنانے کی مہم میں جٹے تھے (کیونکہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے)، یہ زہریلا فضلہ شہر کی نسوں میں رواں تھا۔

دبئی کا درزی

عورت کے ساتھ والی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر لانڈھی سے نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ اسے بعد میں معلوم

ہوا، اور یہ معلوم کر کے اسے حیرت بھی ہوئی، وہ ہندوستان سے آئے تھے۔

''اخاہ! تو کیا آپ وہاں پی آئی اے سے سفر کر سکتے ہیں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

''کیوں نہیں،'' انھوں نے ترنت جواب دیا تھا۔ ''ایئر انڈیا سے آدھی قیمت پر لے جاتے ہیں۔''

اس کے برابر والی نشست پر ایک سانولی، سوکھی کانکھ عورت بیٹھی تھی؛ تیز جامنی ساری اور گھرے سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا جس کو بھگونے والے ناریل کے اصلی تیل کی تیز، کچی نباتی مہک ان کی چائے اور کافی میں گھل رہی تھی۔ وہ آندھرا پردیش سے آئی تھی اور اب دوبئ میں کسی شیخ کے پاس آیا گیری کے لیے جا رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا مرد الہ آباد سے دوبئ جا رہا تھا۔ دوبئ میں اس کا درزی کا کام تھا، جیسا کہ اس نے بتایا۔

''آپ کبھی کراچی گئے ہیں؟'' عورت نے اسے اتنے اشتیاق سے ہزاروں فٹ کی بلندی سے لانڈھی کو پہچاننے کی کوشش کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''جی نہیں،'' درزی نے الہ آباد کی پختہ، الفاظ کے شستہ صوتی زیر و بم رکھنے والی اردو میں جواب دیا۔ ''بس ہوائی اڈے پر رکے ہیں، دو ایک گھنٹے کے لیے۔''

''تو آپ کے رشتے دار ہوں گے یہاں؟''

''جی ہاں، دونوں چچا یہیں ہیں۔ لانڈھی میں رہتے ہیں۔ پارسال والدہ گئی تھیں۔''

''ویسے ہندوستان کے حالات اب کیسے ہیں؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، ایسا سوال جو ہر پاکستانی ہندوستانی مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔

''جی ٹھیک ٹھاک ہیں اب تو،'' درزی نے کہا۔ ''وہ جو پہلے پریشانی سی تھی سو تو اب دب دبا گئی۔''

''تو اب...'' عورت نے کچھ گول مول سا سوال کیا تھا، ''کچھ گڑبڑ نہیں آپ کی طرف؟''

''بالکل نہیں،'' دونوں ہندوستانیوں نے سر ہلایا۔ عورت آندھرا کی آیا کا اندرونِ ملک آمد کا کارڈ بھر رہی تھی (کیونکہ آیا کو اردو یا انگریزی نہیں آتی تھی) اور اس وقت اس کے پاسپورٹ سے نقل کر کے اس کا مشکل سا تیلگو نام لکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آندھرا کے کسی بالکل گمنام گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور یہ تازہ، نیا نکور پاسپورٹ اسے حیدرآباد (دکن) سے ملا تھا جہاں ہوسکتا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لیے گئی ہو۔ اس کے سوال کے جواب میں ''نہیں نہیں'' میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت سیاہ لبوں میں چمکے۔ عورت کو اس کی نظروں میں امید بھری التجا دکھائی دی گویا کہتی ہو، ''ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑا بالکل

نہیں ہو رہا؛ اے مسلمان عورت، تو میرا کارڈ صحیح صحیح بھر دے۔"

دوبئی میں پتے کا خانہ بھروانے کے لیے اس نے سفید پلاسٹک کی جالی کے تھیلے سے بڑے بڑے رنگین پھولوں والے ریشمی رومال میں بہت احتیاط سے لپیٹا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ شیخ کا نام اور پوسٹ بکس نمبر لکھوانے کے بعد کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ اسی طرح احتیاط سے تھیلے میں واپس رکھ دیا۔

"کیا اتنا کافی ہوگا؟" عورت نے کچھ تشویش سے پوچھا۔

"جی ہاں، جی ہاں، بالکل کافی ہوگا" درزی نے فوراً کہا۔ وہ بڑی توجہ سے کارڈ بھروانے میں اپنی ہم وطن انجان تیلگو عورت کی مدد کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں ان دونوں میں جیسے کوئی بندھن بندھ گیا تھا۔ عورت نے سوچا، دوبئی اترنے پر درزی کمال ذمے داری سے آیا کو بخیریت شیخ کے حوالے کرے گا۔

وہ کون تھی؟ کیا شادی شدہ تھی؟ کیا اس کے بچے تھے؟ عورت یہ سب کچھ آندھرا کی آیا کی زبان نہ جاننے کے باعث اس سے نہ پوچھ سکی۔

وہ درزی سے باتیں کرنے لگی۔ توقع کے عین مطابق، درزی خوشحال تھا۔ جی ہاں، دوبئی میں تین رشتے داروں کو کام پر لگا چکا تھا۔ بیوی بچے وہیں الہ آباد میں رہتے تھے، لیکن وہ خود ہر دو ایک سال بعد چکر لگا آتا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بی کام میں پڑھتا ہے؛ اب وہ بھی اگلے سال دوبئی آ کر اس کا ہاتھ بٹائے گا۔

"لیکن،" درزی نے تحمل سے کہا، "بی اے ایم اے کیا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! لاکھوں پڑھے لکھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ دو چار ایم اے پاس کو تو..." اس نے سکون سے کہا، "خدا کے فضل و کرم سے میں خود اپنے پاس نوکری دے سکتا ہوں۔"

ہمارا دوبئی کا درزی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔

"لیکن..." عورت نے چونکہ چنانچہ کے چکر میں پڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی تھی، "تعلیم بھی ضروری ہے نا، یعنی روشن خیالی، سمجھ بوجھ، عقل و دانش وغیرہ کے لیے..."

درزی مسکرانے لگا۔

عورت نے شرمندگی سے کہا، "اس کے لیے، آج کل ایک باقاعدہ اصطلاح ہے... یعنی تربیت اور تعلیم کے لیے... ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ — انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔"

پھر اس نے کہا، ''ہمارے وہاں کے ایک شاعر نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا ہے۔''

''کیا شعر کہا ہے؟ ارشاد، ارشاد!''

بھلا یو پی کا آدمی اور شعر نہ سننا چاہے!

عورت نے پاکستانی مزدور شاعر کا شعر سنایا:

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

''واہ وا! بہت خوب!'' درزی نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ اس نے عورت کو بتایا کہ وہ دوبئی میں اپنے یار دوستوں کے لیے الہ آباد کے شہرۂ آفاق امرودوں کے کریٹ لے جا رہا ہے؛ اگر اسے خبر ہوتی کہ راستے میں اسے شعر سنانے والی ہم سفر ملے گی تو وہ ایک کریٹ اوپر ہی رکھ لیتا، اسے نذر کرنے کے لیے۔

گھبراتی ہوئی اور اپنے سانولے سوکھے وجود کی پوری قوت سے گھبراہٹ کو چھپاتی ہوئی تیلگو آیا کے برعکس، درزی دوبئی لوٹنے پر خوش تھا، مسرور اور پُراعتماد۔ آخر وہ وہاں دس بارہ سال سے رہ رہا تھا۔

پھر وہ عورت کو اپنے گھر کے قصے سنانے لگا۔

''دیکھیے صاحب، حسد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مکان کی مرمت کروائی ہے، دو تین کمرے چھت پر بھی بنائے ہیں۔ تو اب کی بار میرے وہاں ہوتے ہوئے پڑوسیوں نے ہماری شکایت کر دی۔ پہلے ان سے بہت اچھے تعلقات تھے، لیکن اس بار تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ ان کے گھر کی دوسری منزل سے مرد ہمارے گھر میں جھانکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے، ان کی عورتیں شہر بھر میں تو گھومتی پھرتی ہیں۔''

عورت غور سے درزی کی بات سنتی رہی۔ گہرے سانولے رنگ کا، گٹھے ہوئے جسم والا، کھڑے نین نقش، چمک دار سیاہ آنکھیں... خوشحالی اس کے ہنس مکھ ہونے کا یقیناً ایک سبب ہوگی۔ وہ ایک پُرکشش مرد تھا، پینتیس چالیس کا رہا ہوگا۔ سال بھر یہ دوبئی میں کیا کرتا ہوگا؟ بیوی تو ساتھ رہتی نہیں۔ پھر اس نے سوچا— مگر آیائیں تو ہیں۔

درزی نے اسے بتایا تھا، ''چھوٹا سا انتظام ہے دوبئی میں اپنا۔ خدا کے فضل سے سب کچھ ہے: فریج، ایئر کنڈیشنر۔ ایئر کنڈیشنر کے بغیر تو رہا نہیں جاتا نا، بڑی گرمی پڑتی ہے۔''

عورت نے آیا پر نظر ڈالی۔ اسے جوش ملیح آبادی کی نظم ''تلنگن'' یاد آئی۔ سنگِ سیاہ میں تراشی ہوئی،

تھمے طوفان سی جوانی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تو وہ والی عورت نہ تھی، یہ دوسری طرح کی تلنگن — دبلے بدن میں گھبراہٹ منجمد کیے، کمائی کے لیے (کن کے لیے کمائی؟ ماں باپ کے لیے؟ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے؟ بچوں کے لیے؟) دور دیسوں کو جاتی ہوئی، یوں اکڑی بیٹھی جیسے فوجی لام پر جاتا ہو۔

عورت درزی سے یہ نہ پوچھ سکی تھی کہ اس کے پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان۔ بعد میں اس نے سوچا کہ پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا؛ اس طرح کچھ نظریاتی کلّیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسلّمہ اصول تھا کہ مخلوط معاشروں میں ایک فرقے کی معاشی ترقی سے فرقہ واریت کی کھیتی میں بیج پڑتے ہیں۔ اگر درزی کے پڑوسی ہندو تھے تب درزی کے مکان کی دوسری منزل انھیں بابری مسجد کا شدت سے مخالف بنا سکتی تھی۔

ہندوستان... ہندوستان... تقسیم سے ستر کی دہائی تک، ایک غیر مختتم تسلسل... مراد آباد... میرٹھ... بلووں کا طویل سلسلہ... سنسان عید گاہ کی مسلی، سلوٹیں پڑی دریوں پر خون کے دھبے... دروازے پر عید کے لیے خریدے گئے نئے جوتوں کا ڈھیر... ایک ننھا منا، کلابتوں کا جوتا... کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی سفید کڑھی ہوئی ٹوپی...

اور برسوں پہلے کراچی میں... رنچھوڑ لائن کی تنگ، پیچ دار گلیوں میں سلوٹا پاڑے کے دائیں جانب، جہاں سن سینتالیس اڑتالیس کا شاندار سینما گھر لائٹ ہاؤس اپنی شفاف شیشے جڑی بلندی میں ہلکی دھوپ میں کھڑا جگمگا رہا تھا، چھ برس کا جلال ایک سہ منزلہ عمارت میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے نیچے دروازے پر کچھ خوفزدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکان کا تالا توڑا گیا ہے اور سامان لوٹا جا رہا ہے۔

گلی میں شور ہے۔ چھین جھپٹ میں لوگوں کے بال بکھر گئے ہیں، دامنوں کے چاک اُدھڑ گئے ہیں۔

''منے، اندر آ جاؤ!'' بالکنی سے اس کی اماں پکارتی ہیں۔

''یہ... یہ...'' جلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تتلا کر پوچھتا ہے: ''یہ کا ہولہا ہے؟''

''کچھ نہیں، سامان لُوٹا جا رہا ہے۔ تم اندر آ جاؤ۔'' اماں جلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔

لٹتے مکان کے سامان میں سے کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی جلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ ننھا جلال ڈرتے ڈرتے اسے اٹھاتا ہے۔ پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آکر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔

''اماں، دیکھو! ہم نے بھی لوٹا!''

مگر وہ پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان، عورت یہ پوچھ نہ پائی تھی۔ وہ جھجک کر رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تیلگو آیا بیٹھی تھی، اور وہ اردو انگریزی بھلے ہی نہ سمجھتی ہو مگر لفظ ''ہندو'' تو ضرور سمجھ سکتی تھی۔ آیا کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ایسا سوال نہ پوچھ سکتی تھی جس میں فرقہ واریت کا پہلو نکلتا ہو۔

تو کیا ہم اس قدر تکلف سے بیٹھے تھے؟ عورت بعد میں سوچتی ہے۔ شاید تکلف سے نہیں، تہذیب سے۔ سویرے کی پرواز میں جہاز کی نشستوں پر شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے، اپنا لحاظ سلامت لیے، ہوا میں اڑے جاتے تین مسافر...

اور اگر — عورت نے دوبئی میں دونوں ہندوستانی مسافروں کو وداع کرنے کے بعد تینوں نشستوں پر اکیلے قبضہ جماتے ہوئے، ہاتھوں کے انگوٹھے اوپر تلے گھماتے ہوئے، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا تھا — اگر وہ پڑوسی مسلمان ہوتے تب؟ تب کیا ثابت ہوتا؟

مگر یہ بات وہ معلوم کر ہی نہ سکی تھی۔ وہ کسی بھی کلیے یا مسلّمہ نظریے میں ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے تھے اور عورت کے تخیل میں ہمیشہ یوں ہی پہیلی بن کر رہنے والے تھے — عمرانی معلومات فراہم کرنے سے انکاری، ایک کھڑکی سے جھانکتے، ہنس کر اس کو چڑاتے صرف کچھ حاسد پڑوسی، جو نہ جانے ہندو تھے کہ مسلمان!

ناظم آباد نمبر چار میں علیم الدین اور کلیم الدین کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کے تحت الشعور میں بسے گورکھپور سے ٹیکم چند نکل کر آ وارد ہوا اور عجیب طرح کے اشارے کر کر کے کچھ پوچھنے لگا۔ تنگ آ کر علیم الدین نے کہا، ''نہیں بھائی ٹیکم چند، جداگانہ انتخابات کا مسلم لیگی مطالبہ کانگریس نے منظور نہیں کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں موتی لال نہرو نے اسے مسترد کر دیا تھا۔''

نہرو... جو کشمیر سے آئے تھے، صدیوں پہلے۔ مغل حاکموں نے انھیں نہر کے پاس جاگیر عطا کی تو وہ نہرو کہلائے۔

سب لوگ کہیں نہ کہیں سے آئے ہیں اور کوئی بھی کہیں کا ابدالآباد سے رہنے والا نہیں ہے۔

انسانوں کے ہجوم گھوڑوں پر سوار، ہاتھیوں پر لدے، اونٹوں اور خچروں پر، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں، صحرا اور سمندر الانگھتے جوق در جوق سفر میں ہیں اور ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف ہیں — رزق حاصل کرنے کے لیے، پیٹ میں دو نوالے روٹی ڈالنے کے لیے، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان حاصل کرنے کے لیے؛ علاوہ ازیں ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی وژن، ایئر کنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا تمام اٹرم کھٹرم سامان حاصل کرنے کے لیے، انسانوں کے ہجوم بسوں اور ریل گاڑیوں میں، اونٹوں اور خچروں پر، چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور جہازوں میں، ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب سفر کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے جدال و قتال میں مصروف ہیں۔

چنانچہ کلیم الدین گویا ہوا:

''اوہ! تو پھر... ایسا کیوں نہیں کیا جاتا... کہ... کہ بھئی، یہ ساری اشیا جن دکانوں میں بھری ہیں ان کو... کیا نام کہ لوٹ لیا جائے اور یہ سب چیزیں برابر برابر تقسیم کر دی جائیں لوگوں میں۔ بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے... میرے خیال میں تو یہ زیادہ بہتر طریقہ ہوگا۔''

''یعنی کرۂ ارض پر مکمل طوائف الملوکی قائم کر دی جائے؟'' علیم الدین نے استفسار کیا۔

''نہیں نہیں، اس کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ زندگی سادگی سے گذاری جائے۔ انسانی ضروریات کیا ہیں، اس کی از سرِ نو تفہیم کی جائے۔ مثلاً ایئر کنڈیشنر... کیا یہ جائز انسانی ضرورت ہے؟''

''نہیں، مگر جب بغیر ایئر کنڈیشنر والا ہجوم ایک طبقے کے کتوں کو بھی ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں آرام کرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی یہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امرا کو اور ان کے کتوں کو حاصل ہے۔''

''یہ تو صحیح ہے۔ طبقات بڑی گڑ بڑ چیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں طبقات ہونے کے باعث سب سے زیادہ بدامنی اور خونریزی ہوئی ہے... تو طبقات ختم کر دیے جائیں!''

''ایسا ہوا تھا نا پیارے! سوویت یونین اور چین میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا گیا تھا نا! مگر یہ بیسویں صدی کا آخر ہے۔ دنیا نے سوشلزم کو مسترد کر دیا ہے۔''

''وہ تو اس لیے کہ آزادی نہیں تھی... ضرورت سے زیادہ نوکر شاہی آ گئی تھی اس نظام میں...''

''جی نہیں! اس لیے کہ اشتراکی ملکوں کے عوام اپنے اشتراکی قومی ملکیت کے کارخانوں میں بنے

بھدے کیمروں اور ناقص کلائی کی گھڑیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ خوبصورت اور اعلیٰ تر جاپانی کیمرے اور گھڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سوئس چاکلیٹ کھانا چاہتے تھے۔''

''آہ! صرف ان چیزوں کے لیے!'' سننے والے نے کہا۔

''ہاں!'' کہنے والے نے سنایا اور چند ردّی کاغذ ہوا میں اچھالے۔''وہ گیا اشتراکی نظام ... صرف ایک سوئس چاکلیٹ کے لیے!''

تو آدمی تُو ایسا ہے!

ایسا ہے بھئی ایسا ہے!

علیم الدین رضوی اور کلیم الدین رضوی، سکنہ ناظم آباد نمبر چار، نے قوالی گائی اور دھمال ڈالا۔

برسوں پہلے کی بات ہے، کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم اچانک رک گئے۔ چورنگی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مائیکروفون تھا اور وہ کچھ تقریر سی کر رہا تھا۔ آس پاس سے گاڑیاں تو بغیر اس پر توجہ دیے گزر رہی تھیں، مگر چند پیدل چلنے والے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا:

''بھائیو اور بہنو! سندھیو اور مہاجرو! اور پنجابی پٹھان بلوچو! چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہنے والو! بسوں میں سفر کرنے والو! ہمارے خواب کہاں کھو گئے؟

''کہاں کھو گئے ہمارے سنہرے سپنے ہمارے وطن پاکستان میں؟ سپنے جو ہمارے آنکھوں کو سجائے رکھتے تھے۔ آدرش جن کی طاقت سے ہم پہروں بس اسٹاپ پر دھوپ میں کھڑے رہ سکتے تھے۔ اس دولت مند طبقے نے وہ خواب ہم سے چھین لیے۔ یہ لوگ اتنے مفلس تھے کہ انھوں نے مفلسوں کے خواب چُرا لیے۔ ثروت اور عیاشی میں محصور یہ لوگ ہمارے خوابوں کے جھوٹے دعویدار بن چکے ہیں۔ یہ جیٹ سیٹر جنیوا اور نیویارک میں ہمارے خوابوں کا ناٹک رچا رہے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کی انجمنیں بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا طرزِ زندگی اس سرزمین پر سب سے گھناؤنا منظر ہے اور اس بدصورتی کو مٹا ڈالنا یہاں کے انسانوں کا جائز حق ہے۔

''اس طبقے کی عورتیں عورتوں کے حقوق کی انجمنیں بناتی ہیں اور ایک لاکھ روپے کا جوڑا پہن کر نو لاکھ

روپے کی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ایک کروڑ روپے کی شادی کی تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔ اور تمھاری بیٹیوں کے معمولی جہیز پولیس اور رینجرز کے افراد گھروں میں گھس کر چھین لے جاتے ہیں۔

''اس امیر طبقے نے ہمارے خواب چُرا لیے اور ان کے بدلے میں اپنے خواب ہماری آنکھوں کے پپوٹوں میں کسی زہریلے انجکشن کی طرح داخل کر دیے — تموّل اور ثروت کے... عیاشی کے خواب۔ اب ہم وہی خواب دیکھ رہے ہیں اور ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائر کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کر رہے ہیں۔

''قومی حقوق! قومی حقوق کیا ہیں؟ روٹی، کپڑا اور مکان — یہی تو چاہیے انسان کو! اب اس کے ساتھ کار اور ایئر کنڈیشنر اور بجلی سے چلنے والا جدید ترین سامان بھی شامل ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو لڑ رہے ہیں ہم۔ جتھے اور گلّے بنا بنا کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔

''اور امیر طبقہ اپنی ساری ظاہری واویلا کے باوجود اس سے خوش ہے۔ وہ یہ صورتِ حال برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

''ہمیں قومی حقوق کے ساتھ اپنے چُرا لیے گئے خواب کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی جو ہماری تھی اور جو برباد کر دی گئی۔ اتنی بری تو نہ تھی ہماری چھوٹی سی دنیا۔ اس میں ایک پیڑ تھا، اور ایک مختصر آنگن پر پھیلا ہوا بسیط نیلا آسمان۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی اور اس پر ڈھکا کٹورا۔ اس میں کتابیں تھیں اور علم کی پیاس تھی۔ اور ایک پرانی جائے نماز جس پر ہماری ماں یا باپ بغیر خونخوار نعرے لگائے عبادت کر سکتے تھے۔ اور جوان لڑکیاں اور لڑکے جو سیاہ عبائیں پہنے بغیر، الف لیلہ کی رقاصاؤں کی طرح آنکھوں سے نیچے تک نقابیں اوڑھے بغیر،... چغے پہنے بغیر اور سروں پر مسخروں کے سے رنگ برنگے عمامے باندھے بغیر رہتے تھے، اور خدا کی جھوٹی قسم کھانے سے جھجکتے تھے۔

''ہمیں اپنی جھجک کی بازیافت کی ضرورت ہے جو ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی گئی ہیں۔ اور اس قتل و غارت گری کو تقدس بخشنے کے لیے ہمارے شہروں کی شاہراہوں پر جا بجا اللہ اکبر اور ہوالصمد کے سبز بورڈ آویزاں کر دیے گئے ہیں...''

وہ یہاں تک کہہ پایا تھا کہ ہجوم سے ایک غلغلہ اٹھا۔

''بور... بور... بور! مارو! نکالو اسے!''

ہجوم اس پر سڑے ہوئے ٹماٹر اور گندے انڈے برسا کر تتر بتر ہو گیا۔
اب اس شخص نے پینترا بدل کر دوبارہ تقریر شروع کی۔ اس نے مکا لہرا کر کہا:
''مہاجروں کے حقوق کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے!''
ہجوم سرعت سے جمع ہو گیا اور تالیوں کا ایسا شور بلند ہوا کہ آس پاس کی عمارتیں لرزنے لگیں۔
پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا:
''ہم سندھیوں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک جنگ کریں گے۔''
حیدر آباد، سکھر، نواب شاہ اور پورے سندھ سے نعروں کا ایسا شور اٹھا کہ دھرتی دھمکنے لگی۔ ''مرسوں مرسوں! سندھ نہ ڈیسوں!''
وہ آدمی سندھیوں اور مہاجروں کا رہنما بن گیا۔

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک سنسنی محسوس کی۔
پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔
اس کے بعد مزید قتل ہوئے۔ یہ سب قتل متوقع تھے۔
کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتل عام کی توقع کر رہے ہیں... حالانکہ بیچ میں لوگ اپنی توقع بھول جاتے ہیں۔
کبھی انھیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا اب ان پر اثر نہیں ہو رہا۔ وہ کثیر التعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق بنانے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آج کا اسکور پوچھتے ہیں۔
ان میں سے چند کہتے ہیں، ''قتل اور جرائم تو ہر شہر میں ہوتے ہیں۔''
''بڑے شہروں میں قتل اور جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔''
''شکاگو میں بہت قتل اور جرائم ہوتے ہیں۔''
''کراچی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔''
''یہاں کوئی تفریحی مقام نہیں۔'' (اس لیے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں؟)

''اگر سڑکوں کی مرمت ہو جائے، اگر سیوریج سسٹم ٹھیک ہو جائے، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پیاز کے چھلکے

سال بھر سے ریاست کے دارالخلافے میں ایک افواہ گشت کر رہی تھی (گو یہ بات بڑی رازداری سے کہی جاتی تھی) کہ بااختیار قوتوں نے کراچی کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ منصوبہ یہ تھا کہ چونکہ کراچی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور گنجلک ہے، اور اسے حل کرنا صوبائی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں، لہٰذا مختصر پیمانے پر تھوڑے بہت خون خرابے کے بعد کراچی کو وفاقی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ (دوسری صورت میں... کہا گیا تھا... بہت بڑے پیمانے پر خون خرابے کا خطرہ تھا۔) اس منصوبے کا کیا ہوا؟ کیا یہ چاروں طرف گرتی لاشیں چھ سات، چار پانچ، دو تین، ہر روز، اور کبھی زیادہ... اسی منصوبے کی تکمیل کا حصہ ہیں؟ جیسے پرت در پرت، منصوبے کی پیاز کے چھلکے اترتے ہوں... یا یہ منصوبہ مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیچ میں چھوڑ دیا گیا؟ یا یہ محض افواہ تھی؛ ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں گیا تھا؟

کراچی کے شہری یہ نہیں جانتے؛ صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ مسائل کے حل کی حکمتِ عملی خفیہ ہے۔ ایسے مضبوط صندوقوں میں بند، آر پار نظر آنا جن کی خصوصیت نہیں۔ وہ اندھیرے میں ہیں، اور صرف امید کر سکتے ہیں کہ بااختیار ہاتھ کی حکمتِ عملی درست ہوگی، تیر (اب کی بار) نشانے پر بیٹھے گا، اور پھر... شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس منصوبے کی افواہ جب کراچی میں پھیلی تھی تو سننے والوں نے اطمینان تک محسوس کیا تھا۔ وہ ایک ناٹک کی طرح کھیلے جانے والے خون خرابے کو، جو خفیہ ہاتھوں کے قابو میں ہو، قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے۔ مگر ذہنی طور پر تیار ہونا ایک بات ہے، سچ مچ کسی صورت حال سے گزرنا بالکل دوسری بات۔ اب جبکہ خون بہنا شروع ہو گیا تھا (اگر یہ اس مجوزہ، یا مبینہ، ناٹک کا حصہ تھا!) تو وہ بلبلا رہے تھے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خونریزی ان کا، ملک کا، قوم کا، کراچی کا بھلا چاہنے والوں کے (انھیں اتنا چاہنے والوں کے جتنا کوئی بھی نہیں چاہتا ہوگا) بہ قائمی ہوش و حواس بنائے ہوئے کسی ایسے منصوبے کا حصہ شاید نہیں ہو سکتی جس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کیا شہر کے لوگ اپنے حالات خود ٹھیک نہیں کر سکتے؟

لیکن اس کا جواب ایک اور حکمتِ عملی میں ہے؛ سن ۱۹۷۷ء سے جاری و ساری اور سختی سے نافذ حکمتِ عملی جس کے ذریعے سے منظم طور پر عام لوگوں کو سیاسی عمل سے اور معاشرے کو کوئی بھی رخ دینے کی قوت سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ دہشت ناک فوجی حکومت کے طویل، اعصاب شکن برسوں نے لوگوں کو، بحیثیت ہوش مند شہری، معطل کر دیا ہے، ایک سطح پر، اَن جانے میں، کسی مقام پر وہ اپنی صلاحیتوں سے دستبردار بھی ہو گئے ہیں۔ فوجی آمریت میں جلا وطن ہو جانے والے لوگوں نے پاکستان واپس آ کر ہاتھ پر ہاتھ دھری ایسی مخلوق کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں برسوں صرف وی سی آر اور ٹیلی وژن دیکھتے دیکھتے چوکور ہو چکی تھیں اور جو صوفوں پر، کرسیوں پر، چٹائیوں پر دراز یہی کہہ رہی تھی کہ کچھ کروایا جا رہا ہے، کچھ کروایا جانے والا ہے، اور اپنی انتہائی مفعولیت کی حالت سے بے خبر تھی۔

معیشت

اس شہر میں مَیں اجنبی یوں نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا سارا سماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اِس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر
بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

بازار میں ہر روز عید
سستی فروخت، فوری خرید
میلے دکاں داروں کے ہیں
کیا شور ہرکاروں کے ہیں
اشیا کا جوبن ہے عیاں
چھڑکاؤ ان کے صحن میں، خوشبو لٹاتا موگرا
پھر شور اٹھا ناگہاں
لو لڑ پڑے گاہک نئے
خنجر چھری پستول نکلے، بم پھٹا، پھیلا دھواں
دوڑا پولیس کا آدمی، سیٹی بجی
بازار کے اوپر تنا ہے آسماں نیلم جڑا
اُبھری سمندر سے ہوا، نکلا ہے تارا شام کا
اور چاند ہے پیلا پڑا
بازار کے اندر مگر فرصت کسے، دیکھے ادھر
ساگر کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد تک آ گیا
جو ہر طرف بازار ہے
بازار ہے، بازار ہے
(۱۹۸۷ء میں، جلاوطنی سے لوٹنے کے بعد، کراچی میں کہی ایک نظم)

ارے احمق! بازار کو تم برا سمجھتی ہو؟ تم مارکیٹ اکانومی اور اس کی قوتوں کو کم گردانتی ہو؟ دراصل تمھیں معیشت کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ بازار جتنا پھیلے، لوگوں کو اتنا زیادہ روزگار ملتا ہے۔ کیا کہا، سادہ زندگی؟ آدمی ایک تو سادہ زندگی چاہتا بھی نہیں، دوسرے سادہ زندگی سے تو معیشت منجمد ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر (بی بی سی اکنامک رپورٹ برائے چین) اگر ایک محلّے کے لوگ ایک انڈا روز کھاتے ہیں تو اصراف کے

لیے تین ہزار پانچ سو پندرہ مرغیاں پال لی جاتی ہیں۔ انھیں فوراً دو انڈے روز کھانے شروع کر دینے چاہییں، جس کے لیے سات ہزار تیس مرغیوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سے ان کو دانہ کھلانے والوں کی آمدنی دگنی ہو جائے گی؛ علاوہ ازیں مرغیوں کی دیکھ بھال کرنے والوں، انڈے جمع کرنے والوں اور مرغی خانے صاف کرنے والوں کی تعداد بھی دگنی ہو جائے گی۔ یعنی روزگار میں اضافہ ہوگا۔

شہر (۱)

اب یہ جہاز لندن ہی جا کر رکے گا، عورت سوچتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بند کرتی ہے اور ہوائی میزبان کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر، تینوں نشستوں کے ہتھے اٹھا کر، ننھا سا تکیہ لگا کر، آرام سے سونے کے لیے لیٹ جاتی ہے۔

بہت ہی دور رہ گیا کراچی۔ اس کے دماغ میں شہر کی تصویر گھومتی ہے۔

شہر جو بحیرۂ عرب کے کنارے لیٹا ہے، نقشے میں دیکھنے پر اس کی شکل ایک مچھلی کی دم کی طرح دکھائی دیتی ہے جبکہ باقی مچھلی پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس منقسم دم کا شمالی حصہ لسبیلہ سے متصل کیرتھر پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ باریک ہوتا ہوا ختم ہوتا ہے جبکہ جنوبی حصہ سندھ کے میدانی علاقے میں گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کراچی میدانی، زرخیز سندھ اور کوہستانی، سنگلاخ بلوچستان کے درمیان دھوپ میں لیٹا ہے؛ جنوب مغرب میں عرب ساگر کی نرم لہروں کی تھپکیوں میں ہلکورے لیتا؛ اپنے بادلوں بھرے ساحلی آسماں کے نیچے؛ نمکین، گیلی ہوا سے سدا ٹھنڈا اور کچھ چپچپا۔ یہاں آپ کا پسینہ آسانی سے نہیں سوکھے گا، اور اگر آپ کے بال لمبے ہیں تو وہ اس کی گیلی ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں گھنگھریالے ہو جائیں گے اور نمکین دھوپ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی جلد کی رنگت سنولا دے گی۔

یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لا لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خاں یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالحکومت کو اس سمندری، گرم مرطوب علاقے سے (اور یہاں آ بسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے چر چر چر بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس بسانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی بدہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

(یہ بات راقم الحروف کو انیس سو باسٹھ یا تریسٹھ میں ایوب خاں کی اُس وقت نوعمر صاحبزادی نے ان

کے پرسکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں بتائی تھی۔ راقمہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر وسیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی ایوب خاں کی صاحبزادی کی دوست تھی۔)

بڑی طاقتوں کی میزوں پر دھرے نقشوں میں یہ عمان کھاڑی کے دہانے پر نیلے پانیوں کے پار اپنے عین سامنے جڑواں شہر مسقط کو تاکتا اور ہاتھ ہلاتا نظر آ سکتا ہے؛ گرم پانیوں کے دہانے پر، جہاں سے تیل کی دولت سے مالا مال شرقِ اوسط کے وسائل تک رسائی سہل اور کم خرچ ہے اور خوشحال، پھلتے پھولتے بازار، زیادہ سے زیادہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کے اہل صارفین کی زیادہ سے زیادہ اور روز افزوں تعداد...

اردو میں کٹ کٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) ۱۹۴۷ء میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوبصورت، صاف ستھری اور مختصر بندرگاہ تھا، گو اس وقت بھی یہ اپنی ماہیت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی بندرگاہ پر اترنے اور پھر کراچی میں آ کر بس جانے والے پارسیوں اور بہائیوں کی کالونیاں آباد تھیں، بوہروں اور خوجوں کے محلے تھے، پرتگالی اثر ونفوذ میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوانیوں کی بستیاں تھیں جن کے بنائے ہوئے چرچ جا بجا ایستادہ ہیں۔ (پاکستان کا سب سے بڑا رومن کیتھولک چرچ کراچی میں ہے۔ اس کے برعکس، برطانوی راج کے زیر اثر عیسائی بننے والے پروٹسٹنٹ، عموماً پنجابی خاکروبوں، کا چرچ گو تعمیر میں شاندار ہے مگر اس کے ممبروں کی تعداد کراچی کے قدیم تر رومن کیتھولکوں سے کم ہے۔ سفید پوش روزگار کمانے والے ان کیتھولکوں کا ایک خفیہ چٹکلا یہ ہے کہ کراچی کے امریکی اور برطانوی سفارت کار تیج تیوہار کے موقعے پر ''بھنگی چرچ'' میں عبادت کرتے ہیں۔)

شہر کی پرانی گلیوں میں کھارادر کے آس پاس جینا ذات کے ناموں کی اکا دکا تختیاں آج بھی کہیں کہیں نظر آ سکتی ہیں (وہی ذات جو محمد علی نامی ایک عظیم سیاست داں کے ساتھ منسلک ہو کر مشرف بہ اسلام کیے جانے پر، یا اُردوائے جانے پر، حائے حطی سے لکھی گئی اور جناح بنی، مگر جسے اس نومسلم، اپنی اصل میں گجراتی، ذات کے دوسرے افراد نے نہ اپنایا، ورنہ آج کتنے جناح گھومتے پھرتے! کیا آپ کو کبھی تعجب نہیں ہوا کہ برصغیر میں جناح ذات کا کوئی دوسرا بندہ بشر کیوں نہیں؟)

انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس شہر کا کثیر قومی اور کثیر تہذیبی

مزاج برقرار ہی رہا تھا جس میں یہاں رہنے والی ہندو آبادی اور اس سے تعداد میں بہت کم مسلم آبادی (جو یوں بھی اندرونِ سندھ کے علاوہ دوسرے ملحقہ علاقوں، کچھ، گجرات یا سوراشٹر سے آئی ہوئی تھی) کہیں جذب تھی۔ اسی لیے یہ شہر صرف سندھ کے دوسرے شہروں ہی سے نہیں بلکہ اس پورے خطے سے قطعی مختلف تھا جسے اب مغربی پاکستان کہا جا رہا تھا، اور اپنی ماہیت اور خمیر میں بحیرۂ عرب کے اس کٹے پھٹے ساحل پر ذرا نیچے اتر کر آباد عروس البلاد بمبئی سے زیادہ مماثل تھا۔

مگر ۱۹۴۷ء کے آس پاس مذہبی فرقے کا شعور بڑھنے کے باعث (جیسا کہ پورے برصغیر میں، کہیں کم، کہیں زیادہ، کہیں جلد اور کہیں بدیر، ارتقا پا رہا تھا) سندھ میں بھی مسلمان اپنی مذہبی حیثیت پر اصرار کرنا شروع کر رہے تھے۔ سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ اس شہر میں بتدریج رہائش اختیار کر رہے تھے۔ پچاس کے قریب برسوں میں ایک میگا پولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے بھی دگنی تعداد میں یہاں آ کر بسے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے؛ جن سے بن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے، یا جھگیوں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔ پچاس کی دہائی تک کراچی میں آپ کو جا بجا جھگیوں جھونپڑیوں سے پٹے میدان نظر آ سکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں، فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں ہجرت کرنے والے گروہوں کی طرح، جو پرانے طور طریق، معاشرے اور عادات کی زنجیریں توڑ چکے ہوتے ہیں، یہ جم غفیر بھی اس سرزمین پر، یہاں کے قدیم بسنے والوں، پرانے طور طریق، عادات اور اقدار میں ہنوز بندھے باسیوں سے کہیں بڑھ کر، بہتر سے بہتر روزگار اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد میں جٹا ہوا تھا۔ یہ لوگ بات بے بات ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے، ایک ایسے ملک کے باسی تھے جو نصف زمین پر اور نصف ان کے اپنے ذہن میں تھا۔

آنے والے برسوں میں اس نئے اپنائے ہوئے وطن کی طبعی حقیقت (مع اپنے باشندوں کے) ان کے تصوراتی وطن سے ٹکرانے والی ہے۔

فی الحال تو وہ مسلم لیگ میں ہیں، اور قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خاں فضا میں مکّا بلند کر رہے ہیں

اورمہاجرین کے جمِ غفیر ''پاکستان زندہ باد'' کے پُرشور نعرے لگا رہے ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں ہجرت کرکے آنے والے ہیولے جیسے انبوہ کے خط و خال نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے، جیسے وقت کی ریگ پر تصویر کے نین نقش ابھرتے ہیں۔ ان میں ایک ریوڑ کے بدلے افراد، گروہوں اور طبقوں کے نقوش قابلِ شناخت بننے لگیں گے۔ یہاں سے اردو کے دو بڑے اخبار جنگ اور انجام نکلیں گے۔ انگریزی کا اخبار ڈان جم جائے گا اور انگریزی مجلہ مِرر نکلے گا۔ ہفتہ وار نمکدان اپنے قہقہہ آور کارٹونوں سمیت خودغرض سیاست دانوں کے پرخچے اڑائے گا۔ یہاں کا پریس مختلف آرا کا ترجمان ہوگا۔ اس شہر کے کسی کوچے میں ابراہیم جلیس پبلک سیفٹی ایکٹ کی مخالفت میں پبلک سیفٹی ریزر لکھیں گے اور حسن ناصر مزدوروں کو منظم کرنے کی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اونچے تعلیمی اداروں میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن مضبوطی سے جڑیں پکڑے گی۔ یہاں مختلف سیاسی رجحانات ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور تصادم کا شور اٹھے گا، جیسا کہ دنیا بھر کی سیاست میں ہوتا ہے۔ دور، شمالی ہندوستان کے ہرے بھرے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے صحنچوں میں، گھروں میں اور گھروں کے باہر، ہر میسر بیج اور پنیری بوئیں گے اور دور دور تک خالی پڑے چٹیل، غیر آباد ریتیلے علاقوں میں کسی آنے والے زمانے کی ہریالی کا انتظام کریں گے۔

یہاں بنیں گے دھڑادھڑ اسکول اور کالج۔ ہجرت کرکے آنے والی اس شہری آبادی کے سامنے آگے بڑھنے کا صرف ایک راستہ ہے — تعلیم۔ حتیٰ کہ گجرات میں جنما ایک مزدور، اے ایم قریشی، کراچی آکر دولت کمانے کے لیے اسکول اور کالج ہی بنائے گا، جبکہ اس کا حیرت انگیز طور پر مماثل ہمزاد، حاجی مستان، بمبئی میں نام اور پیسہ کمانے کے لیے اسمگلنگ کرتا رہے گا — ہجرت کا ایک تحیرخیز مثبت پہلو!

۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے بعد، دراز قد، سرخ و سفید سربراہِ مملکت جنرل ایوب خاں دارالسلطنت کو کراچی سے اپنے گاؤں ریحانہ کے نزدیک لے گئے۔ انھیں کراچی اور کراچی کے باشندے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ کلبلاتی آبادی کے روز افزوں شور شرابوں اور مطالبوں سے اکتا کر انھوں نے کہا تھا کہ اگر انھیں حکومت پسند نہیں تو جہاں چاہیں چلے جائیں، آگے تو سمندر ہے۔ (ان کے منھ سے نکلا یہ جملہ آناً فاناً مشہور ہوگیا تھا، اور آج تک اتنا مشہور ہے کہ وقتاً فوقتاً مہاجروں کے مسئلے سے تنگ آنے والے مذاق میں، طنز میں — اور کبھی سچ مچ — انھیں سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔) کچھ برس

بعد جب ایوب خاں نئی مسلم لیگ بنائیں گے، جو درحقیقت ان کی ذاتی مسلم لیگ ہوگی، تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔

مگر اس دور میں، جبکہ ان کے شہر میں صنعت کاری کا سلسلہ عروج پر ہے، ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے، اور ان کے ساتھ گنجان آباد پنجاب سے روزگار کاروبار کے لیے نت نئے مواقع ڈھونڈتے لوگ ایک موٹی دھارا کی مانند انسانوں کے اس سمندر میں گر رہے ہیں۔

شہر، اپنے حجم میں اضافہ کرتا ہوا، کسی نامیاتی اکائی کی طرح اپنے ہی ریشوں کی افزائشی قوت سے نئے عضلات پیدا کرتا، ان کی نشوونما کرتا، اپنے ہی زور میں کسمساتا، پیچھے ہی پیچھے سرکتا جاتا شہر — جیسے سمندر میں نصف دھڑ غرق کیے نمکین پانی پیتی مچھلی دھیرے دھیرے سرک کر باہر نکل رہی ہو جس کی پشت پر لوگ سندباد جہازی کی مانند کسی دور چلے جانے والے جہاز سے اتر پڑے ہوں۔

مسئلے کے پیٹ میں

اندرونِ سندھ سے سندھی کراچی میں پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آئے — کلرکوں اور نائب قاصدوں کے کئی گروہ جو سستی آبادیوں میں کم کرائے پر ملنے والے فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے گول سروں اور گھنگھریالے بالوں والے چہرے اشتیاق سے چمکتے تھے۔ وہ جوش وخروش سے ''ہمارا کراچی'' کہنے لگے تھے۔ ماضی میں حکمرانوں اور حکمراں طبقوں نے سابق مشرقی پاکستان کی عددی برتری ختم کرنے کے لیے ملک میں ''ون یونٹ'' نامی جو نظام نافذ کیا تھا، جس نے تمام خطوں کی صوبائی حیثیت ختم کردی تھی، اسے توڑنے کی طویل تحریک کے دوران سندھی قومیت کا شعور پروان چڑھ چکا تھا۔ اس جدید سندھی تصور میں جو سندھ تھا اس میں کراچی بھی شامل تھا۔ یہ ایک ٹھوس جغرافیائی حقیقت بھی تھی؛ سندھ کے باقی زرخیز میدانی علاقے سے منسلک، یہ جغرافیائی لحاظ سے سندھ ہی کا حصہ تھا۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے اسے سندھ کا دارالحکومت بنانے کے لیے سندھیوں نے منظم اور کامیاب تحریک چلائی تھی، مگر پاکستان بننے کے بعد سندھی آبادی کراچی میں گزر نہ کر پائی تھی۔ ون یونٹ کے نظام میں سرکاری ملازمتوں پر پاکستان بھر کے ملازم بھیجے جاتے رہے تھے۔

۱۹۷۲ء میں، جب ایک نیا دور شروع ہوا تھا تو سندھیوں کے داخلے کا بھی آغاز ہو رہا تھا، مگر یہاں آ کر وہ خود کو غیر سندھیوں کے سمندر میں پا رہے تھے۔ (ان کا سندھ کا تصور کراچی کی طبعی حقیقت سے ٹکرا رہا تھا، وقت کے ہاتھ نے جس کو ماضی سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔) اسی لیے ان کو گہرا نہیں، مگر ایک اُتھلا سا یقین تھا کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے، کہ کراچی پر ان کا بھی حق ہے، اور اسی طرح کے چند ایک اور یقین...

اتفاق سے راقم الحروف کا انھی دنوں اس طبقے میں کافی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں سے ایک ضلع کنڈیارو سے آیا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول میں سندھی ٹیچر کی ملازمت ملی تھی، لیکن اس نے اپنے تئیں ہمیشہ ایک ادیب ہی تصور کیا تھا۔ وہ ہر وقت بغل میں پروگریسو پبلشرز کے ہاں نہایت سستی ملنے والی ٹالسٹائی، دستوئیفسکی یا گورکی کی کوئی کتاب دبائے گھومتا تھا اور، گو کہ وہ سندھی قوم پرست تھا جیسا کہ اس کی نسل کے فیشن کا تقاضا تھا، درحقیقت وہ خود کو روسی محسوس کرتا تھا اور روس جا کر رہنا چاہتا تھا۔ اپنے جیسے دوسرے کئی چھڑوں کے ساتھ وہ لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سندھی کلرکوں سے آباد کئی منزلہ گمنام سی عمارت میں رہتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا تھا، ''بھئی، آپ لوگ گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ باقاعدہ گھر بسا کر کیوں نہیں رہتے؟''

اس پر انھوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں)، پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا تھا:

''اَدی، اِدھر کا بھروسا ہی کیا۔ ابھی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے وَری گوٹھ جا رہے ہوں گے۔''

(اور ہوا بھی یہی۔ بھٹو حکومت کے خلاف ۱۹۷۷ء کی پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ دو تین راتوں تک انھوں نے شہر کے خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تھاپ سنی، پھر کان لپیٹ کر وَری گوٹھ چلے گئے۔)

یا پھر کراچی میں وڈیرے آئے تھے، ایک گورنر یا وزیر اعلیٰ اور چند وزرا؛ ڈبل گھوڑا بوسکی کی لسلساتی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس، گلوں میں سونے کی زنجیریں ڈالے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے، وہ اپنے باورچیوں اور نوکروں اور مصاحبوں کی پلٹنوں سمیت کراچی میں وارد ہوئے تھے اور قیمتی کاروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ اشتیاق سے مہاجر عورتوں سے شادیاں کرتے اور معاشقے لڑاتے، اونچی

آوازوں میں شہوت بھرے قہقہے لگاتے، گفتگو کرتے ہوئے اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر تاؤ دیتے اور اپنا بدن سہلاتے رہتے۔ ان کے مصاحب اور نوکر بھی اپنے شاہ سائیں کی شاہی کے نشے میں مست تھے۔

پی این اے کی تحریک کے دوران جس کا رخ حیرت خیز طور پر آغاز ہی سے سندھی مخالف بن گیا تھا، میں نے چند مہاجر نوجوانوں سے سندھیوں کی مخالفت کا سبب پوچھا تھا۔ مختلف نجی اداروں، اخباروں اور چھوٹی موٹی دکانوں میں کام کرنے والے، موٹر سائیکلوں پر پورے خاندان کو بٹھا کر سفر کرنے والے ان محنتی، ہوشیار، متوسط طبقے کے نوجوانوں نے سندھیوں کا وہی حلیہ بتایا تھا جو اوپر وڈیروں کا تحریر ہے۔

مہاجر متوسط طبقے کو وہ صرف 'سندھی' نظر آتے تھے، 'سندھی وڈیرے' نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نوجوان کراچی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے؛ انھیں بالکل علم نہ تھا کہ ان کے اپنے آبائی وطن کے جاگیردار اور نوابین بھی بالکل اسی حلیے اور انھیں عادات کے تھے اور ان میں اسی قدر رعونت بھری تھی۔

ان نوجوانوں نے سندھی کلرکوں اور ہیڈ کلرکوں اور خود کو روسی ادیب سمجھنے والے پرائمری اسکول کے ٹیچر کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، جو اگر چند برس یہاں رہ پاتے تو پیسے جمع کر کے اور دفتر یا بینک سے قرضہ لے کر موٹر سائیکل خرید سکتے تھے اور گوٹھ سے بچوں کو بلا کر، پورے خاندان کو ایک موٹر سائیکل پر متوازن کر کے، انھیں شام کو کلفٹن پر ساحل سمندر کی سیر کرا سکتے تھے۔ وہ اتنے تتر بتر اور دبے دبے تھے —— شہر کی بیگانگی اور خود اپنے نو وارد وڈیروں کی رعونت سے اس قدر دبکے ہوئے —— کہ ان کا نظر آنا ممکن نہیں تھا، بالکل اسی طرح جیسے شہوت بھرے اونچے اونچے قہقہے لگاتے وڈیروں کا دور ہی سے دکھائی دے جانا لازمی تھا جو مملکت کے اس شہر کے اوّلین بڑے اور مستحکم متوسط طبقے میں پیوند نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر پہلے منتخب وزیر اعظم اپنے جلوے میں لسلساتے، رعونت بھرے وڈیروں کی کھیپ کراچی نہ لے آتے تو پہلی منتخب حکومت کے دور میں ہمارے، بظاہر سندھی قوم پرست مگر باطنی طور پر روسی ادیب، سندھی پرائمری ٹیچر کی موٹر سائیکل اور اس کے خاندان کی ساحل سمندر پر سیر کے امکانات موجود تھے۔ پھر شاید وہ روس جا کر بسنے کا ارادہ بھی ترک کر دیتا۔

مگر ہوگا نہیں ایسا

آنے والے برسوں میں ایم کیو ایم بنی —— مہاجر قومی موومنٹ —— اور تمام مہاجر، جیسا کہ انگریزی اصطلاح

ہے، فردِ واحد کی طرح اس میں شامل ہو گئے، اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ کہ ایسا کسی نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔

لوگ کہتے، ''ارے خالہ، ارے چچی جان، ارے دولھا بھائی، ایسا جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا!''

مارٹن کوارٹرز میں اور حیدری میں اور محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپلپاتے، جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے، ''بھئی واہ، کیا بات ہے! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیامِ پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ارے اپنے آگرہ میں، کانپور میں، بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔''

''دیکھیے کہ مسلم لیگ نے اپنے مردہ بطن سے بچہ جنا ہے!'' چھکن بھائی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ چھکن بھائی امریکہ سے چند ہفتوں کے لیے آئے ہوئے ہیں اور حیدری میں اپنی بڑی بہن کے گھر ٹھہرے اس وقت رات کے کھانے کے بعد ہوا خوری کر رہے ہیں۔ پیٹ پر ہاتھ کیوں پھیرتے ہیں؟ بھئی یوں ہی، طمانیت کے اظہار کے لیے!

''دیکھو بھئی، معاملہ تب بھی مائنارٹی کا تھا اور اب بھی وہی مسئلہ در پیش ہے۔'' چھکن بھائی اپنے بھانجے اور بھانجی کو سمجھا رہے ہیں۔ ''مائنارٹی پراوِنسز کے مسلمان پریشان تھے کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؛ سو وہ یک جان ہو کر پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئے۔ پاکستان بن گیا۔ اب یہاں آ کر وہ دوبارہ مائنارٹی ہو گئے۔ اس طرح تحریکِ پاکستان چلانے والوں، اس ریل گاڑی کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد نے ایم کیو ایم بنائی۔ یہ لوگ اسی جوش و خروش سے اب ایم کیو ایم کے حامی بن چکے ہیں۔ دراصل یہ مسلم لیگ کا دوسرا جنم ہے۔''

''اور نظریۂ پاکستان؟''

''تو پیارے بیٹے، نورِ نظر، لختِ جگر! گروہی مفادات نظریے کی چھتر چھایا خود بناتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کایا کلپ دیکھیے، اور اس پر غور کیجیے، کہ روٹی کپڑے اور آسائشوں کی ضرورت اجتماعی بننے کے عمل میں کسی قلبِ ماہیت سے گزر کر اپنی مادی نجاست سے پاک ہو کر مقدس، بلکہ الوہی بن جاتی ہے۔ آدمی اپنے روٹی

کپڑے کے حصول کی لڑائی کو بہ آسانی اللہ کے نام اور حکم پر جہاد سمجھنے لگتا ہے۔''

چھکن بھائی امریکہ میں رہتے ہیں اور ''مفادات'' کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔

''تو فرض کیجیے کہ مہاجر اپنی نعرے بازی کے برعکس، اسلام اور پاکستان کے الوہی تصور کی خاطر نہیں آئے تھے، روٹی پانی کے لیے آئے تھے، تب کیا فرق پڑتا ہے؟ اکنامک مائیگریشن تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ اب دنیا بھر میں حقیقت پسند سماجی ماہرین اسے ایک وے لڈ (valid)، ایک معقول وجہ ہجرت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اماں تم نے کیوبا سے امریکہ آنے والے مہاجرین کا نہیں سنا؟''

چھکن بھائی پہلے حیدر آباد کے کسی کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ اسکالرشپ پر امریکہ گئے اور ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے۔ چند مہینوں میں انتظامیہ نے ان کا تبادلہ اندرونِ سندھ کسی انٹرمیڈیٹ کالج میں کر دیا۔ چھکن بھائی چپ چاپ امریکہ ہجرت کر گئے۔ اب وہاں کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ اس وقت وہ بجلی کی روشنیوں میں جگمگاتی، حیدری کی پان کی دکان سے پان خرید کر کلّے میں دبا رہے ہیں۔ بس یہی نہیں ملتا انھیں مِنے سوٹا میں؛ کھانے کے تمام مسالے اور درجنوں کے حساب سے لکھنوی کڑھائی کے کرتے اور سفید برّاق علی گڑھ کٹ پاجامے تو وہ ہر سال منگوا لیتے ہیں۔

''کیوبن مہاجرین...'' چھکن بھائی کہتے ہیں۔ ''تو اب تو دنیا اتنی بدل گئی ہے کہ قبلہ کاسترو سوشلزم کے ان بھگوڑوں کی فوری گرفتاری اور واپسی کے بجائے بڑے غصے سے امریکہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں وہیں رہنے دیا جائے۔ ارے بھئی، کھائیں گے کمائیں گے، اور کیا! بقول کسے کہ لینا ایک نہ دینا دو۔''

''تو باقی کے ملک سے بھی تو لاکھوں لوگ چلے آ رہے ہیں کراچی میں...'' چھکن بھائی کے بھانجے نے بیزاری سے کہا۔ چھکن بھائی ہاتھ ہلاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں۔

''دیکھو بھئی، ۱۹۹۲ء میں ہماری یونیورسٹی کے ڈیموگرافی سنٹر کی ایک رپورٹ چھپی تھی — آپ لوگوں کو بھی پڑھنی چاہیے؛ فوٹو کاپی بھجوا دوں گا — تو عالمی ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں روزگار کی تلاش میں آبادیاں بڑی لہروں کی صورت میں جنوب سے شمال کی طرف اور گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی کریں گی۔ اس کو تو کسی صورت روکا ہی نہیں جا سکتا،'' چھکن بھائی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں، گویا کوئی کلاس لے رہے ہوں۔

چھکن بھائی کے بھانجے نے دوبارہ بیزاری سے کہا، ''اور سندھی کہہ رہے ہیں کہ اتنے مہاجر! آ گئے،

چھا گئے کھا گئے سب کچھ!''

''بے شک، بے شک!'' چھکن بھائی عقلمندی سے سر ہلاتے ہیں۔''اتنی بڑی تعداد میں، ایک ہی جھٹکے میں اتنی بڑی ڈیموگرافک تبدیلی پر مقامی لوگوں میں غم وغصہ تو پیدا ہونا ہی تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ بھئی کوئی معمولی بات تو نہیں ہوئی تھی؛ ہندوستان کی تقسیم! اتنا بڑا خون خرابہ! آبادی کا اتنے بڑے پیمانے پر تبادلہ جس کی مثال دنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میں تو کہتا ہوں...'' انھوں نے بھانجے کے ہاتھ سے الائچی قبول کرتے ہوئے کہا،''کہ سینتالیس میں ٹیلی وژن نہیں تھا، اور خبروں کی ترسیل کے لحاظ سے دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی، ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ؟ ارے بھئی، مثلاً اگر بوسنیا پہلے ہوگیا ہوتا، تو دنیا کے بڑے عبرت پکڑ کر اور سبق سیکھ کر ہندوستان کی تقسیم کبھی نہ ہونے دیتے۔ یعنی کوئی بات ہے! ایسی اکھاڑ پچھاڑ جس نے سماجیات کی تو، کیا کہتے ہیں، ایسی تیسی کردی۔ اور مائنارٹی پراونسز کا مسئلہ جسے کہتے ہیں، وہ حل ہی نہیں ہوا۔ یعنی وہ وہیں ہیں جہاں تھے، بلکہ اور بھی پیچھے چلے گئے۔

''اب یہ ہے کہ کوا یگزسٹنس، یعنی ساتھ ساتھ، مل جل کر رہنا، نہایت اہم ماحولیاتی ضرورت ہے، بلکہ سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ کے لیے لازمی۔ علاوہ ازیں، دنیا بھر کے چھوٹے سے چھوٹے کلچر کی وائلڈ لائف کی طرح پریز رویشن کی جارہی ہے، یعنی ملٹی کلچرازم۔''

''جیسا کہ گانا ہے، مل جل کے رہو اور پیار کرو، ہے چیز یہی جو رہتی ہے!'' شکیلہ نے کہا۔ چھکن بھائی کی یہ نوعمر بھانجی وی سی آر پر خوب انڈین فلمیں دیکھتی تھی اور اس وقت حیدری کی ایک دکان پر جگر مگر کرتی چوڑیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

''تو چھکن ماموں، آپ تو یہاں رہتے نہیں۔ آپ کے خیال میں ہونا کیا چاہیے؟''

چھکن بھائی مشورہ مانگے جانے پر خوش ہوئے۔ ان سے پوچھا جاتا تو وہ حیدرآباد سندھ میں اپنے کالج کی انتظامیہ کو کالج میں ایک بڑا نفسیاتی علوم کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیتے۔ شہری نفسیات، دیہی نفسیات، کاروباری اور زرعی نفسیات... الغرض پندرہ سیمینار کرواتے سال میں۔ پھر وہ امریکہ نہ جاتے اور ان کا ہزاروں ڈالر ماہانہ کا نقصان ہوتا۔ خیر، پھر بھی انھوں نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔

''بھئی ہونا یہ چاہیے کہ سندھیوں کو یہ خناس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ مہاجر تا عمر اور نسل در نسل یہاں مہمان یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں گے۔ سندھ اب عملاً دو زبانی صوبہ ہے۔ سو اس بات کو مان کر چلا جائے، دشمنی کا ماحول ختم کر کے کوشش کی جائے کہ سندھ کی ترقی میں مہاجروں کو شامل کیا جائے۔ اور مہاجروں کو بھی یہ خناس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ کراچی کوئی ان کی ایسی جاگیر ہے جس میں دو سندھی داخل ہوں تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیں۔ کراچی کو سندھیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ بنانے کی خواہش کو الوداع کہنا چاہیے۔''

چھکن بھائی کا بھانجا غور سے ان کی عالمانہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا:

''مگر ہوگا نہیں ایسا!''

''پھر کیا ہوگا؟'' چھکن بھائی نے منہ اٹھا کر سوال کیا۔

''میرے خیال میں...'' ان کے صرف ایم بی اے پاس پاکستانی تجربہ کار بھانجے نے کہا، ''کہ پہلے ایک پر مار پڑی، اور دوسری کو حکومت دے دی گئی... برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے۔ پھر پہلی کی باری آئی، اور دوسری پر مار پڑی، خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی... برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کر رہی ہے؟'' اس نے چھکن بھائی سے پوچھا۔

''کیا کر رہی ہے! واویلا مچا رہی ہے، اور کیا؟''

''وہ تو ہے، مگر...'' بھانجے نے سوچتے ہوئے کہا، ''ساتھ ہی انتظار بھی کر رہی ہے۔ انتظار، کہ اب میری باری دوبارہ کب آئے گی۔''

چھکن بھائی نے کہا، ''اس پر مجھے اس بلی کی کہانی یاد آ رہی ہے جو دو چوہوں میں پنیر تقسیم کر رہی تھی۔''

شہر (۲)

پیچھے رہ گیا کراچی... دس ہزار فیٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے آپ سوچتے ہیں، پیارا کراچی... اچھا کراچی... آپ دل ہی دل میں شہر کے طمانچے کھائے گال سہلاتے ہیں۔ شہر محنت کشاں، جو اپنے مزاج میں اتنا بے نیاز ہے کہ سخت ترین مارشل لا میں بھی کسی فوجی راج کے محکوم ملک کا شہر نہیں معلوم ہوتا؛ جہاں افسرانِ بالا آتے ہوئے اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ کم از کم اس شہر میں ان کے گریڈوں سے، افسر شاہی کی

سیڑھی پر ان کے خاص الخاص مقام سے کوئی مرعوب نہیں ہوگا؛ جہاں لوگوں نے اپنی دنیائیں آپ بنائی اور آباد کی ہیں۔ اور آپ یاد کرتے ہیں سینے میں فخر کا ابال جب آپ کبھی رات کے دو بجے (اپنے سبزے، گیدڑوں اور بیوروکریٹوں میں غرق، خوابیدہ دارالسلطنت سے) وہاں پہنچے ہوں اور اسے بیدار اور روشن پایا ہو۔

جب فائرنگ سے شہر میں کثیر التعداد قتل ہونا شروع ہوئے تو دو ایک روز ہی میں شہر میں ایک غیر مرئی خطِ فاصل کھنچ گیا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا— غریب اور امیر حصوں میں۔ یہ غریب حصے تھے جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، سڑکوں پر چکراتی لاشیں گر رہی تھیں، گلیوں سے جنازے اٹھ رہے تھے۔

یہ خوشحال علاقے تھے — ڈیفنس سوسائٹی، کلفٹن — جہاں رونق میں کمی نہیں آئی تھی؛ سی ویو پر ریستورانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، موٹر گاڑیوں کو پارک کرنے کی جگہ نہ تھی؛ جہاں کلاشنکوفوں کا دھواں نہیں، چرغوں اور تکوں اور تلے ہوئے جھینگوں کی بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

جس رات ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک گھر میں اکٹھے سات قتل ہوئے (پولیس چوکی سے چند گز کے فاصلے پر، جبکہ پاس طارق روڈ کا بازار رمضان کی ان آخری راتوں میں پوری طرح بیدار تھا) لالہ رخ صبح یہ خبر سن کر دوڑتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ اس کی پڑوسن، صائمہ باجی، اس وقت گھر میں اکیلی تھیں؛ ان کے شوہر دو دن کے لیے دفتر کے کسی کام سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ لالی کے کان میں باتوں کے جو ٹوٹے ٹکڑے پڑے ان سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی واردات کے بارے میں بات کر رہی ہیں جو ان کے گھر سے صرف تین گلی پیچھے ہوئی تھی۔

فون رکھ کر صائمہ پلٹیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں عورتیں دہشت سے ٹھٹک گئیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی، اس بار ذرا زور سے۔

''کون... کون ہے؟'' گھر والی نے بلند آواز سے پوچھا۔

''میں ہوں جی پلمبر،'' ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ محلے کا نلکے ٹھیک کرنے والا آیا تھا۔ صائمہ باجی کے باورچی خانے کا نل کئی دن سے رِس رہا تھا۔ کل ہی تو انھوں نے لڑکا بھیج کر کہلوایا تھا کہ وہ کسی وقت آ کر دیکھ لے۔ اور اب لالہ رخ کے ساتھ کھڑی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس سوچ میں گم کہ دروازہ

کھولیں یا نہ کھولیں۔ آخر انھوں نے پلمبر کو بلا لیا۔ وہ اسے نل دکھانے باورچی خانے میں لے گئیں۔

لالہ رخ گول کمرے کے وسط میں گم سم کھڑی رہی۔ جب صائمہ باورچی خانے سے نکلیں تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے لالہ رخ کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا، ''باجی... آج آپ نے سُنا نا... ہماری گلی کے پیچھے... کل رات یہ سب ہوا۔ یا اللہ! پورا روڈ چل رہا تھا۔ یہ کس وقت ہوا ہوگا؟ کسی کو خبر کیوں نہیں ہوئی؟''

صائمہ ساری کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی گول کمرے میں داخل ہوئیں۔

''کہتے ہیں گیارہ بجے وہ لوگ آئے تھے۔''

''تو یہ... یہ... کیا قصہ تھا؟'' لالہ رخ نے انتہائی منتشر دماغ سے سوال کیا۔ ''شیعہ سنی؟ یا... یا کچھ اور؟''

صائمہ باجی کا زرد پڑا ہوا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

''کہاں ہو رہی ہے شیعہ سنی کی لڑائی؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کون لوگ یہ قتل کر رہے ہیں۔ جیسے جانتی نہیں...''

لالہ رخ بھونچکا رہ گئی۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گڑبڑاہٹ میں وہ ''میرا مطلب تھا باجی...'' بدبداتی، خاموشی سے صائمہ بیگم کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گئی۔ گھر آ کر وہ گم سم اپنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نند نے اسے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا:

''کیا بات ہے بھابی؟ کہاں گئی تھیں؟''

''ہیں؟'' اس نے چونک کر کہا۔ ''یہیں، پڑوس میں، صائمہ باجی کے یہاں۔''

''تو کیا بات ہوگئی؟'' نند نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' لالہ رخ بالکل گم سم تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے اپنے چاروں طرف سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا جس میں وہ کسی چڑیا کی آواز، دور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اور پنکھے کی گھرر گھرر اچانک سن سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر اس نے تاثر سے خالی آواز میں کہا:

''صائمہ باجی... صائمہ سمجھتی ہیں کہ یہ قتل... شاید میں نے کرائے ہیں۔''

پلمبر کے جانے کے بعد صائمہ نے دروازہ بند کیا۔ صبح سے ان کے گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا جو اچانک شدت

پکڑ گیا تھا۔ کچھ لنگڑاتی ہوئی وہ اپنے سونے کے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے چار اطراف نظر ڈالی؛ خالی دیواریں، ہوا کے جھونکے سے سرسراتا پردہ، فرش پر بچھا پرانے قالین کا ٹکڑا۔ گھر خالی تھا۔ پچھلے گلیارے سے کوئی ٹین کھڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ صائمہ بیگم دونوں ہاتھوں میں منھ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بہت دیر اکیلے گھر میں بیٹھی روتی رہیں۔ پھر انھوں نے اپنی بہن کو فون کیا:

''مجھ سے تنہا رہا نہیں جاتا۔ مجھے آ کر لے جاؤ۔''

پھر بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دراصل قاتلوں کو ایک شیعہ کی تلاش تھی جو کہ مارا گیا۔ (مرنے والوں میں ایک شیعہ بھی تھا۔) دوسرا خیال یہ تھا کہ قتل کا مقصد شہر میں دہشت پھیلانا تھا۔ تیسرا خیال یہ تھا کہ یہ دراصل ڈاکے کی واردات تھی۔

پھر ایک دھند ہر طرف چھا گئی۔

جوں جوں تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا تھا وہ نابینا ہوتے جا رہے تھے — ایک اصطبل میں بند — ان کے درمیان ایک ہاتھی تھا اور وہ اس کے اس عضو پر جو ان کے سامنے تھا ہاتھ پھیر پھیر کر ہاتھی کی شکل کی وضاحت کر رہے تھے، اور انھیں اس کی پروا نہ تھی کہ اس کے پیروں تلے وہ سب کچلے جا رہے ہیں، کیونکہ ان کی آنکھوں پر اپنے اپنے موقف کی پٹی بندھی تھی۔

بات صرف اتنی نہ تھی کہ وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے... شہر کے ساتھ کی جانے والی ایک زبردستی، ایک بلاتکار کے دوران وہ حقیقت جاننے کی خواہش سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقوعے کو اپنی مرضی کا مطلب پہنا رہے تھے اور سرِمو جاننا نہیں چاہتے تھے کہ کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے۔

شہر اَن گنت لکیروں میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اجتماعی ناگہانی میں خوف سے لرزتے ہوئے... کسی سے جڑ جانے کی اضطرابی سعی میں ان کے اندر قدیم ترین گلّے کی جبلت جاگ اٹھی تھی، جو فی الحال زبان کی بنیاد پر انھیں دوسروں سے جوڑ سکتی تھی۔

سندھی سندھی سے، اردو بولنے والا اردو بولنے والے سے، پٹھان پٹھان سے اور پنجابی پنجابی سے جڑا ہوا...

نفرت اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا شہر...
ریاستی مشینری سچ بتانے سے قاصر یا گریزاں؛ اپنی ہی کسی توڑ مروڑ مہم میں غلطاں...
جب مساجد کے اندر خوں ریزی شروع ہوئی تو سرکاری اداروں نے کہا: ''مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں؛ بھارتی ایجنٹ!''

کراچی کے گلی کوچوں میں لوگوں نے کہنا شروع کیا: ''مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں۔ وہ سندھی پولیس جو اندرونِ سندھ سے کراچی لائی گئی ہے، سب ہندو ہے؛ کیونکہ تمام سندھی ہندو ہیں، یہ بظاہر مسلمان بن گئے ہیں، راجہ داہر کی اولاد!'' ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک ٹھیک طرح سے قابل نفرت نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ سندھی بھی نہ ہو۔

اس طرح پاکستان بنانے سے پاکستان میں بسنے تک کا ایک دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا، یوں تھی: ''مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔'' دوسرے لفظوں میں: ''قتل کرنا بری بات نہیں؛ مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔''

لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

اور سندھی! مبادا آپ انھیں فرشتہ سمجھیں۔

کراچی سے متعدد سندھی اخبار نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر ان کا لہجہ اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت ہی کا ہوتا ہے۔ صوبائی خودمختاری کے لیے تحریک چلانے کے باعث سرکاری ادراک کے مطابق برسوں تک غیر محبِ وطن اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کہلائے جانے والے سندھی... ان کا پڑھا لکھا طبقہ، ان کے دانشور... اقتدار اور سرکاری قبولیت کی پہلی جھلک ملتے ہی ایک قلبِ ماہیت سے گزرتے ہیں اور سرکاری زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ مہاجر صوبہ بنانے کا ...ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا، بلکہ ریاست کا، باغی قرار دیتے ہیں، اور انھیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرِعام پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں۔ وہ تمام مہاجروں کو صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اور گو انھوں نے ابھی تک مہاجروں کو ہندوؤں کی

اولاد نہیں کہا ہے (انھیں اس کا موقع نہیں ملا ہے) لیکن طویل مدت سے دیے جانے والے سرکاری بیانات کو — کہ مہاجروں کی نمائندہ جماعت دراصل ہندوستانی خفیہ ادارے ''را'' کی ایجنٹ ہے — وہ بتدریج سنجیدگی سے قرار واقعی قدر و منزلت دینے لگے ہیں۔ سندھی اتنے طویل عرصے تک معتوب رہے ہیں، اپنے خلاف زہر آلود بیانات سنتے رہے ہیں، کہ شاید وہ اپنے اوپر تھوپی گئی اس جہالت اور تاریکی کا جواب جہالت اور تاریکی ہی سے دینا چاہتے ہوں۔ اپنے وطن میں بہتر اقدار کی جیت انھوں نے کبھی دیکھی بھی نہیں ہے۔

کراچی اور جرمن

برٹولٹ بریشٹ جرمن تھے، اور اڈولف ہٹلر بھی۔ نازی پارٹی کے لاکھوں ارکان اور حامی بھی جرمن تھے؛ پاکستانی، حتیٰ کہ ہندوستانی تک نہیں تھے۔

برٹولٹ بریشٹ اگر پاکستانی، اور کراچی میں رہنے والے مہاجر ہوتے، تو اپنی نظم یوں لکھتے:

پہلے، بہت پہلے، سب سے پہلے
وہ پٹھانوں کے لیے آئے
(یہ غدار ہیں، علیحدگی پسند ہیں
پختونستان بنانا چاہتے ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں...)
میں پٹھان نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں اس کورس میں شامل ہوا:
اور میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ بنگالیوں کے لیے آئے
غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں بنگالی نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا:
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

نا منظور... نا منظور... بنگلہ دیش نا منظور...
پھر وہ بلوچوں کے لیے آئے
غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں بلوچ نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا:
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ سندھیوں کے لیے آئے
غدار... علیحدگی پسند... سندھو دیشی... ہندوستانی ایجنٹ...
میں سندھی تو خیر ہرگز نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے زیادہ جوش وخروش سے سر اٹھایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

اب وہ میرے لیے آئے ہیں
غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں نہایت حیران پریشان کھڑا ہوں
اور سن رہا ہوں ایک کورَس
سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں، پنجابیوں کی آوازوں کا
کورَس میں شامل ہونے والی تازہ تازہ، نو آموز، کمزور سی آوازیں
جنھیں ابھی ٹھیک سے غدار، ہندوستانی ایجنٹ کہنا بھی نہیں آیا
مگر پھر بھی وہ لوگ مشق کر رہے ہیں
دھڑکتے دلوں سے، امید بھری امنگ سے
کہ ایک دن ان کی ادائیگی بے نقص ہو جائے گی...

۱۹۹۶ء تک، جبکہ مملکتِ خداداد اپنے استقرار کے انچاس برس پورے کر رہی ہے، ہر قوم کو باری باری غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جا چکا ہے... ماسوا پنجابیوں کے۔

اب رہے پنجابی، تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی نہیں: شاعر فیض احمد فیض، شاعر حبیب جالب، صحافی مظہر علی خاں، سیاست داں میاں افتخار الدین۔ یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غداروں اور ہندوستانی ایجنٹوں سے بڑھ کر ہوگی، مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اب آگے چل کر دو ممکنہ صورت حال ہو سکتی ہیں:

(۱) بقیہ تمام پاکستانی قومیتیں ایک دن پنجابیوں کو کسی سیاسی تحریک کی بنیاد پر یا کوئی دوسری جگاڑ لڑا کر، من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے دیں گی۔

(۲) دوسری قومیتیں اسٹیبلشمنٹ پر اس حد تک قبضہ نہ کر پائیں گی کہ پنجابیوں کو غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے سکیں، لہٰذا اسٹیبلشمنٹ کے پنجابی افراد ہی باری باری دوسروں کو (ہر بار دوسرے دوسروں کی مدد سے) غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دو امکانی صورتوں کے علاوہ یہاں تیسری صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر آپ ایک ناقابلِ شکست رجائیت پرست ہوں تو اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں:

کیا یہاں کوئی تیسری صورتِ حال پیدا نہیں ہو سکتی؟

اب رہا ہندوستان، تو ہندوستان تو بہت ہنس رہا ہوگا، ایمان سے، کہنی میں منھ چھپا چھپا کر، چپکے چپکے ہنستے ہوئے لوٹن کبوتر کی طرح زمین پر لوٹ رہا ہوگا اور ہنسی کے مارے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے کہہ رہا ہوگا:

"لو سالو، ہور چوپو! الگ تو ہم سے ہو گئے ہو تم، میاں بھائی! اب دیکھو کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے — یعنی باری باری ہر قومیت ہماری ایجنٹ! ہاہاہا! قہ قہ قہ!"

سالا بنیا... مکار ہندو! ہم پر ہنستا ہے سالا دال خور...

مگر ہندوستان ۱۹۹۵ء میں ہنس نہیں رہا۔ شاید وہ کچھ خاص غور سے پاکستان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا، بلکہ تندہی سے ماتھے پر سیندور کا گھسا مارے، مذہبی جنونی سیاست کی طرف رواں دواں ہے۔

کیونکہ... کیونکہ وہ پاکستان سے مختلف ہے ہی نہیں۔ بالکل اسی جیسا تو ہے ہندوستان...

لہو کا سراغ

سمندر کے ساحل کلفٹن پر اونٹ کی سواری، پرانے شہر کے وسط میں بچھی چمکتی پٹریوں پر گھنٹی بجا بجا کر چلتی کھلونا سی ٹرام، اور سجی سجائی، دو گھوڑوں والی، کسی رتھ کی شان سے پکی سڑک پر ٹپ ٹپ کرتی جاتی وکٹوریہ گاڑیوں کے علاوہ نعیم کی کراچی کی اولین یادوں میں ایک ہلچل بھری رات بھی تھی۔ اُس رات کوئی نہیں سویا تھا۔

نعیم کراچی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر حیدرآباد سندھ میں رہتا تھا اور ان دنوں کراچی اپنی پھوپھی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے تین تنگ کمروں، ایک دالان اور چھوٹے سے آنگن والے کوارٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس آنگن میں سلمانہ پھوپھی نے رات کی رانی اور چنبیلی کے جھاڑ لگائے تھے۔

پیر الٰہی بخش کالونی — جسے بعد میں سب صرف پی آئی بی کالونی کے نام سے جاننے لگے تھے — مہاجرین کی پہلی کھیپوں کے لیے عجلت میں تعمیر کی جانے والی مختصر اقامتی کالونیوں میں سے ایک تھی۔ دو رویہ کوارٹر؛ بیچ میں سڑک اور دکانیں جہاں بدایوں کے پیڑے اور آگرہ کے سیو اور میرٹھ کی گزک ملتی تھی۔ اور دہی بڑے بھی۔

دہی بڑے، ایسے نہیں جیسے اب ملنے لگے ہیں۔ سلمانہ پھوپھی ۱۹۹۵ء میں کہتی ہیں، ''یہ تو دہی پھلکیاں ہیں، بیسن کی، وہ بھی نگوڑی میٹھی۔ یہ فریسکو والے اللہ جانے کیا بناتے ہیں!'' سلمانہ پھوپھی جانتی ہیں کہ اصلی دہی بڑے کیسے بنتے ہیں۔ ''اُرد کی دال کو رات بھر بھگوتے ہیں۔ دوسری صبح نرم پڑی دال کو سل پر ہلکے ہاتھ سے پیستے ہیں کہ وہ بس دُردُری ہو جائے۔ پھر ملاتے ہیں اس میں توے پر سینک کر ہتھیلی پر مسلا زیرہ، نمک اور موٹی پسی ہوئی کالی مرچ۔ چاہو تو ذرا سی لال مرچ بھی ملا دو۔ پھر بڑے بنا کر اچھی طرح بھاپ دیتے ہیں تا کہ نیم پُخت ہو جائیں۔ شامی کباب کی طرح دہی بڑے بناتے ہیں۔ پھلکیاں نہیں، تمھارے فریسکو جیسی۔ بڑے تو چپٹے ہوتے ہیں، چپٹے اور گول...

''اور تم بڑوں کو تل کر بغیر دہی کے یوں بھی کھلا سکتی ہو،'' وہ اپنی بیٹی نشاط بانو سے کہتی ہیں جو لپ جھپ باریک رو پہلے گوٹے کی چٹکی بنا رہی تھیں۔ ان کی پتلی پتلی انگلیوں میں گوٹے کا فیتہ آن کی آن میں ایک خوبصورت، آرائشی، نفیس - اور گراں قدر تر (value-added) شے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ چٹکی، کلی اور کرن پیر الٰہی بخش کالونی کی دکانوں میں فروخت ہوں گی۔

سلمانہ پھوپھی بیوہ ہیں۔ وہ آگرے سے پی آئی بی کالونی کیونکر پہنچیں، یہ ایک دوسری داستان ہے۔ مگر عبدالقادر بہرانی کے موجودہ تصور کے برعکس — کہ ہندوستان سے پناہ گیر، جو اب اپنے آپ کو مہاجر کہنے پر مُصر ہیں، بس یوں ہی، سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے آ گئے تھے — حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں میں مسلمان بھاری تعداد میں مارے بھی گئے تھے۔ سلمانہ پھوپھی اسی لیے پی آئی بی کالونی میں بیوہ پہنچی تھیں؛ اپنی اور اپنے بچوں کی خیر مناتی، ایک کٹی ہوئی ٹرین سے مہاجر کیمپ تک۔ انھوں نے کراچی پہنچ کر دھاروں روتے ہوئے باقاعدہ زمین کو بوسہ دیا تھا اور کہا تھا: ''پ...ا... ک... س...ت...ا...ن۔''

سن سینتالیس میں، شادی شدہ زندگی کے دس برس گذارنے کے بعد، یہاں پہنچی سلمانہ پھوپھی شادی سے پہلے آگرہ سے ایف اے پاس کر چکی تھیں۔ اب وہ پی آئی بی کے اسکول میں پڑھائیں گی اور اپنے بچوں، نشاط، مسرت اور احسن، کی پرورش کریں گی۔ (اور بڑے ہو کر یہ سب ایم کیو ایم — مہاجر قومی موومنٹ — میں بھرتی ہو جائیں گے۔)

اس ہلچل بھری رات سلمانہ پھوپھی کے گھر میں ان کے مہمان آئے چھوٹے بھائی، نعیم کے باپ، کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔

یہ ۱۹۶۵ء ہے۔ جنرل ایوب خاں اور قائد اعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کڑے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے — مہاجروں کی اس پہلی بڑی لہر نے جو کراچی کی زمین پر چھا گئی ہے — فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خاں کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے مراعات زدہ نظام تک میں بغاوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا ہے۔

ایوب خاں بہرحال جیت گئے ہیں (کرسی نشیں فوجی جنرل ہار نہیں سکتے!) اور اب ان کے صاحبزادے مسمّی گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں؛ ایک جشنِ فتح منانے

جس میں ان چڑ چڑ چڑ تیزی سے بولنے والے، پستہ قد، دبلے پتلے اور سانولے، اور برصغیر کے نہایت گرم خطوں سے نازل ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھلایا جائے گا۔

پی آئی بی کالونی میں رات کو حملے کا اندیشہ تھا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ محلے کے نوجوان گلیوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑے تھے اور ہاتھ میں آ جانے والی کسی بھی چیز (لکڑی کے ٹکڑے، پتھر، چمچے، کفگیر) سے کھمبے بجا بجا کر ایک دوسرے کو بیدار رہنے کا پیغام دے رہے تھے۔

آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس چھ سات برس کا لڑکا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ سلمانہ پھوپھی کے گھر کے سامنے والے کھمبے کے ساتھ سراج کھڑا تھا۔

''او ہو منے، تم اندر جاؤ!'' سراج نے کہا۔

''سراج بھائی، میں بھی کھمبا بجاؤں گا۔''

سراج ان کے اپنے کنبے کا لڑکا تھا۔ دو کوارٹر چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ سلمانہ پھوپھی اور اس خاندان کا ایک دوسرے کے گھر روزمرہ کا آنا جانا تھا۔ سراج نے نعیم کو ایک چھوٹا سا بی پی کا چاکلیٹ دے کر گھر میں واپس بھیج دیا تھا۔

لوٹتے ہوئے نعیم نے کھڑکی میں نشاط کی چھوٹی بہن مسرت کے دھانی دوپٹے کی جھلک دیکھی۔

''تو مسرت آپا کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ کیوں؟'' اس نے سوچا تھا۔ ''شاید وہ بھی کھمبا بجانا چاہتی ہوں۔''

اُس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا تھا۔ مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں پر حملہ ہوتا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے؛ وہ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے اجنبی بتائے جاتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید ہراس پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر شاید نہ ملے، مگر اس ملک کی اصل تاریخ اپنی لافانی نظموں میں رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا، نہ کسی پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔

نہ مدّعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

سلمانہ پھوپھی کا خاندان، نشاط بانو، مسرت بانو اور احسن، عصمت چغتائی کی کسی کہانی (مثلاً ''چوتھی کا جوڑا'') سے سیدھا نکل کر آیا ہوا معلوم ہوسکتا ہے۔ نشاط بانو اسی طرح سر جھکائے پراٹھے سینکتی ہیں۔ مسرت دریچے میں کھڑی، نگاہیں جھکائے، کلائی میں چوڑی گھماتی ہے (جو سراج اسے ہم آغوش کرتے ہوئے چٹخا دے گا)۔ وہ مسرت سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی اور بنیادی خالہ (اس کی اماں) کی نگاہیں نئے ملک میں سماجی حیثیت بنانے کی خاطر اونچے خاندانوں پر لگی ہیں۔ (نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر!) جلد ہی یہ پی آئی بی کالونی سے کہیں اور منتقل ہو جائیں گے۔ (ہاؤسنگ سوسائٹی؟ اس محلے کی تعمیر کے رموز کے لیے دیکھیے: ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، از قرۃ العین حیدر۔) آئندہ برسوں میں سراج سی ایس پی کا امتحان دے کر ڈپٹی کمشنر تعینات ہو جائے گا، اور ایک بلندی کی جانب حرکت کرتی ہوئی (upwardly mobile) تازہ توانا کلاس کا حصہ بن جائے گا۔

مگر چونکہ کراچی کی پی آئی بی کالونی یو پی کا کوئی قدیم، اپنی روایتوں کی چھاؤں میں نیم خوابیدہ شہر نہیں ہے (اور یہ عصمت چغتائی کی کہانی نہیں ہے)، اس لیے نشاط بانو اور مسرت بانو کی شادیاں جلد یا بدیر ہو جائیں گی۔ نشاط کی شادی فرقان سے ہوئی جو کسی چھوٹی موٹی فرم میں کلرک تھے (حالانکہ ان کے پاس ایم اے کی تین ڈگریاں تھیں: اردو، اسلامیات اور تاریخ)۔ مسرت نے بی اے کر کے اسکول میں ملازمت کر لی اور گھر کا خرچ چلانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اور بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ سلمانہ پھوپھی صبح کے وقت مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دوپہر کے بعد جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر میں پڑھانے جاتی تھیں۔ احسن اسکول کے بعد ڈرگ روڈ پر ایئر فورس کے جہازوں میں لوڈر کا کام کرنے لگا۔ لوڈر کا نیلا لباس وہ گھر میں بھی چھپا کر رکھتا تھا کہ کسی دوست کی نظر نہ پڑ جائے۔ اسے رات کی شفٹ میں کام مل گیا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم تھیلے میں چھپا کر لے جاتا اور صبح کو اسی طرح سفید پوش لوٹتا جیسا کہ محلے کے لوگوں نے اسے دن کے وقت دیکھا تھا۔

پی آئی بی کالونی میں سلمانہ پھوپھی کا گھروندے جیسا یہ مکان کسی عبادت گاہ کی طرح مقدس ہے۔

اس کے در و دیوار سے محنتِ شاقہ کی مہک آتی ہے اور اس کے دستر خوان پر ماسوا رزق حلال کے اناج کا ایک ذرہ بھی نہ رکھا گیا ہوگا۔

اس مختصر اور پاس پڑوس میں نہایت محترم خاندان پر چند برس بعد ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک رات ایئرفورس کے ٹارمک پر جہاز سے سامان اتارتے ہوئے کسی ٹرک سے ایک بھاری بکس احسن کی پیٹھ پر آگرا۔ احسن کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔
یہ خبر سن کر کنبے اور محلے والوں کے دل دہل گئے۔ بیوہ کا لال، یتیم اور نیک بچہ — اس کی صحت یابی کے لیے اپنے تو کیا غیروں تک نے جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔
احسن کئی برس چار پائی سے لگا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ دوبارہ جسمانی مشقت کا کام کرنے کے قابل نہیں ہوسکا، مگر اس نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔
مسرت نے سات برس اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ چار پائی سے لگے چھوٹے بھائی کا بوجھ ماں پر چھوڑ کر بیاہ نہیں رچا سکتی تھی۔ (جیسا کہ فلم وچن میں گیتا بالی کرتی ہے؛ حیرت، کہ زندگی بالکل فلم جیسی ہوسکتی ہے!) اس کے بعد ایک شریف خاندان کے برسرِ روزگار لڑکے سے اس کی شادی ہوگئی۔ لڑکے نے کراچی کے ایک انسٹیٹیوٹ سے ہوائی سفر کی ٹکٹنگ کا کورس کیا تھا۔ اسے سعودی ایئرلائنز میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں بعد مسرت بھی اپنے میاں کے ساتھ جدہ چلی گئی اور اب ہر سال کراچی آتی ہے — تین گول مٹول بچوں کی خوش و خرم ماں۔

سلمانہ پھوپھی نے کمال سادگی سے زندگی گذاری۔ اپنے لیے انھوں نے کبھی چاندی کا چھلا بھی نہ بنایا۔ صرف احسن کی شادی پر، احسن کے شدید اصرار پر، بَری کے زیوروں کے ساتھ انھوں نے اپنے لیے ایک سونے کا لاکٹ بنوایا تھا۔ یہی ان کی کل ذاتی جمع پونجی تھی، جو وہ ایک دن بہ خوشی ایم کیو ایم — مہاجر قومی موومنٹ — کو دے دیں گی۔

۱۹۶۵ء میں سراج — جو اس رات پی آئی بی کالونی میں کھڑا بجلی کا کھمبا بجا کر شمال مغربی سرحدی صوبے

سے لائے گئے جشنِ فتح منانے والوں کے حملے سے اس مہاجر بستی کے بچاؤ کے لیے پہرہ دے رہا ہے اور دریچے میں کھڑی مسرت سے معاشقہ لڑا رہا ہے، اور جو مسرت سے شادی نہیں کرے گا اور سی ایس پی افسر بن کر آنے والے برسوں میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہوگا— اس وقت یہ بالکل نہیں جانتا کہ جنرل ایوب کی مخالفت کرنے والوں میں صرف کراچی کے اردو بولنے والے ہی نہیں؛ اس سے بہت دور، اندرونِ سندھ میں، شہدادکوٹ کے پاس ایک گمنام گاؤں میں رہنے والا اللہ ورایو بھی ان میں شامل ہے۔

اللہ ورایو ایک اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ صاحب ڈنو حیدرآباد کے نور محمد ہائی اسکول میں سندھی پڑھاتا تھا۔ وہ عمر بھر حیدرآباد میں رہا اور صرف کبھی کبھی اسکول کی سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا تھا۔ یہ خبریں گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی تھیں کہ حیدرآباد میں صاحب ڈنو نے ایک ہندوستانی سہیلی کر لی ہے، لیکن اس سے صاحب ڈنو کی کوئی اولاد بہرحال نہ تھی۔

اللہ ورایو کی ماں کبھی حیدرآباد نہ گئی؛ کچے مکان میں چھاج پھٹکتی، چکی پیستی، دودھ بلوتی شاہ بی بی سر پر کپڑے کی ایک دھجی کس کر باندھے سر اور نظریں جھکائے زندگی گذارتی رہی اور مٹی کے چولھے پر چاول کی سرخ روٹیاں سینک کر اللہ ورایو کو کھلاتی رہی۔

لیکن ۱۹۶۵ء میں صاحب ڈنو ریٹائر ہوکر گاؤں آ پڑا ہے۔ سرطان اس کی آنتیں کھا رہا ہے۔ وہ چارپائی سے لگا اپنے شیرخوار پوتے سے کھیلتا ہے اور اللہ ورایو کو گالیاں دیتا ہے۔ (سترہ برس کی عمر میں اللہ ورایو کی شادی کر دی گئی تھی۔ آنے والے برسوں میں وہ چار بچے اور پیدا کرے گا۔ اللہ ورایو کو کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔)

صاحب ڈنو جنرل ایوب خاں کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے، ''اڑے پہلی بار تو ان مکڑوں [مہاجروں] کی کسی نے خبر لی ہے۔ اڑے خدا کی مار... یہ تو ایک ٹڈی دل ہے، آیا اور سب کچھ کھا گیا۔''

لیکن باپ کی ڈانٹ سے بے نیاز اللہ ورایو جنرل ایوب کی مخالف فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کے پوسٹر گاؤں بھر میں لگاتا پھر رہا ہے۔ کیوں بھلا؟ ایسی اس کی پارٹی کی مرضی ہے، جی ہاں، آپ کی جانی پہچانی، ہمیشہ معتوب (ہمیشہ زیرزمین) کمیونسٹ پارٹی کی۔

چار کتابیں سندھی، دس بارہ اردو اور ایک دو انگریزی کی پڑھ کر اللہ ورایو انقلابی ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے اجتماعات میں وہ سندھی مصلح اور انقلابی حیدر بخش جتوئی کے زرعی سدھار کے حق میں تقریریں کرتا ہے

اور گوان جلسوں میں وہ اپنی گونج دار سریلی آواز میں سندھ کا مقبول گیت ''سندھی بولی قومی بولی'' گاتا ہے مگر ''قومی سوال'' کو لینن کے اس موضوع پر مضمون، جمہوریت، آمریت، فوجی راج مردہ باد اور سامراج وغیرہ کے تانے بانے میں کہیں گندھا ہوا دیکھتا ہے۔

آنے والے برسوں میں پمفلٹ بانٹنے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہونے اور ''کمیونسٹ'' کا ٹھپّا لگ جانے کے بعد اللہ ورایو کی قسمت پر مہر لگ جائے گی: اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی۔

برس بعد برس، بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھتے رہنے پر، دھیرے دھیرے انقلابی سے صرف ایک بے روزگار شخص میں تبدیل ہونے اور در در کی ٹھوکریں کھاتے رہنے پر اللہ ورایو نے شہداد کوٹ کے ایک کچے مکان میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر حیدر آباد اور کراچی پہنچی تو پارٹی کے لوگ سکتے میں آ گئے۔ (کیوں؟ کیا وہ اس کی بے روزگاری اور بدحالی کی انتہا سے بے خبر تھے؟— مگر وہ خود مستقل مار کھاتے رہتے تھے۔ بس وہ یوں ہی سکتے میں آ گئے، کیونکہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔) پھر انھوں نے کچھ رقم جمع کر کے اللہ ورایو کی بیوہ اور بچوں کو بھجوائی جو ان تک کبھی نہیں پہنچی۔ جواں مرگ سندھی انقلابی کی بیوہ اپنے بچوں سمیت اس کچے مکان سے کہیں جا چکی تھی۔ اس کے سختی سے پردہ دار میکے میں اسے پھر کوئی تلاش نہ کر سکا۔

شہداد کوٹ میں کہیں دفن ہے اللہ ورایو... سوندھی مٹی سے گھڑا پتلا؛ مٹی کی امانت، مٹی کے حوالے۔

اللہ ورایو جو کبھی کراچی نہیں آیا؛ ایک سندھی نوجوان، اپنے لب پر ایک گیت اور آنکھوں میں ایک خواب لیے؛ ایک بے روزگار سندھی جو زندگی کے آدھے راستے میں ختم ہو گیا... تو اس کا ذکر اس داستان میں کیوں کیا جا رہا ہے؟

یہ ذکر تو بس یوں ہی کیا جا رہا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تھا۔ وقت کے اس برسوں پر محیط دورانیے میں جہاں انسانوں کے سمندر میں تموّج آتا ہے، تحریکوں کی لہریں اٹھتی ہیں، اللہ ورایو، زمین کا فرزند، مٹی اور پانی سے نمو اور آس پاس کی فضا سے رنگ و بو حاصل کرتے پودے کی مانند اٹھا اور کسی ڈپٹی کمشنر کے لاپروائی سے جاری کیے حکم نامے کی جھپیٹ میں آ کر، سزا یافتہ اور روزگار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر، مرجھایا اور خاک میں مل گیا۔ اپنی مہک، اپنے گیت اور اپنے خواب سمیت، سپرد خاک!

نہ مدّعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

شاعر اور تاریخ

کراچی میں لالوکھیت اور گولی مار کی جھگیوں میں بسے مہاجرین (جو اس وقت صرف غریب غربا کہلاتے تھے) کے قتلِ عام پر جب فیض صاحب نے یہ نظم لکھی تھی جس میں اس لہو کے بارے میں یہ مصرعے بھی تھے:

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی عَلم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

اُس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایک پرچم — ایم کیو ایم کے پرچم — پر رقم ہوگا۔

شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا۔ وہ تو حال کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے، کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔

مثلاً وہ مجمعے پر پولیس کی فائرنگ پر نظم لکھ دیتا ہے۔

شاعر تاریخ کے متوازی ایک لکیر کھینچتا ہے، متبادل امکانات کی لکیر۔

وقت کے بے شعور، اندھے ریلے میں شاعر اکیلا ہے۔ شاعر تاریخ نہیں؛ وہ اپنے شعور سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ شاید اسی لیے وہ تاریخ کے لیے بے مصرف نہیں ہوسکتا۔

آؤ بھاگ چلیں

جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر کے پاس یوسف کو بس اسٹاپ پر کھڑی، رنگین آنچل لہراتی اور خوشبوئیں لٹاتی سلونی لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھ کر سلمانہ پھوپھی اسے ڈانٹتی ہیں۔

''ارے خوش بخت! کیوں خاندان کے نام میں بٹّا لگا رہا ہے!''

کان دبائے ہنس کر بھاگتے یوسف کے کنبے کو سلمانہ پھوپھی آگرے سے جانتی ہیں۔ کئی بہنوں کا اکیلا، اس لیے لاڈلا، بھائی یوسف بہنوئیوں کی زبان میں ''آوارہ'' ہوگیا ہے۔ یوسف کی اماں ملال سے

کہتیں، ''لنگوڑے کوفلم لائن میں جانے کا شوق چرایا ہے۔'' آگرے کے ایک پٹھان خانوادے کا چلبلا نوجوان جو اتنا خوبرو، پُرکشش، تیز طرار اور منچلا ہے کہ جہانگیر روڈ کی کوئی بھنگن بہشتن اس سے چھوٹی نہیں ہے، اور نہ کوئی لونڈا۔ وہ چوطرفہ معاشقے لڑاتا ہے اور ان کے قصے یار دوستوں کو ہنس ہنس کر سناتا ہے۔

سب سے زیادہ مشکل اسے جہانگیر روڈ کے پاس ایک پرانی بلڈنگ کے بالائی فلیٹ میں رہنے والی میمن حسینہ کلثوم سے عشق میں پیش آئی تھی۔ کیسی گدگدی تھی گوری گوری کلثوم — ناک میں ہیرے کی کیل، بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ کبھی کبھی سیڑھیوں کی تاریکی میں اس کے گدرائے بدن کو خوب سا بھینچنے کا موقع ملتا؛ زیادہ تر تو بچاری خط و کتابت پر گزارہ کرتی جو وہ ڈلیا میں رکھ کر سبزی لینے کے بہانے بالکنی سے نیچے اتارتی تھی۔ نیچے کھڑا، جانے کب سے آلو ٹماٹر اٹھائے انتظار کرتا یوسف جھٹ سے خط اٹھا لیتا اور آلو یا گوبھی یا بینگن اپنے خط سمیت ڈلیا میں رکھ دیتا۔

ایک دفعہ اس کا ایک خط پکڑا گیا۔ بھولے سے یوسف نے کلثوم کا خط اسکول کی کاپی میں رکھ دیا تھا۔ یوسف کے بہنوئی نے میز پر رکھی کاپی اٹھائی تو خط فرش پر جا پڑا۔ انھوں نے خط پڑھا تو گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ جو کچھ اس خط کی ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا تھا اس میں کہیں بھاگ چلنے کا بھی ذکر تھا۔

''ابے مردود! لڑکی بھگا رہا ہے!''

یوسف کے بڑے بہنوئی نے اس رات جوان جہان لڑکے کو الٹا لٹا کر چھڑی سے اس کی خوب مرمت کی۔ یوسف کے کسرتی، دودھ ملائی پر پلے جوان بدن پر چھڑیوں کا کیا اثر ہوتا۔ بعد میں وہ اپنی بہن کے پیٹ میں منھ گھسیڑ گھسیڑ کر ہنستا رہا!

''اے چل ہٹ، بے شرم،'' یوسف کی بہن نے باریک چھالیا کترتے اور اسے پرے دھکیلتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔ ''وہ تو وقت پر پتا چل گیا، ورنہ تو نے تو ہم سب کو تھانے میں بندھوا ہی دیا تھا۔''

ڈھیٹ یوسف پھر ان کے پیٹ میں منھ گھسیڑ کر ہنسا اور ان کے کوسنے سنتا رہا۔ پھر اس نے بتایا:

''آپ کے سر کی قسم آپا، میرا کلثوم کو بھگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بھلا یہ علّت میں کیوں پالوں گا؟ اس بچاری نے تو مجھ سے باغ میں ملنے کے لیے لکھا ہے۔ اسے اردو ٹھیک سے نہیں آتی۔ باغ کو باگ کہتی اور لکھتی ہے۔''

یوسف کی آپا نے پہلے تو دم بخود ہو کر سر پیٹ لیا۔ پھر تھوڑی دیر تک مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش

میں ناکام ہوکر سروتے کی آڑ لیتے ہوئے بہت دیر تک ہنستی رہیں جس کے بعد انھوں نے کہا:

''اے ہے! اردو نہیں آتی اللہ ماری کو!''

زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والی اس چھوٹی سی الجھن کے سوا یوسف کی زندگی میں سیاست کا سرِمو دخل نہ تھا۔

اس کی بہنوں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، مگر یوسف نے پڑھ کر نہ دیا۔ عرصے تک رسیاں تڑانے کی کوشش کرتا یوسف آخر کار لاہور بھاگ گیا تھا۔ وہاں اس کی ہیرو بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو پائی تھی مگر اس نے لاہور کی فلمی دنیا میں گھسنے کا ایک دوسرا راستہ تلاش کر لیا تھا اور ہدایت کار شوکت حسین رضوی کی ٹیم میں شامل ہوگیا تھا۔ لاہور جا کر اس نے اپنا نام یوسف حسین زیدی رکھ لیا تھا۔ ہوشیاری کے کسی پیچیدہ چکر میں اس نے اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کیا تھا؛ یا ہو سکتا ہے کہ اس بات نے بالواسطہ اس خاص گروپ میں شامل ہونے میں اس کی مدد کی بھی ہو کیونکہ شوکت حسین رضوی شیعہ تھے۔

لاہور میں یوسف کی شادی ہوگئی تھی۔ دراصل شادی اسے کرنی پڑی تھی۔ لاہور پہنچ کر اس نے اپنے خاندان کے قدیمی ملازم کا پتا لگایا تھا جو وہاں ریلوے میں ملازمت کر رہا تھا اور ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ یوسف نے اس کے گھر ڈیرا ڈال دیا جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب یوسف کی سرمستیوں نے اس کی بیٹی کا پاؤں بھاری کر دیا تو رانگڑ بچے نے ایک رات قاضی بلا کر یوسف کی کنپٹی پر پستول رکھی اور چھوہارے تقسیم کیے۔ شادی کی خبر جب کراچی پہنچی تو کنبے میں کہرام مچ گیا۔ ''رجب علی خاں کے اکلوتے وارث کی شادی نوکرزادی سے!''

نوکرزادی نے (جو بعد میں شمو چچی کہلائیں) یوسف کا بڑا ساتھ دیا۔ چند برس بعد یوسف رُلتا کھلتا اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ چلا گیا تھا۔ ملک کے اس حصے کی علیحدگی کے بعد یوسف کراچی اس حالت میں پہنچا کہ کسی حادثے میں اس کا چہرہ، جو کبھی نہایت پُرکشش اور وجیہہ تھا، جھلس گیا تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بنگالی نژاد اولادیں تھیں۔ ان میں سے دو کی ماں، ایک دلفریب بنگالن، ان کے ساتھ آئی تھی۔ مگر کچھ مہینے بعد اسے کوئی اور لے اڑا۔

بنگالن کی رخصتی کے بعد شمو چچی نے آنسو بہاتے اور پونچھتے ہوئے سب بچوں کو سمیٹ کر کراچی کی ایک نئی بستی میں گھر بسا لیا۔

اس دوران یوسف کے تمام رشتے دار جہانگیر روڈ کے کوارٹروں سے اٹھ کر ناظم آباد اور ہاؤسنگ سوسائٹی منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بھانجی کے ڈاکٹر شوہر نے ممیا سسر کو اپنے دواخانے میں بٹھا دیا۔ چند مہینوں میں دواؤں کی شُدبُد حاصل کرنے اور انجکشن لگانا سیکھنے کے بعد یوسف نے ایک قبضہ کیے ہوئے اَدھ بنے مکان میں کلینک کھول کر ''ڈاکٹر یوسف علی خاں'' کی تختی آویزاں کر دی اور محلے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار انھیں سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے اقتصادی اور سماجی فوائد کا احساس ہوا تھا۔ مگر یوسف — اب ڈاکٹر یوسف علی خاں — کی ایم کیو ایم میں شمولیت پر کسی نے غور تک نہ کیا تھا، کیونکہ پورا محلہ، پورا ضلع، پورا شہر ایم کیو ایم میں یوں بھی شامل ہو چکا تھا۔

قوم یا قومیت کا تصور بھی یوسف میاں کے ذہن میں کچھ الجھ الجھ سا جاتا۔ سخت زندگی گذارنے کے بعد آیا بڑھاپا انھیں بار بار بیمار بھی ڈال دیتا۔ وہ چڑ چڑاتے؛ پلنگ پر پڑے پڑے ہنکارتے۔

''قوموں میں قوم تو پٹھان تھی [یعنی آگرے کے پٹھان]، ارے یہ مغل... یہ مغل تو نامرد تھے۔ زوجاؤں کے پاس خود تو پھٹکتے بھی نہ تھے۔ ارے ہم جانتے ہیں! ان کی عورتیں تو... ارے موسلوں کے ساتھ جاتی تھیں... بھائی ہاتھیوں کے ساتھ جاتی تھیں... سنتی ہو شمو؟'' وہ چلاتے۔

دور کھڑی چارپائی پر پرانے کپڑے پھیلائے، چھوٹے کپڑوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنانے کی مہم میں غرق شمو چچی بے خیالی میں قینچی چلاتے ہوئے کہتیں، ''اللہ تعالی مسبب الاسباب ہے ... یا مولا مشکل کشا!'' اور کترنے بیونتنے میں مصروف رہتیں۔

جوانی کے اِندر مہاراج یوسف میاں پر تیزی سے جھپٹا مارتا بڑھاپا ان کے قویٰ کو مضمحل کر رہا تھا۔ وہ موسلوں اور ہاتھیوں کا تصور کرتے اور بدبخت مغل عورتوں کی متصورہ جسارتوں پر دانت پیس پیس کر کچکچاتے۔ یوسف میاں شمو چچی کی بے خیالی پر اور بھی جھنجھلاتے۔ ''کچھ سنتی تو ہے نہیں، کم عقل!'' وہ بڑبڑاتے اور سخت روئی کے تکیے پر دائیں بائیں سر پٹکتے۔ پھر لوٹ پوٹ کر آپ ہی آپ ٹھیک بھی ہو جاتے اور اپنا

مطب چلانے لگتے۔

۱۹۸۸ء میں یوسف خواجہ اجمیر نگری کے پٹھان مہاجر فسادات کے دوران چھاتی میں گولی لگنے سے ہلاک ہوگئے۔ انھیں عباسی شہید ہسپتال لایا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے یوسف نے آنکھیں کھول کر پاس کھڑے، کسی بنگالن کی کوکھ سے جنمے، جوان بیٹے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک لطیف، کہر آلود راستے سے گزرتے ہوئے، ہنس کر بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا:

''آؤ بھاگ چلیں!''

اس ہسپتال میں احسن نہیں ہے۔ احسن نے کامرس میں گریجویشن کیا تھا اور اسے ایک بینک میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر بینکوں کے قومیائے جانے کے بعد سفارشی بھرتی پر اپنے اوپر تعینات کیے گئے اَن پڑھ افسر سے بددل ہو کر اس نے خاموشی سے کمپیوٹر کی مرمت کا کورس کیا (کسی بھی قسم کی محنت کو وہ یوں بھی برا نہیں سمجھتا تھا) اور تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر گلشنِ اقبال میں ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر لیا۔ احسن کے ساجھے دار یہاں شام کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی کلاسیں لیتے ہیں۔ احسن اور اس کے تینوں ساتھی ایم کیو ایم کے پکے حامی ہیں اور گو وہ اس کے کسی عہدیدار سے زندگی میں کبھی ملے تک نہیں ہیں مگر وہ ہر بار اسی کو ووٹ دیں گے؛ اس جماعت کو جس نے، ان کے خیال میں، انھیں ایک تشخص، ایک اپنائیت کا احساس دیا ہے، جو انھیں کسی دوسری جماعت سے نہ مل سکا تھا۔

اور نعیم، ہماری داستان کا وہ سات آٹھ سالہ بچہ کہاں گیا جو برسوں پہلے ایک ہلچل بھری رات میں پی آئی بی کالونی کا کھمبا بجانا چاہتا تھا؟

نعیم ہمیشہ حیدر آباد میں نہیں رہا۔ ۱۹۶۹ء میں شہر سے دور جام شورو منتقل کی جانے والی سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون اتارے جانے کے بعد — جبکہ ... اس کے سر پر ''جیے سندھ'' کے نعرے گونج رہے تھے — روتے ہوئے اور سر پٹکتے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور حیدر آباد کے اَن گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا۔

کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے نعیم ٹورانٹو، یا اوٹاوا، یا واشنگٹن چلا گیا، جہاں وہ خوشحال ہے

اور اچھا کھاتا کماتا ہے۔ آپ اس بات پر متعجب نہ ہوں کہ وہ ٹورانٹو یا اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں ایم کیو ایم کا یونٹ صدر ہے۔

برسوں بعد آپ کا وہاں سے گزر ہوگا۔ ایم کیو ایم کے ٹورانٹو، اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں اس جواں سال، ہنس مکھ بزنس ایگزیکٹو اور ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کے گھر کے گول کمرے میں ہالہ کی منقش سندھی پیڑھیاں اور دیوار پر آرائش کے لیے لگائی سندھی اجرک آویزاں دیکھ کر آپ خاموشی سے آنکھیں پھیر لیں گے اور ایک بھی آنسو نہ گرانا چاہیں گے۔ آپ ان آنسوؤں کو واپس اپنے دل میں دھکیل دینا چاہیں گے۔ آپ اس پہیلی کا بھی کوئی حل معلوم نہ کرنا چاہیں گے کہ جبکہ بالائی سطح پر ''میرا کلچر'' اور ''تیرا کلچر'' کی گالم گلوچ اور نفرت بھری بحث جاری ہے، نیچے کہیں پاتال میں، اَن جانے میں، مہاجروں کے وجود کا تہذیبی پہلو سندھ کے رنگ میں رنگ چکا ہے، اور یہ کہ پردیس میں وطن کی تہذیب کے نام پر ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کو صرف ہالہ کی منقش پیڑھی اور سندھی اجرک ہی کا خیال آتا ہے۔

مہاجر قومی موومنٹ

نچلے اور درمیانہ مہاجر طبقوں کے اس جمِ غفیر نے آخر کار اپنی نمائندہ، نسلی نام رکھنے والی، سیاسی تنظیم بنا لی۔ اور ایسے کہ کسی نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ شاہراہوں پر رواں انسانوں کا سمندر، گلی کوچوں سے ابلتا ہوا...

یہ کس قسم کی تحریک تھی؟

یہ اپنے طبقے اور ان حالات کی آئینہ دار ہی ہوسکتی تھی جن میں یہ وجود میں آئی۔ اس کی ناخوشگوار خصوصیات کرسیِ اقتدار کی نگرانی میں پیدا ہوئیں تاکہ وقتِ ضرورت کام میں لائی جاسکیں۔ اختلاف رائے برداشت کرنا اس کی خصوصیت نہ تھی، مگر اس سے ٹوٹے ہوئے گروہ کو پالنا پوسنا، تاکہ وقتِ ضرورت (اب کی بار خود اس کے خلاف) استعمال میں لایا جاسکے، اس کے خوف اور احساسِ عدم تحفظ کو صرف بڑھا ہی سکتا تھا۔

اس کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک تمام تر انتخابی عمل ثابت کرتا ہے کہ یہ مہاجروں کی نمائندہ اور اپنے لیے منتخب کی ہوئی تنظیم ہے، جبکہ علیحدہ کیا ہوا گروہ کوئی قابلِ ذکر عوامی حمایت نہیں رکھتا۔ ایم کیو ایم گذشتہ کئی برسوں سے عتاب میں ہے مگر ایسا کوئی عوامی اشاریہ موجود نہیں جس سے اس جماعت کی

مقبولیت میں کمی نظر آتی ہو۔

ایم کیو ایم اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے اتحاد سے قائم کی ہوئی سابقہ صوبائی حکومت کا دور، جس میں انتقام کی آگ میں جھلستے ہوئے پیپلز پارٹی کے ایک منحرف (دراصل ٹھکرائے ہوئے) ممبر جام صادق علی کو سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا، سندھ میں شدید بدنظمی اور بدامنی ہی کا دور کہا جا سکتا ہے جس سے کراچی بھی مبرّا نہ تھا۔ سندھ تو اس حد تک ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا گیا تھا کہ اس کا زرعی نظام تار تار ہو کر قبائلی بلکہ خانہ بدوش دور کی طرف مراجعت کر رہا تھا۔ ہزار برس سے زراعت کرنے والے معاشرے کے کسانوں نے کھیتی باڑی کرنی چھوڑ دی تھی اور تیزی سے ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ اس قسم کی خبریں عام تھیں کہ مثلاً ایک قبیلے کے گاؤں پر دوسرے قبیلے کے افراد کے ڈاکے کے بعد پہلے قبیلے نے پورے سندھ میں ہر جگہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کراچی میں بھی چوری، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں انتہائی تواتر سے ہو رہی تھیں۔

آخر اسی دور میں دیہی سندھ میں فوجی مداخلت شروع ہوئی اور ابتدائی اکا دکا غلطیوں کے بعد فوج سندھ کے دیہات کی صورتِ حال سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کامیابی نے سندھ کے کسانوں کے دل موہ لیے جنھوں نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار مسلح افواج کو اپنا ہمدرد، دوست، خیر خواہ سمجھا۔

لیکن کراچی میں صورت حال کیوں مختلف رہی؟ آپریشن کلین اَپ شہر میں سکون اور اطمینان کی ایک بھی سانس لانے میں کیوں ناکام رہا؟ کس لیے یہ شہر آنسوؤں کا، ہر روز اٹھتے جنازوں کا، شک و شبے کا، نفرتوں کا شہر بنا رہا؟

شہر کی ایک بڑی سیاسی تنظیم معتوب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اذیت گاہیں ٹیلی وژن پر دکھائی گئیں۔ انھیں ختم کر دیا گیا۔

شہر کے لوگوں نے خوشیاں نہیں منائیں؛ منھ لٹکائے پھرتے رہے۔

ہزاروں نفوس پر مشتمل ایک پوری تنظیم زیرِ زمین چلی گئی۔ شہر کی نچلے اور درمیانے طبقے کی آبادیوں نے انھیں اپنے اندر سمو لیا۔

ہزاروں گرفتاریاں ہوئیں۔ شہر میں ہولناک خبریں گشت کرنے لگیں۔ پوچھ گچھ میں لڑکوں کے ہاتھ

پیر توڑ دیے گئے ہیں؛ ان کی ٹانگیں چیر کر انھیں نامرد کر دیا گیا ہے۔

مہینوں راہ گیروں کو، سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں کو روک روک کر تلاشیاں لی جاتی رہیں، گویا دہشت گرد سیٹ کے نیچے یا بونیٹ میں بند ہیں۔

کراچی ایک ذلیل کیا ہوا شہر بن گیا۔

جلد ہی یہ خبریں عام ہوگئیں کہ امن و امان قائم کرنے والے ادارے اندھا دھند گرفتاریاں کرنے لگے ہیں اور ہزاروں روپے لے کر رہا کرتے ہیں۔ شہر میں جرائم کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شہر کے کونوں کھدروں میں لاشیں ملنے لگیں، اذیت دے کر قتل کیے ہوئے لوگوں کی لاشیں۔

آپریشن کلین اَپ کے پہلے برس میں شہر سے لڑکے غائب ہونے شروع ہوگئے۔ ان کی عمریں سترہ سے ستائیس برس تک کی بتائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کراچی سے اٹھارہ ہزار لڑکے غائب ہوگئے۔

شاید اٹھارہ ہزار نہ ہوں؛ شاید یہ مبالغہ ہو۔

شاید نو ہزار ہوں، یا اس سے بھی کم۔

شاید پانچ ہزار ہوں۔

پانچ ہزار جوان لڑکے اپنے گھروں میں نہیں۔ کیا ان کے ماں باپ کو ان کے بارے میں علم ہوگا؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے؟ کب لوٹ سکے گا؟

جس رات نہیں آتا ہوں میں
اس آنگن میں ہوتا ہے کوئی
اس بستر پر سوتا ہے کوئی
اس کمرے کی دہلیز پہ اپنا سر رکھ کر روتا ہے کوئی
(ساقی فاروقی)

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ مل رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو
(حبیب جالب)

پھر محلّے محلّے کی ناکابندی کر کے ہتھیاروں کے لیے گھر گھر تلاشی لی جانے لگی۔

یہ ہتھیار — برسوں کی مدت میں سرکاری نظروں کے عین سامنے پھیلائے ہوئے ہتھیار — کسی کو نہ مل سکے! ہتھیار دنیا میں آج تک کہیں بھی برآمد نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں، اگر وہ عوامی حمایت ختم ہو جائے جو ان ہتھیاروں کے استعمال کو جائز سمجھتی ہے تو کسی کے لیے بھی ان کا استعمال کرنا مشکل بن جاتا ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال اسی طرح ختم ہو سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں ہم ہتھیار برآمد نہ کر سکے —ایک بہت بڑا خون خرابہ کر کے بھی نہیں۔

کراچی — تیسری دنیا کا ایک شہر، سرد جنگ کے اختتام پر، سرد جنگ کا ملبہ جھیلتا؛ اپنے فائدے میں استعمال کرنے کے لیے ان حکمرانوں کی سرپرستی کا شکار جنھوں نے اپنے معاشرے کی دھجیاں اڑا دیں، ایک ایسی سمجھ بوجھ کو جنم دیا جو منظم طور پر شہریوں کی مجرم سازی کو روا گردانتی ہے، ایسی تدبیروں کو تیر بہدف سمجھ سکتی ہے جن میں شہریوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر بھیڑیوں کی طرح شکار کرنے کے لیے چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل سمجھا جاتا ہو۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ کراچی میں شہریوں کو ذمے دار اداروں کی جانب سے دہشت گردوں سے خود نمٹنے کے لیے ہتھیاروں کی پیشکش کی گئی ہے، یہ سوچے بغیر کہ ان کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا۔

اس شہر میں کسی اسٹیج ڈرامے کی مانند کثیر التعداد قتل کیے گئے ہیں۔ شہر کے خونیں چیستان میں شیعہ سنی مساجد میں قتل اسی نوعیت کی وارداتیں ہیں، کیونکہ شہر میں کوئی شیعہ سنی تضاد موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عالمی ذرائع ابلاغ بھی اس حد تک گمراہ ہوئے ہیں کہ مساجد میں قتل کی ان پُراسرار وارداتوں کو ''سیکٹیرین

کلیش'' کا نام دیتے رہے ہیں۔

ایم کیو ایم کی تنظیم جو اپنے طبقاتی مزاج اور اپنے وقت، اور اس پورے (سیاسی، معاشرتی) پس منظر کی عکاس ہے جس میں یہ وجود میں آئی؛ اگر آپ اس کا سر دیوار سے دے ماریں اور زہریلی، پھنکارتی سرگوشی میں کہیں:

''کس کے مشورے پر پارٹی بنائی تھی؟ ایجنسیوں کے مشورے پر؟''

(سٹی کورٹ کے سامنے دبلے پتلے مہاجر لڑکوں کا گروہ بڑبڑایا: ''ایجنسیوں سے ملتے ہو؟ ایجنسیوں کے آدمی ہو؟'' انھوں نے عظیم طارق کی ٹائی پر، اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔)

تو سننے والے کا چہرہ تمتما سکتا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے: ''انڈین نیشنل کانگریس کس نے بنوائی تھی؟ مسلم لیگ کس نے بنوائی تھی؟ انگریزوں نے؟'' بلکہ شاید وہ ہکلاتے ہوئے یہ بھی پوچھ بیٹھے: ''پی پی پی کس نے بنوائی تھی؟ امریکنوں نے؟ جنھیں خوش کرنے کے لیے آپ کے بھ... بھ... بھٹو صاحب نے معاہدۂ تاشقند کی مخالفت کی تھی؟'' امریکہ کی مرضی تھی کہ اب ایوب خاں کو ہٹایا جائے۔ مگر ان سب سیاسی جماعتوں کی اس وقت ضرورت بھی تھی —عوامی ضرورت— اسی لیے یہ بن کر اس قدر کامیاب رہیں۔

اس تنظیم کو —لاکھوں عام شہریوں کی نمائندہ تنظیم کو— کن قوتوں نے اذیت گاہوں کے قیام سے، قتل سے، خون سے، ہتھیاروں سے داغدار کیا؟ اور یہ لوگ اب بھی اسے کیوں نہیں چھوڑتے؟

کراچی میں اس جماعت کے قائم کیے ہوئے اذیت خانوں کے دوش بدوش سرکاری، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اذیت خانے بھی تھے جہاں اس وقت کی معتوب پیپلز پارٹی کی نوجوان لڑکیوں کو... بجلی کے تاروں سے جھٹکے دیے جا رہے تھے۔ اس شہر میں، ایک وقت تھا کہ معتوب پیپلز پارٹی کے لوگ رات بھر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

پھر یہاں ایم کیو ایم کرسیوں پر بٹھائی گئی، گو اسے فیتے کاٹنے اور لوگوں سے ہاتھ ملانے کے علاوہ شہر یا صوبے یا ملک کے اہم معاملات کو اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

انھیں جلوس نکالنے کا اختیار تھا، سو انھوں نے فقید المثال جلوس نکالے۔ انھیں بدعنوانیوں کا اختیار تھا (یہ اختیار یہاں سب کو دے دیا جاتا ہے) سو ان کے ہتھیار بند اسکوٹر سوار لڑکے (جنھیں سرکاری نگرانی میں

برسوں سے ہتھیار بند بنایا جاتا رہا تھا) بھتہ وصول کرنے لگے۔

انھیں قابو میں کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ہتھیار بند اداروں کو تعینات کیا گیا۔ نہایت قلیل عرصے میں وہ بھی بھتہ وصول کرنے لگے۔

کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟ اور وہ کیا سچ ہے جو لکھا نہیں جا سکتا؟ عورت سوچتی ہے۔

یہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا سکتا ہے کہ برسوں سے ظلم، دھونس اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیے جانے والے ریاستی ادارے اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ بحرانی صورتِ حال میں ان کا اوپری خول تک نظر نہیں آ سکتا۔ مزید برآں، ان بری طرح ناکارہ، ریاست کے دیمک چاٹے ہوئے اعضائے کار کے ذریعے ظلم، خوں ریزی اور دھونس کا خاتمہ مزید ظلم، خوں ریزی اور دھونس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً شہر کی اکثریتی آبادی کے تعاون کے بغیر تو ہرگز نہیں۔ یہ حکمتِ عملی صرف گذشتہ دہشت گردی کو تازہ دہشت گردی سے خلط ملط کر کے جرائم اور خوں ریزی کی گتھی کو اور بھی مضبوط، کھولی نہ جا سکنے والی گرہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے — اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کراچی میں آپریشن کلین اَپ اسی لیے کامیاب نہیں ہوا۔

خون کی بوچھاڑ میں

چلچلاتی دھوپ میں اور ایسی گرمی میں کہ چیل گھونسلے میں انڈا چھوڑے، کراچی کے نواح میں مگرمچھوں کے تالاب کے پاس سناٹا ہے۔ سفید آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ اڑتا نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھار چلنے والے لُو کے گرم تھپیڑے سے تالاب کے کنارے اُگے سوکھے، خاکستری ببول اور جھاڑ جھنکاڑ ایک جانب کو زور سے طمانچہ کھاتے آدمی کی طرح جھک جاتے ہیں۔ دور دور تک نہ آدم ہے نہ آدم زاد؛ نہ کوئی اَور جاندار نظر آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ مگرمچھ بھی سوکھے پتوں اور گھاس پھوس سے بھرے تالاب کی تہہ لینے کے لیے اپنی خاکی سبز تھوتھنیاں پانی سے نکال کر بڑی بڑی نیم خوابیدہ آنکھوں سے چہار سو پھیلی ویرانی پر نظر ڈالتے ہیں اور سستی سے دوبارہ غڑاپ کی آواز کے ساتھ تھوتھنیاں اندر کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے گویا فطرت نے اپنے خاص الخاص موقلم سے کراچی کے جاری شب و روز کے پس منظر کے طور پر بنایا ہو۔

تالاب کا سبز کا ہی پانی بالکل خاموش ہے۔ دفعتاً خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ چادرِ آب عین وسط سے چاک ہوتی ہے اور اس میں سے ایک پیرِفرتوت برآمد ہوتا ہے۔ آن کی آن میں وہ بالوں سے پانی جھٹکتا، چلچلاتی دھوپ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھتا ہے۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک بڑھیا نکلتی ہے۔ اس کی کمر خمیدہ ہے اور تار تار لباس میلا اور پیوندوں سے بھرا ہوا ہے۔ مچی مچی آنکھوں سے وہ زمین پر کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ دراصل روشنی اتنی زیادہ ہے کہ اسے کچھ بھی سُجھائی نہیں دے رہا۔

معاً تڑخی ہوئی زمین پھٹی اور چار کالے کالے ننھے منے بھتنے پھدک کر باہر آ گئے۔ وہ بالکل مٹی کے پتلے لگ رہے ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں چمکاتے وہ ایک گھیرے میں بڑھیا کے اطراف قہقہے لگا لگا کر ناچنے اور گانے لگے:

''بڑھیا ری بڑھیا، تو کیا ڈھونڈے، خون کی بوچھاڑ میں؟''

بڑھیا نے کہا:

''بچّو رے بچّو، میں سوئی ڈھونڈوں، خون کی بوچھاڑ میں۔''

بھتنے: ''سوئی سے کیا کرے گی، خون کی بوچھاڑ میں؟''

بڑھیا: ''سوئی سے تھیلی سیوں گی، خون کی بوچھاڑ میں۔''

بھتنے: ''تھیلی میں کیا رکھے گی، خون کی بوچھاڑ میں؟''

بڑھیا: ''تھیلی میں روپیہ رکھوں گی، خون کی بوچھاڑ میں، خون کی بوچھاڑ میں، خون کی بوچھاڑ میں...''

بھتنے یہ سن کر غائب ہو گئے۔ اب بڑھیا پیرِفرتوت کی جانب متوجہ ہوئی۔ نہ جانے اسے سوئی ملی یا نہیں! شاید ایک زنگ آلود سوئی مل تو گئی تھی جسے اس نے اپنے لباس میں اُڑس لیا تھا۔ بڑھیا پیرِفرتوت کے پاس آئی جو اب ایک گلاس سے کوئی مشروب پی رہا تھا۔ بڑھیا نے اپنا بایاں ہاتھ اسے دکھا کر پوچھا:

''کیوں بڑے میاں، میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟''

بڑے میاں نے کھنکھار کر کہا، ''کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟''

''پیسہ آئے گا، رو کڑا؟'' بڑھیا نے مضبوطی سے پوچھا۔

بڑے میاں شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ جھجک کر بولے، ''یہ

کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟ آپ تو... ماشاء اللہ... ادیبہ ہیں... عالم فاضل۔''

یہ سن کر بڑھیا پہلے ہنسی اور پھر روئی ...یا شاید وہ پہلے روئی تھی اور پھر ہنسی تھی۔ پھر وہ پیرِ فرتوت کے پاس اپنی گدڑی بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میاں سے کہا:

''چلیے جانے دیجیے... یہ میرا ذاتی اور قومی معاملہ ہے... آپ یہ بتائیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے... کراچی میں؟''

بوڑھا دیر تک سورج کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے یوں آغاز کیا:

''محترمہ، میں یہ باتیں آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم اب میری زندگی اور کے دن کی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ حقیقت کسی ایسے شخص تک پہنچ جائے جو اسے سمجھ سکے اور محفوظ کر لے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بے شک... اس تحریک کی داغ بیل میں نے ڈالی... اور... حالانکہ مدت ہوئی میں اس سے جدا ہو چکا ہوں اور تحریک تباہی کی طرف مائل ہے... پھر بھی میں چند باتوں پر فخر کیوں کرتا ہوں۔''

''بتائیے، بتائیے،'' عورت نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دیدوں کے پیچھے پانی خارج کرنے والے غدود کا سماعت کی نسوں کا ایک غیر معمولی رابطہ اس طرح ہو گیا ہے کہ دو تین برس سے لفظ ''کراچی'' سنتے ہی یہ غدود متحرک ہو جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔

بوڑھے نے بتانا شروع کیا:

''محترمہ، میں نے اس ملک کی سیاست کے خارزار کے چپے چپے کی دشت نوردی کی ہے۔ برسوں، بلکہ عمر بھر، اسی صحرا کی خاک چھانی ہے۔ نیپ میں شامل میں رہا، جی ایم سید کے ساتھیوں میں میں رہا... اور میں دیکھتا رہا کہ مہاجر من حیث القوم رجعت پسند سیاسی جماعتوں کے ہم نوا رہے۔ ترقی پسند نعرے اجتماعی طور پر انھیں کبھی بھی اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں یہ اس نو جماعتی متحدہ محاذ کے ساتھ ہو گئے جسے نو ستارے کہا جاتا تھا...''

عورت کے ذہن میں ایک تصویر تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ کراچی ہے۔ شہر کے مغربی مضافات میں پھیلے سائٹ کے صنعتی علاقے کی ایک بلند و بالا کثیر القومی دواساز فیکٹری کے دفتر میں وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔ اس دفتر اور کارخانے کا ایک ایک فرد جماعت اسلامی کا حامی ہے۔ لیبارٹری کی طرف جاتی ہوئی دو نوجوان فارماسِسٹ لڑکیاں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ خوش ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہتی ہے،''ہم نے انھیں ہرا دیا۔

بھائی جان کہہ رہے تھے کہ مہاجروں کے دماغ اور پٹھانوں کی جسمانی قوت نے مل کر کام کیا ہے۔''

''اچھا، آخر آپ بھٹو کے خلاف کیوں ہیں؟'' عورت نے ایک نوجوان، خوش پوش اور مستعد سیلز ایگزیکٹو سے پوچھا۔

وہ جلدی جلدی اسے سمجھانے لگا، ''اجی اس وڈیرا گردی سے تنگ ہیں ہم... یہ جو چلے آتے ہیں... بھر گئے ہیں شہروں میں... دیکھیے میڈم، کپڑوں کی دکان پر جا کر دیکھیے... جس کپڑے کا ایک کوٹ سلوانے کی استطاعت حاصل کرنے کے لیے ہم نے عمر بھر محنت کی ہے، اس کے درجنوں سوٹ یہ کس طرح خریدتے ہیں۔''

ہوں، تو معاملہ طبقاتی ہے، عورت دل میں سوچتی ہے۔

مگر شہر کے گلی کوچوں میں یہ طبقاتی نفرت لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ ولی خاں کی قیادت میں کراچی کے پٹھان پیپلز پارٹی کے شدید مخالف بن چکے ہیں۔ سڑک پر سندھی چادر اجرک اوڑھنے والوں کے لیے کوئی رکشا ٹیکسی نہیں رکتی جسے کوئی پٹھان چلا رہا ہو...

''تو پھر آپ نے کیا کیا؟'' عورت پیرِ فرتوت سے پوچھتی ہے۔

''تو انتخابات کے بعد میں نے سوچا... کہ لوگوں میں، عوام میں تحرک اندرونی تضادات کو تیز کرنے ہی سے آتا ہے۔ کٹھ ملاؤں سے مہاجروں کی جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے... مذہبی جنون کے زہر کو قومی عصبیت کا زہر ہی کاٹ سکتا ہے... لہٰذا میں نے ان نوجوانوں پر توجہ مرکوز کر دی جو کراچی کے گلی کوچوں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر جلسے جلوس کرنے، ٹائر جلانے اور پُرجوش تقریریں کرنے کے باعث محلوں کے ہیرو بن چکے تھے۔''

عورت کو یاد آتا ہے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد، دھاندلی کے الزام میں چلائی ہوئی تحریک... جلوس پر فوج کی فائرنگ... پہیہ جام ہڑتال میں ٹرین روکنے کی کوشش... احمد فراز کی جذباتی نظم:

پٹریوں پر جمی پپڑیاں خون کی
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں

کراچی کے گھر گھر میں اس نظم کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں...

''خیر، تو میں نے ان سے کہا کہ نو ستارے تمھیں استعمال کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کسی مہاجر کے پاس کبھی نہیں آئے گی... پس تو آخر کار مہاجر طلبا تحریک کا آغاز ہوا، اور اس کی رہنمائی میرے ہی محلے کے ایک لڑکے نے کی...

''میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اس طرف لانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے۔ ہم تو بین الاقوامی، طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا: میاں، تحریکیں نیک جذبات پر کامیاب نہیں ہوتیں۔ عوام کی کسی دُکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے، کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے، مگر اس کی آڑ میں، بلکہ اس کے سہارے، بڑے بڑے کام کیے جا سکتے ہیں...''

بوڑھے کی بات کی نصف سچائی عورت کے دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح اترتی ہے...

''مگر کیا!'' بوڑھا کہتا ہے۔ ''پھر آتی ہے تنظیم... بھئی ہم بیزار تھے پارٹیوں کی بدنظمی سے۔ ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اپنا ہی تصور — منتخب ممبرانِ اسمبلی اپنے گھر نہیں جا سکتے، اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ اُن کے گھر والوں پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ اگر منتخب نمائندہ گمراہ ہو جائے تو اُس کے خاندان والوں کی خیر نہیں۔ اَنا کو توڑا جائے...''

طبقاتی نفرت کا ایک مظہر — جو کسی کی سمجھ میں آنے سے پہلے، زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ مہذب، مہاجر افراد سے بھی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے گھر میں مرغا بنے ہوئے، الٹے لٹکے ہوئے لوگ...

''اَنا کو توڑنا؟''

''کیوں؟ کیا چین میں ماؤ نے محنت کش طبقے سے نہیں کہا تھا کہ ان بڈھے رجعتی پروفیسروں کے سر پر جوتے مار مار کر ان کے فلسفے کی ہوا نکالو؟'' بوڑھا ہنستا ہے۔ اب وہ دوسرا گلاس بھر رہا ہے۔ ''بھول گئیں چین کا ثقافتی انقلاب؟''

مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس پر تھا کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر تھی۔

اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بیگانہ کر دیا... وہ جاہل ہو گئے۔ صرف نعرہ بازی، جلسے جلوس میں مشغول، جئے مہاجر!

بوڑھا گلاس سے چسکی بھرتا ہے۔ ''کلچرل ریوولیوشن کے دوران چائنا میں بھی یہی ہوا تھا۔ برسوں قوم کی قوم پڑھنے لکھنے یا کوئی بھی پیداواری کام کرنے کی جگہ ڈنڈے بجاتی گھومتی رہی تھی... اسی لیے بعد میں ملک میں اتنا بڑا قحط پڑا تھا۔''

مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے۔

تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے، مگر اس شہری، تعلیم یافتہ، روشن خیال جماعت کے سربراہ سرعت سے پیر بن گئے۔ پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں پتوں، پھولوں اور پتھروں میں ان کی مبارک شبیہہ نمودار ہونے لگی۔

اور لاکھوں پڑھے لکھے، روشن خیال مہاجر ان باتوں کو یکسوئی کے ساتھ نظر انداز کرتے رہے۔

رنچھوڑ لائن کے ایک شکستہ، تنگ و تاریک مکان کے صحن میں ایک جنازہ تیار رکھا ہے۔ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آرہی ہیں۔ پانچ چھوٹے بچے ڈبڈبائی آنکھوں سے کھڑکیوں کے باہر جھانک رہے ہیں۔ صحن میں عزاداروں کا ہجوم ہے۔ ان میں سے ایک، جو مرنے والے کا دوست ہے، اس کے بڑے بیٹے کو گلے سے لگا کر بھرائی آواز میں کہتا ہے، ''صبر کرو میرے بیٹے... اور یہ نہ بھولو کہ اب اس خاندان کے والی وارث تم ہو— تم اب میڈیکل کی پڑھائی جاری نہ رکھ سکو گے۔ تم کل ہی میرے پاس آؤ، میں تمھیں نوکری دلا دوں گا۔''

۱۹۵۴ء میں ایک سو اسی روپے ماہوار کی نوکری سے بالغ زندگی کا آغاز کرنے والا یہ لڑکا... سن نوے یا اکانوے یا چورانوے میں اپنے ادارے کے اعلیٰ ترین افسروں میں شامل، دیس دیس گھوما ہوا... اسلام آباد یا لاہور کے بنگلے کے نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں اپنے پائپ کی راکھ ایش ٹرے میں صاف کرتا ہے اور بے پروائی سے کہتا ہے:

''سب چلتا ہے... اس تحریک نے ہمیں ہمارا تشخص دیا ہے۔ مہاجروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ انھیں کسی نے پلیٹ میں رکھ کر نہیں دیا— یہ ان کی ماہ و سال کی، شب و روز کی محنتِ شاقہ کا حاصل ہے۔ میں اس مقام پر کسی دبڑ دھونس، کسی کوٹا سسٹم یا سفارش کے ذریعے نہیں آیا ہوں۔''

مگر— خدا نہ کرے... کہیں وہ کراچی کی اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ جاتا، تو قائد کے روبرو، بلکہ ان کے کمرے سے ملحق راہداری میں، اسے مرغا بنانا ناممکن نہ تھا...

اَنا کو توڑو!

اب عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر وہ منہ چلا چلا کر کہتی ہے:

''دانشور... دانشور... ادیب اور شاعر... اب یاد آئے ہیں مہاجر ادیب اور دانشور؟ پہلے کبھی ان کا خیال آیا؟ پہلے کبھی سوچا؟ حسن ناصر بھی مہاجر تھا جس نے لاہور کے قلعے میں اذیتیں جھیلتے ہوئے جان دی۔ کبھی اُس کا نام لیا؟ ابراہیم جلیس بھی مہاجر تھا جس نے ضیا مارشل لا میں فوجیوں کا قہر سہا— اور جو اپنے معتوب اخبار کے دفتر میں، فوجی ہیڈ کوارٹر میں جھڑکیاں اور دھمکیاں سننے کے بعد، دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا...''

''تحریکیں نیک ارادوں سے نہیں چلتیں،'' بوڑھا بڑبڑاتا ہے۔ ''جب تک تضادات کو ہوا نہ دی جائے... عوام کے کسی خاص احساسِ محرومی پر فوکس...''

''احساسِ محرومی...'' بڑھیا بڑبڑاتی ہے، ''کبھی سندھ کے دیہات میں جا کر دیکھیں جہاں بے شمار لوگوں کو پانی تک نصیب...''

بوڑھا ہنستا ہے۔

''اب... ایسا ہوتا ہے کہ...'' وہ اب اپنا دوسرا گلاس ختم کر رہا ہے۔ ''سماجی اکائیاں اپنی ہی محرومیوں کے نعرے لے کر چلتی ہیں... دوسروں کی نہیں۔ اب سندھی قوم پرستوں کو لیجیے۔ جن حقوق کو یہ اپنے قومی بلکہ انسانی حقوق کہتے ہیں، ان کے تصور کے کسی دور دراز ترین گوشے میں بھی، کیا یہ حقوق سندھ میں ہزاروں برس سے رہنے والی بھیل اور اوڈ قوموں کے بھی ہیں؟ سندھ کے دیہات کی محرومیوں کا اپنے تمام زمانۂ طالب علمی میں رونا رونے والے سندھی، اچھے گریڈ کی نوکریاں حاصل کرنے کے بعد، ڈاکٹر یا انجینئر بن جانے کے بعد، ان دیہات میں پھٹکتے بھی نہیں... وہ تو کراچی یا اسلام آباد میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوریاں ہیں، اور اجتماع کی کمزوریاں بھی ہیں۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عورت نے پوچھا:

''اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟''

''اسلحہ کراچی میں عام فروخت ہوا ہے... افغان جہاد کا منطقی نتیجہ!''

اب عورت کی آنکھوں والے پانی کے غدود پھر سے متحرک ہو چکے ہیں۔

''مگر یہ بہیمیت... یہ درندگی... مخالفین کے بدنوں میں ڈرل سے سوراخ کرنا...'' وہ اٹک اٹک کر

بول رہی ہے... الو کی پٹھی! خود بھی اردو اسپیکنگ ہے نا، اسی لیے... اس کے منہ سے یہ الفاظ اسی لیے بڑی مشکل سے نکل رہے ہیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے، مگر دل کی انتہائی تاریک گہرائیوں میں جانتی ہے کہ یہ سچ ہے۔

''ایسا تو کوئی نہیں کرتا تھا!'' وہ روتے ہوئے کہتی ہے۔ ''آخر دوسری بھی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ درندگی... ان مہاجر لڑکوں کو کس نے سکھائی؟

''ایسٹ پاکستان میں!'' وہ اچانک چونکی۔ ''ایسٹ پاکستان میں سب سے پہلے ایسا ہوا تھا۔ پہلے بنگالیوں نے اردو اسپیکنگ لوگوں کے ساتھ یہ کیا تھا۔ آنکھیں نکال لینا ...بدن کا سارا خون نچوڑ لینا...''

بوڑھا ہنسنے لگا۔ کھانس کر بولا، ''ارے درندگی سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی!''

''آپ اپنی لکھی ہوئی کتاب دوبارہ خود پڑھیے کبھی،'' دفتر میں اس کے ایک دوست نے اس سے کہا تھا۔

کبھی اس نے فسطائیت کی سماجی بنیادوں پر ایک جرمن نژاد نفسیات داں کی کتاب سے ماخوذ ایک مختصر جائزہ لکھا تھا۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اخلاقیات میں جس طرح لطف لینے کو گناہ سمجھا جاتا ہے، حصولِ مسرت کے خلاف جو جذبہ ہے، وہ اسے ایک ایسی روڑھی، روکھی پھیکی زندگی گذارنے پر مجبور کرتا ہے جو اس میں سادّیت پیدا کرتا ہے۔ سادّیت کا دوسرا رخ خود اذیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر اس طبقے کو فسطائیت کے لیے زرخیز میدان کی طرح بنا دیتے ہیں۔ یہ طبقہ ایک حاکم کے حکم پر سختی سے کاربند رہنے میں خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا ماحصل یہی کچھ تھا۔ وہ اس نے خود لکھی تھی— مگر... مگر اس تھیسِس کو کسی غیر مرئی ہیولے کے بارے میں لکھنا ایک بات تھی، اور... اور اسے اپنی پڑوسیوں پر، ان دبلے پتلے انسانوں پر منطبق کرنا بالکل دوسری بات تھی، جو اب خود مار کھا رہے تھے... جن کی مسخ کی ہوئی لاشیں شہر کے گلی کوچوں سے برآمد ہو رہی تھیں... جن کے لیے اس کا اپنا دل خون ہو رہا تھا... جو طبقہ نہیں، جیتے جاگتے لڑکے تھے: کسی کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی، ہنستے ہوئے، گاتے ہوئے، سڑک پر سچ مچ چلتے ہوئے...

اسے وہ دن یاد آیا جب اچانک شہر میں سفید رنگ کے بے شمار بینر لگا دیے گئے تھے جن پر سرخ الفاظ میں تحریر تھا: ''جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔'' تمام گلی کوچے اس خون جما دینے والے

نعرے سے اس طرح ڈھک گئے تھے کہ کسی بلند عمارت سے دیکھنے پر شہر کسی زخمی کے مانند نظر آرہا تھا جس کے تمام جسم پر خون سے رِستی ہوئی پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔

اس دن شہر میں بے پناہ دہشت تھی۔ ایم کیو ایم کے باغی گروپ کے لوگ، جو بعد میں ایم کیو ایم حقیقی کے نام سے معروف ہوئے، چند دن پہلے ہی شہر سے غائب ہوئے تھے۔ لوگ خاموش تھے۔ شہر اس نعرے کے ہول سے سنسنا رہا تھا: ''موت کا... موت کا... موت کا حقدار ہے!''

اس دن موت اپنے سیاہ پَر کھولے ہوئے کراچی پر اپنی تاریک پرچھائیں ڈال رہی تھی۔

یہ فاشزم ہے! شاید اس دن کچھ لوگوں کے دل چیخے ہوں۔ مگر ایم کیو ایم کی فقیدالمثال افرادی حمایت کے سامنے لب کشائی کی جرأت کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ حمایت جو کراچی کے غریب، نچلے متوسط طبقوں پر مشتمل تھی جو فلسفہ آرائیاں کرنے کے — ان کے خیال میں ''عیاشی'' کے — متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ طبقے، اور یہ محنت کش نیم خواندہ لڑکے ڈسپلن اور فاشزم میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آنچ کاغذی اسناد کھا گئی

مزدور طبقے کے ایک شاعر نے جب جوش اور جذبے میں یہ شعر لکھا تھا، تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس کا عملی مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے... یہ بھی؟ جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے؟

اب بہت دیر ہو چکی تھی اور شام ہو جانی چاہیے تھی۔ اس سفید، جہنم کی طرح دہکتے ہوئے سورج کو اب تک ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا، مگر کسی طلسم کے باعث ایسا نہیں ہو رہا تھا اور سورج مستقل نصف النہار پر تھا۔

کراچی میں اس روز کا اسکور سولہ تھا: تین لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے، دو پولیس کے سپاہی گولی کھا کر ہلاک ہوئے، ایک نالے میں ایسا آدمی ملا جس کی ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں، باقی کے پولیس مقابلے میں مارے گئے۔

یہ کون کر رہا ہے؟ اس نے ہواؤں سے، خلاؤں، ستاروں سے پوچھا۔

ان سب نے مستعدی سے جواب دیا: اس تنظیم کے دو متحارب گروہ کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کو سرکاری پشت پناہی حاصل ہے؟

جی ہاں، کیونکہ یہی ان کی مسلح قوت کو گلی کوچوں میں چیلنج کرسکتا ہے۔

پھر اس قوت کا کیا کیا جائے؟

یہ تو ابھی پتا نہیں... کچھ نہ کچھ حل سوچ لیں گے!

اگر اس تنظیم سے سیاسی صلح ہوجائے تو پھر اس کی مسلح قوت حرکت میں نہیں آئے گی... یہ بھی تو ہوسکتا ہے؟

بہر حال... جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں... یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس تمام عمل سے ایک خاص کمیونٹی کے لیے پورے ملک میں جو نفرت پھیل رہی ہے، اور خود اس کے اندر جو احساسِ بیگانگی پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

برے کام کا برا نتیجہ!

پورے پورے محلّوں کے افراد کو قمیصیں اتروا کر، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر تھانوں میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟

تو وہ بتاتے کیوں نہیں کہ اس تنظیم کے مسلح لڑکے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ خوف کے مارے چپ رہتے ہیں۔

صرف خوف کے مارے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی عوامی حمایت اب بھی موجود ہو؟

ہوسکتا ہے... مگر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

بلدیاتی انتخابات کروا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔

اور اگر یہ جیت گئے تب؟ نا با با نا! ایسی غلطی دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔

اگر — بالفرض محال — یہ عوام میں اب بھی مقبول ہیں، تب لاکھوں شہریوں کی رضا کو جبراً کچلنا... جمہوری اقدام تو نہیں ہوسکتا۔

اگر لاکھوں شہری ایک فسطائی جماعت کے ہم نوا بن جائیں تو ہم کیا کریں!

اسے سیاسی عمل کا راستہ فراہم کر کے، اس کے فسطائیت کے رجحان کو ختم کر کے، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے رہنے دیا جائے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟

خاموشی...

خاموشی...

خاموشی...

یہ ہندوستانی ایجنٹ بن چکے ہیں۔

باری باری — جیسا کہ آپ جانتے ہیں — سب ہندوستانی ایجنٹ بنے۔ اقتدار اور وسائل میں شرکت ملنے پر واپس پاکستانی ایجنٹ... معاف کیجیے گا، پاکستانی بن گئے۔ تو کیا ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا؟

خاموشی...

خاموشی...

خاموشی...

بہیمیت صرف نچلے متوسط طبقے کی میراث نہیں۔ شاید کسی کو یاد ہو... چند برس پہلے، سترہ سندھی نوجوان پکڑے گئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ یہ الذوالفقار کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے ایما پر مسلح تربیت لینے جا رہے تھے۔ بعد میں ان میں سے چند کی لاشوں کے ٹکڑے بوریوں میں بند ملے تھے۔ لاشیں کئی دن پرانی تھیں اور بو چھوڑنے لگی تھیں۔ وہ کام تو مہاجروں کی تنظیم نے نہیں کیا تھا؟ سوال یہ ہے کہ تفتیش کے دوران لاشوں کے ٹکڑے کیونکر ہو گئے؟

خاموشی...

خاموشی...

خاموشی...

دہشت کے بدلے دہشت... زہر کو زہر کاٹتا ہے۔ اسلحے کا مقابلہ اسلحے ہی سے کیا جا سکتا ہے!

اس پر عورت نے زور سے قے کی اور منہ پونچھتے ہوئے بوڑھے سے پوچھنے لگی:

''اور آپ کا کارنامہ کیا ہے؟''

''مہاجروں کو تشخص ملا۔ شیعہ سنی فسادات ختم ہو گئے۔ اور میں چاہتا تھا کہ سندھی مہاجر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں...''

''ہوں... تو مہاجر تشخص کو اور اتحاد کو ختم کرنے کے لیے — زہر کو زہر کاٹتا ہے والے نظریے کے مطابق... غالباً شیعہ سنی فسادات کرانے کی کوشش کی گئی تھی کراچی میں... مگر کامیاب تو نہیں ہوئی؟''

''اب تو بوتل سے جن باہر آ گیا ہے...''

''رہی یہ آخری بات کہ سندھی مہاجر اتحاد... سوتو کسی دیوانے کی بڑ معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو ان دونوں کی ایک دوسرے سے خاصی واضح دشمنی ہے۔''

''خیر... دس برس تک تو کنٹرول میں رکھا اس جذبے کو...''

''ان دس برسوں کے لیے یہ گلدستہ قبول کیجیے!''

عورت نے بڑے میاں کو تازہ سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔

پھر دونوں تالاب میں واپس چھلانگ لگا کر غرق ہو گئے۔ تالاب کی سطح برابر ہو گئی۔ سورج اسی طرح نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ایک مگرمچھ نے کاہی تھوتھنی نکال کر گرم ہوا میں سانس بھری۔

زنا بالجبر... ہوا کہ نہیں؟

شہر میں سناٹا ہے اور ہڑتال... کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا، تمام دکانیں بند ہیں۔ اگر دکانیں کھولی جائیں، یا ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانے کے لیے کسی سواری پر سفر کیا جائے، تو پتھراؤ ہو سکتا ہے، گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ پتھراؤ اور فائرنگ وہ تنظیم کرے جس نے ہڑتال کی کال دی ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پتھراؤ اور فائرنگ اس تنظیم کی رقیب تنظیم یا حکومت کی خفیہ ایجنسیاں کروائیں تاکہ ان کا الزام ہڑتال کروانے والی تنظیم پر رکھا جا سکے۔

ایسا ہو سکتا ہے... کیونکہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ممکن ہے کئی دنوں... ہفتوں... مہینوں سے ایسا ہو بھی رہا ہو۔ کیونکہ یہ شہر ایسا ہے جہاں عرصے سے ہو سکتا ہے کچھ بھی ہوتا رہا ہو۔

ایک شخص ہڑتال، یعنی شہریوں کی گھر میں نظر بندی، والے روز وی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہے۔ ہندوستانی فلم ہے؛ ایک ڈاکو کی کہانی جس کا ایک بیٹا ڈاکو بنتا ہے اور دوسرا پولیس والا، جبکہ دوسرے بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کا بیٹا ہے، اور ڈاکو بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ پولیس والا اس کا بھائی ہے۔ شخص مذکور کو یہ فلم ہزار بار دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ پولیس کی نفری میں ایک حسین پولیس والی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی بہانے بار بار پولیس

یونیفارم اتار کر چولی اور پنڈلیوں سے اونچا جگمگاتا لہنگا پہن کر ناچتی اور گانا گاتی ہے۔ پولیس والی ڈاکو کے اُس بیٹے سے محبت کرتی ہے جو پولیس والا ہے۔ وہ یونیفارم میں بھی پُرکشش لگتی ہے۔ خاکی پتلون اس کی رانوں اور جانگھوں پر پھنسی رہتی ہے۔ شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ فلم میں جب ڈاکو باپ، پولیس والا بیٹا، پولیس والی اور ڈاکو بیٹا ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور گاڑیوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہوتے ہیں، تو انھیں چنداں خبر نہیں ہوتی کہ ان کے آپس میں کیا رشتے ہیں۔ مگر فلم کے انجام تک پہنچتے پہنچتے تمام الجھاوا دور ہو جاتا ہے، سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کس کا باپ، کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ باپ دونوں بیٹوں کو گلے سے لگا کر مر جاتا ہے۔

ہڑتال دراصل زنا بالجبر کے ایک واقعے — یا مبینہ واقعے — پر احتجاج کے طور پر کی گئی ہے۔ لڑکی کا بھائی ایک معتوب تنظیم سے تعلق رکھتا ہے اور روپوش ہے۔ چند دن پہلے اخباروں میں ایک پندرہ سولہ برس کی روتی ہوئی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی اور ساتھ ہی یہ خبر کہ روپوش تنظیمی کارکن کی بہن کے ساتھ اہلِ خانہ کی موجودگی میں کئی افراد نے زنا بالجبر کیا۔

دوسرے دن سے مخالف تنظیموں کی جانب سے زنا کے الزام کی تردید شائع کی جانے لگی۔ چند ڈاکٹروں نے سرکاری طور پر لڑکی کا معائنہ کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جسم پر اجتماعی زیادتی کے نشانات دکھائی نہیں دے رہے۔ پھر لڑکی کا معائنہ ایک غیر سرکاری ہسپتال میں کروایا گیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جسم کے بعض مقامات پر سرخی اور سوجن ہے۔

اس سے تنظیم کے سربراہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زنا ہوا ہے، جب کہ مخالف تنظیموں اور سرکاری وزرا نے یہ نتیجہ نکالا کہ زنا نہیں ہوا ہے۔

شخصِ مذکور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جماع یا زنا جیسے کام میں اتنے زیادہ عضلات، ہڈیاں، اعصاب، گوشت کے ریشے وغیرہ کام کرتے ہیں — ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بہرحال، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زنا ہوا یا نہیں۔ ایک بات جس کا ذکر (غیر سرکاری ہسپتال کی) رپورٹ میں تھا، یہ تھی کہ کنوار پن ختم ہو چکا ہے، لیکن اسے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ زخم بھرنے لگا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ تخمینہ لگایا جائے کہ ایک صحت مند، پندرہ سولہ سالہ لڑکی کے بدن میں اس قسم کا زخم بھرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے — ایک دن؟ اس سے زیادہ؟ — جبکہ گوشت اور خون کے ذرات اپنے

فطری کام میں مگن ہوں...

چند دن پہلے اخباروں میں شخصِ مذکور نے یہ خبر پڑھی تھی کہ زیرِعتاب تنظیم کا ایک گرفتار کارکن کسی پوچھ گچھ کے سلسلے میں ایک کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شخصِ مذکور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک نوجوان نے اصول پسندی کے باعث پولیس کا مخبر بننے پر خودکشی کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں آنے والی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو بالائی منزل سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ نوجوان نے اصول پسندی کے باعث خودکشی نہیں کی تھی۔ ہائیں، یہ کیا بات ہوئی؟ شخصِ مذکور نے سوچا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ نے اس انکشاف کو جذب کیا کہ اس گرفتار نوجوان کو کئی منزلہ عمارت کے بالائی حصے پر لے جایا گیا اور وہاں سے نیچے پھینک دیا گیا۔ اب کی بار شخصِ مذکور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور تصور ہی تصور میں ایک مضبوط جال لے کر اس کئی منزلہ عمارت کے نیچے جا کھڑا ہوا اور گرنے والے نوجوان کو اس میں جھیل لیا۔ نوجوان اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس نے کہا کہ شکریہ ادا کرنے میں وقت نہ گنواؤ اور فوراً گھر جاؤ۔ نوجوان آنسو پونچھتا ہوا ننگے پیر ہی گلیوں گلیوں دوڑ گیا۔ جب وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے روتے اسے گلے سے لگایا... اس کے بعد شخصِ مذکور کا تصور کند ہوگیا۔ وہ مزید تصور نہ کر سکا کہ گھر والوں نے اسے پانی پلایا ہوگا یا دودھ پلایا ہوگا۔

تصور کے ختم ہو جانے پر اس نے حقیقت کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نوجوان بالائی منزل سے گرنے سے ہلاک ہوگیا تھا۔ جال میں زندہ سلامت نوجوان کی جگہ اس کے سامنے ایک ہڈیاں ٹوٹی، کھوپڑی پھوٹی لاش پڑی تھی۔ اب تو وہ اور بھی رویا اور ماتم کرنے لگا اور سینے پر دوہتڑ مار مار کر ہچکیوں میں کہنے لگا: ہائے، نوجوان لڑکے! کیسے تجھے پالا تھا ماں نے سینے سے لگا کر، پل پل تیری بلائیں لے کر۔ دروازے پر منتظر رہتے تھے گھر والے، اگر تو دیر سے آتا تھا۔ تیرے لیے کھانا ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ منتیں کر کر کے تجھے کھلاتے تھے اگر تو کبھی کھانے سے انکار کرتا تھا۔ تیرا سر ذرا بھی دکھنے لگتا تو پیار سے سر میں تیل کھپاتی تھی تیری بہن، یا تیری ماں... یہی سر جو آج زمین پر تڑخا پڑا ہے... کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی، خون میں تر مغز زمین پر بکھرا ہوا اور ان پر مکھیاں بیٹھتی ہوئیں۔

ہائیں، شخصِ مذکور نے سینہ کوبی بند کر کے، گردن لمبی کر کے، غور سے کھوپڑی کے اندر دیکھا۔ تو یہ ہوتا ہے کھوپڑی کے اندر؟ اس نے نہایت تحیّر اور سنسنی کے عالم میں خود سے کہا۔ مگر وہ طبی سائنس داں تو نہ تھا کہ مزید تحقیق کرتا کہ آدمی کی کھوپڑی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض چھٹی یا ہڑتال کے دن وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والا ایک معمولی، عام شہری تھا۔ لہٰذا اس کا تجسس زیادہ دور تک نہ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ مرنے والے کے اعزا کی جون بدلی اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

لیکن اسی اخبار میں یہ خبر بھی تھی کہ ایک سر کٹے آدمی کی لاش ملی ہے جس کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا ہے۔ لاش کی جیب سے یہ پرچی ملی ہے: ''ایک مہاجر بہن کی بے حرمتی کرنے والے کا انجام۔''

پہلے بھی چند لاشوں کی جیبوں سے اس مضمون کی پرچیاں برآمد ہوئی تھیں: ''مخبری کرنے والے کا انجام۔''

یہ خبریں پڑھ کر شخصِ مذکور مزید حیران اور پریشان ہو گیا۔ وہ کٹے ہوئے سر کو دھڑ سے اور عضو تناسل کو رانوں کے بیچ میں جوڑ کر پورا آدمی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ ... اس نے لاش کو پلٹا اور دیکھا کہ سر کٹے کی پشت پر کوئی زخم نہیں ہے۔ ... اس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ریڑھ کی ہڈی پر پھیر کر استخوانی زنجیر کی آخری کڑی کو اچھی طرح محسوس کیا۔ کہتے ہیں (شخصِ مذکور کو خیال آیا) کہ یہاں آدمی کی تمام قوت پوشیدہ اور خفتہ ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں ہندوستانی ماہروں کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہتے تھے کہ تپسیا یا مراقبے کے ذریعے یہ قوت جگانے پر آدمی محیرالعقول طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو وہ ولی بن جاتا ہے یا شیطان... واللہ اعلم!

دوسری خبریں یہ تھیں کہ بوریوں میں بند کچھ لاشوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ دن بھر بوریوں میں بند رہنے کی وجہ سے لاشیں یا ان کے ٹکڑے گھمس کھا گئے تھے۔ گوشت بالکل مرجھا گیا تھا۔ شخصِ مذکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر آدمی بنانے لگا۔ کچھ ٹکڑے سانولے اور کچھ گندمی رنگ کے تھے۔ آخر اُکتا کر اس نے گندمی رنگ کے بریدہ اعضا سیاہی مائل دھڑ کے ساتھ جوڑنے شروع کر دیے۔ پھر اس نے بازوؤں کی جگہ ٹانگیں اور ٹانگوں کی جگہ گردن یا کلائی لگا دی۔ پھر وہ اس کھیل سے اُوب گیا اور لاشوں کے ٹکڑوں کو واپس بوری میں بھر دیا۔

اب وہ پولیس کانسٹیبلوں کی لاشوں کی طرف آیا۔ وہ مونچھ دار پولیس والے اپنی وردیوں میں مرے پڑے تھے۔ دونوں کا سن تیس پینتیس سے کم تھا۔ اس نے ایک پولیس والے کی وردی اتارنی شروع کی۔

پہلے قمیص پتلون سے کھینچ کر باہر نکالی۔ پھر بٹن کھولے اور لاش کے سرھانے بیٹھ کر قمیص کو کھینچ کر سر سے اتار لیا۔ اندر سے ایک میلی سفید بنیان برآمد ہوئی۔ پسینے میں بھیگی اور خون سے داغدار بنیان اس نے ذرا کراہت سے کھینچ کر اتاری۔ پھر اس نے پتلون کی پیٹی کھولی۔ اب وہ لاش کی پائینتی کی طرف بیٹھا تھا۔ اس نے جوتوں کے فیتے کھولے، پھر جوتے اتارے۔ پولیس والے کے پیروں میں موزے بھی تھے۔ موزے اتار کر اس نے ایک طرف ڈال دیے اور باری باری دونوں ٹانگوں سے پتلون کے پائنچے کھینچ کر اتار دیے۔ اب لاش صرف ایک جانگیا پہنے پڑی تھی۔ شخصِ مذکور نے ایک کونے میں جا کر منھ چھپا لیا اور خوب ہنسا... اس نے طے کیا کہ وہ اس لاش کا جانگیا نہیں اتارے گا۔

اس نے جیب سے استرا نکال کر لاش کی مونچھیں مونڈ دیں۔ اب یہ لاش کسی بھی تیس پینتیس برس کے مرد کی لاش لگ رہی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں لاش کو اپنے کندھے پر ڈال کر تاریک کوٹھری سے نکلا اور ایک پیلی ٹیکسی میں پیچیدہ راستوں سے گزرتا ہوا اس کئی منزلہ عمارت تک جا پہنچا جہاں پختہ فرش پر ایک نوجوان کی لاش پڑی تھی۔

شخصِ مذکور نے ننگی لاش زمین پر رکھی اور بالائی منزل سے گرنے والے کی لاش کندھوں پر اٹھا لی۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی اور مشاقی سے کیا کہ لاش پر ماتم کرنے والوں کو لاش کے بدل جانے کا پتا بھی نہ چل پایا۔ وہ اسی طرح سر پر خاک ڈالتے، سینے پر دوہتڑ مارتے، روتے اور بین کرتے رہے۔

شخصِ مذکور ہڈیاں ٹوٹی لاش کاندھے پر ڈالے برق رفتاری سے اندھیری کوٹھڑی میں پہنچا۔ وہاں کئی دوسرے پولیس والے آ چکے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھا، ’’کون ہو تم؟‘‘

شخصِ مذکور نے بلا تامل جواب دیا، ’’میں یہاں کا چوکیدار ہوں سر!‘‘

’’اچھا،‘‘ ایک پولیس والا بولا، ’’تو پھر تم بتاؤ... یہاں ہم نے دو کانسٹیبلوں کی لاشیں رکھی تھیں اب صرف ایک ہے۔ دوسری لاش کہاں گئی؟‘‘

’’یہ رہی سر،‘‘ شخصِ مذکور نے کاندھے پر رکھی لاش زمین پر آہستہ سے لٹا دی۔

’’مگر... اس کے کپڑے؟‘‘ انھوں نے اعتراض کیا۔

’’آیئے ہم اسے وردی پہناتے ہیں،‘‘ اس نے جلدی سے کہا۔ وہ اس قدر مستعدی اور توجہ سے لاش کو کپڑے پہنانے میں منہمک ہو گیا تھا کہ پولیس والے چوں و چرا نہ کر سکے اور خود بھی وردی پہنانے اور

جوتوں کے فیتے باندھنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ ہڈیاں ٹوٹی لاش وردی پہننے کے بعد بالکل پولیس والے کی لاش لگنے لگی۔ دوسرے پولیس والے اسے بڑی تعظیم سے اٹھا کر لے گئے۔

شخصِ مذکور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا... پھر رانوں پر ہاتھ مار مار کر اس قدر ہنسا کہ ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا۔ حالانکہ وہ ڈر رہا تھا اور پوری کوشش کررہا تھا کہ اس کے ہنسنے کی آواز بلند نہ ہو، مگر یہ خیال کہ اس نے ماتم کرنے والوں میں گھپلا کر دیا ہے، اسے ہنسی سے دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کئی منزلہ عمارت سے پھینکا جانے والا نوجوان تو مہاجر ہوگا... اردو اسپیکنگ! اور یہ دوسری لاش... نہ جانے کس کی تھی۔ کہیں پہچان نہ لی جائے۔ یہ خیال آنے پر وہ چونک گیا اور کچھ بے چین ہوگیا۔ لیکن فوراً ہی وہ اپنے تردد کی حماقت پر ہنسا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لاشیں بول نہیں سکتیں، اس لیے مرے ہوئے آدمی کے بارے میں سرِمو اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ پنجابی تھا، سندھی تھا... یا اردو اسپیکنگ۔

شخصِ مذکور اپنے کامیاب کھیل پر خوش ہوکر ہندوستانی فلم ری وائنڈ کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اصل زندگی بالکل ہندوستانی فلم جیسی ہی ہے، بلکہ اسی کی طرح کئی بار کی دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اتنے میں بجلی چلی گئی۔ وی سی آر کھٹاک سے رک گیا اور پنکھا بھی بند ہوگیا۔ شخصِ مذکور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ اخبار میں بس اسی طرح کی خبریں تھیں۔ اداریہ بھی اس موضوع پر تھا کہ ''کراچی خون میں نہا رہا ہے۔'' اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بھاڑ میں جائے کراچی... کیا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہورہا؟

وہ دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر اس نے پوری دلجمعی کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ الفاظ اپنے منھ سے ادا کیے:

''کھڑکی... کی... جالی... پھٹ... گئی... ہے۔''

''سڑک... پر... ایک... بلی... جا... رہی... ہے۔''

''پردہ... ہوا... سے... ہل... رہا... ہے۔''

''میری... فاختہ... نے... دو... دن... سے... باجرا... نہیں... کھایا۔''

لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ جملے دہرا نہیں سکا۔ وہ واپس سونے کے کمرے میں آگیا اور کتابوں کے طاق پر نظر دوڑانے لگا۔ اس نے اپنے لیے ہندوستانی تاریخ کی ایک کتاب چھانٹی، کیونکہ وہ کوئی ایسی

کتاب پڑھنا چاہتا تھا جس کا کراچی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے، کم از کم تاریخ کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بستر پر نیم دراز، تکیے کا سہارا لیے، رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ کسی انگریز مورخ کی تحریر تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے کھولی تھی، اتفاق سے وہ کتاب کا ساتواں باب ''بنگال میں انگریز'' تھا۔

''مغلوں کے دور میں'' ... کتاب میں لکھا تھا... ''ہندوستانی کسان اس زمانے کے یورپی کسانوں سے بعض اعتبار سے بہتر حالت میں تھے۔'' اچھا؟ شخصِ مذکور نے آنکھیں مل کر تعجب سے یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آگے لکھا تھا: ''ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک اس زمانے کے یورپی کسانوں سے زیادہ مقدار میں ہوا کرتی تھی۔''

''اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بنگال کے ضدی نواب سراج الدولہ نے کمپنی بہادر کو کلکتے سے نکال دیا۔ کلائیو مدراس سے بھاری فوج لے کر آ وارد ہوا اور ۱۷۵۷ء میں اس نے کلکتہ دوبارہ فتح کر کے میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔''

''اور یہاں'' ... کتاب میں درج تھا... ''ہم کلائیو کی شخصیت کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں۔ گوریلا جنگ کا قابل رہنما، باصلاحیت سفارت کار، موقع ملنے پر لٹیرا بھی ثابت ہوا... کلائیو نے اور کمپنی بہادر کے اہلکاروں نے میدان صاف پا کر خوشحال بنگال کا خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ صرف خزانہ ہی نہیں خالی کر رہے تھے، وہ دیہات کو بھی لوٹ رہے تھے۔ چند ہی برسوں میں بنگال برباد ہو چکا تھا اور کمپنی بہادر، اہلکاروں کی بے راہ روی کے باعث، دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی...''

''تو پھر آئے وارن ہیسٹنگز۔ اب دیکھیے کہ ہیسٹنگز میں بھی نہایت اعلیٰ صلاحیتیں تھیں، مگر کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں تلخی آ گئی۔ وہ نند کمار کے قانونی قتل میں برابر کے شریک رہے، بنارس کے راجہ کو بہت تنگ کیا اور اودھ کی بیگمات کو ہراساں کرتے رہے۔ ان شکایتوں پر ان کے حریفوں کی بن آئی اور انھیں برطرف کر دیا گیا...''

پسینہ پونچھتے پونچھتے شخصِ مذکور نے شدید غم و غصہ محسوس کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلائیو اور ہیسٹنگز کو گالیاں دیں... ''حرام زادے... کتے کے بچے... انھیں کیا حق پہنچتا تھا... کیا حق...'' لیکن وہ اس گرم کمرے میں رکھی سر کٹی لاش کا کیا کرے، یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

پسینہ بہہ بہہ کر اس کی گردن سے قمیص کے اندر ٹپک رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اور پھر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ سر کٹے کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ زانو پر ہاتھ مارا: واہ استاد! یہ تو تم نے لاجواب کام کر دیا... سر کٹی اور عضو تناسل کٹی لاش! یہ تو سچ مچ کا گھپلا تھا۔ آناً فاناً شخصِ مذکور نے لاش کو کاندھے پر ڈالا اور سرحد کی جانب چل پڑا۔

سرحد پر تعینات افسران نے اس سے پوچھا، ''آپ اس سر کٹی لاش کو کہاں لے جا رہے ہیں؟''

شخصِ مذکور منھ چھپا کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا، ''سرحد پار... لوگوں کو الو بنانے۔ بھئی دیکھیے وہاں ہندو مسلمان کی پہچان یہی (ہاتھ سے کٹی ہوئی جگہ پر اشارہ کر کے) تو ہوتی ہے۔ پجامے کھول کھول کر دیکھتے ہیں بھئی پجامے کھول کھول کر... تو اب آپ دیکھیے گا۔ ہندو مسلمان سکھ، تینوں کو الو بناؤں گا۔ ذرا اس لاش کو دیکھیے... اس کا وہ ہی نہیں ہے! تو اب یہ ہے کیا؟ بس بالوں بھرا ایک سانولا سابق ہندوستانی... یعنی اب تو ہندوستان پاکستان بنگلہ دیش ہے نا... تو ہم... ہم اسے نند کمار کی لاش بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو جائیے۔ خدا کی قسم وہ مزا آئے گا کہ ہنستے ہنستے ہم پاگل نہ ہو جائیں تو میں مونچھ منڈا دوں گا۔'' شخصِ مذکور نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پسینے سے بھیگ کر اس کے ہونٹوں پر چپکی جا رہی تھیں۔

''نند کمار؟'' افسران نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کون ہے؟''

شخصِ مذکور نہیں جانتا تھا کہ نند کمار کون تھا اور وارن ہیسٹنگز اس کے قانونی قتل میں کیوں شریکِ کار رہا۔ انگریز مورخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔

اس نے الجھ کر کہا، ''ہوگا کوئی... آپ کو اس سے کیا؟''

سرحد پر تعینات افسران نے متانت سے کہا:

''آپ سرحد پار کے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا، آپ کے نیک جذبات بہرحال اپنے وطن اپنی قومیت، اپنی قوم پرستی کے حق میں تھے۔ لیکن اس طرف قدم رکھتے ہی آپ کی قوم پرستی، حب الوطنی اور قومی وفاداری پر فی الفور آنچ آ جائے گی۔''

اب کی بار شخصِ مذکور ہنسا نہیں — وہ رونے لگا۔ سر کٹے کے کٹے ہوئے، گم شدہ عضو کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے کہا، ''یہ کہاں گم ہو گیا؟''

ایک کھمبے کے سہارے نہ جانے کب سے ایستادہ، قوم، قومیت، قوم پرستی، قوام یا قمقمہ نامی، روئی کی وہ قد آدم

گڑیا جس کے منھ پر دھاگے سے نمک پارے جیسی سیاہ آنکھیں اور سرخ شہوت بھرے ہونٹ کڑھے تھے، جس کی روئی ٹھنسی، بے تحاشا ابھری ہوئی لذت خیز چھاتیوں کی سرخ بھٹنیوں سے وی سی آروں، فریجوں اور ایئر کنڈیشنروں اور پجیرو گاڑیوں کے دودھیا دھارے بہہ رہے تھے، اور جو کثرتِ استعمال سے... بے طرح پھٹ گئی تھی اور ان چاکوں سے روئی نکل نکل کر زمین پر گر رہی تھی، اچانک شخصِ مذکور پر آ گری۔

شخصِ مذکور اچانک قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس نے گڑیا کے سیاہ دھاگوں سے بنے الجھے بالوں کا گچھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

''تو بتا سالی... زنا بالجبر ہوا تھا کہ نہیں؟''

کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟ (حصہ اوّل)

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم ایک مسلح آمرانہ نظام کے غیر مسلح، عوامی گروہوں کے نمائندہ جمہوری نظام میں تبدیل کیے جانے کی کوشش کے انتہائی تکلیف دہ، پُر پیچ اور ناہموار زمانے کا نظارہ کر رہے ہیں؟ جبکہ پرانے نظام کے ستون لڑکھڑا کر ہمارے سروں پر گر رہے ہیں اور ہم گردن تک اوبڑ کھابڑ ملبے میں دفن ہو رہے ہیں؛ جبکہ ماضی، حال اور مستقبل کے طاقتور ہاتھ معاشرے کو بے دردی سے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، جھنجھوڑ رہے ہیں، جیسے گرجتی ہوئی طوفانی ہوائیں کسی تناور درخت کو جھنجھوڑ کر جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

اس جان لیوا کش مکش میں جیت کس کی ہوگی؟ کیا ان جمہوری رجحانات کی جو بے حد کمزور ہیں، جو بیک وقت کسی نوزائیدہ بچے کی مانند بے طاقت اور کسی گرم و سرد زمانہ چشیدہ بڈھے کی طرح کرپٹ ہیں؟ یا ماضی کا سر برآوردہ، فربہ عضلات والا آہنی ہاتھ ان پر غالب آ جائے گا؟

خیالوں کی اُڑان میں ایک خاموش، سرد، طویل رات میں بستر میں کروٹیں بدلتی عورت نے سوچا تھا۔

اور اس بحث سے دور، بالکل لاتعلق ایک آدمی... پوری عمر کا آدمی... رو رہا تھا۔

''ارے!'' وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''رو کیوں رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں...'' اس نے سرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا:

''اتنی... اتنی بے روزگاری ہے...''

''کیا؟'' اس نے بھونچکا ہو کر کہا تھا۔

اور پھر وہ ایک نیند میں ڈوب گئی تھی، اور اس نے ایک بہت بڑے، گراں ڈیل، تیل کی سیاہ کیچڑ میں لتھڑے، بھاری پہیے کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو آہستہ آہستہ نہ جانے کس طرف جا رہا تھا؛ اور جس کے نیچے اَن گنت آدمیوں کی ہڈیاں پس رہی تھیں، کھوپڑیاں پھٹ کر مغز اُبل رہے تھے، خون کے فوارے کالی کیچڑ میں ملتے جا رہے تھے؛ بازو، ٹانگیں، دھڑ کٹ کٹ کر پہیے کے راستے کے اِدھر اُدھر پھسل رہے تھے۔

یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے خواب میں کہا تھا، اور سوچا تھا کہ اس کے وطن میں ماضی، حال اور مستقبل کے ہاتھ کیا تین مختلف ہاتھ ہیں؟ یا یہ ایک ہی ہاتھ ہے جو وقت کے تین مقامات سے کسی طلسم کے طور پر نمودار ہو رہا ہے؟

''کسے بے کسور نوں نئیں پھڑ رئے،'' چودھری اکرام نے دردمندی سے کہا، ''اِناں دا اپنا دھندا وی ایہوای سی۔ جسم دے نازک حصّاں تے ڈرل کرنا، اکھاں تے دند کڈھ لینا۔ ایہو سب کم ایہہ کر دے سن۔ اناں دی اپنی دوائی دا اگّو ڈوز دے رئے آں، ہور کجھ نئیں کر رئے بادشاہو!''

''پر... چودھری صاحب... ایہہ تے باقاعدہ سیاسی تنظیم اے... ایس داماس بیس... اناں دے نال مذاکرات...''

''اووی کراں گے، خاطر جمع رکھو،'' انھوں نے دل جمعی سے تسلی دی۔

''مذاکرات؟''

''آہو، کیوں نئیں کراں گے؟ او بئی، کجھ تسلی تے رکھو!''

''تے ایہہ لوکی...''

''آہو آہو، آپنے ای تے منڈے نیں ایہہ سب۔ بس برین واش کر دِتا گیا اے۔ تے نالے ہن انڈیا دے پھندے وچ آ گئے نیں۔ ضرور کراں گے مذاکرات اناں دے نال۔ پر ساڈی پوزیشن سٹرانگ ہونی چاہیدی اے ناں۔ اناں دا ملی ٹنیٹ وِنگ ختم ہو جاوے تے فیر مذاکرات وی ہون گے۔''

''ہچھا!'' سوال کرنے والوں نے امید بھری نظریں چودھری صاحب کے چہرے پر لگا دیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ روتی دھوتی آواز میں چوں چرا کرنے لگے۔

''پر ویکھو ناں... ایہہ گلاّں تے تسیں شاید ہمیشہ توں کر دے آئے او۔ اوہ جیہڑے ایسٹ پاکستان

وچ ہزاراں، لکھاں قتل کیتے گئے سن... اووی تے ساڈے اپنے ای بندے سن۔ بس برین واش ہو گئے سن، تے فیر... فیر انڈیا دے پھندے وچ آ گئے سن... فیر بلوچستان وچ پنڈاں اتے بمباری کیتی گئی سی۔ ایس توں پہلے کئی بلوچ لیڈراں نوں پھاہی دے دتّی گئی سی... تے فیر ایہہ سب... ایہہ سب...'' وہ خرخرائے۔

''ایسٹ پاکستان وچ تے ہندواں نے وڈی سازش کیتی سی۔ تے بلوچ سرداراں داوی دماغ خراب کر دتا گیا سی۔ علیحدگی پسند ہو گئے سن سب۔ تے باہروں امداد وی آوندی سی۔''

یہ سن کر وہ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ''باہروں امداد؟ آخر دنیا ساڈی دشمن کیوں ہو گئی اے؟ روس ساڈا دشمن۔ انڈیا تے ہے ای دشمن۔ چین تے امریکہ دوست نیں، تے او تاریخ دے زیادہ تر حصے وچ اک دوجے دے دشمن۔ عرب ساڈا ساتھ نئیں دیندے۔ وقت پوے تے امریکہ مدد نئیں کردا، تے اپنے وطن آلے واری واری پاگل پن دا شکار ہو جاندے نیں۔ ساڈے دشمن اناں دی خفیہ امداد کردے نیں۔ آخر کیوں؟ اساں دنیا دا کیہہ بگاڑیا اے؟''

یہ سن کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ انھوں نے آہ بھر کر کہا، ''سچ کہندے او یارو۔ او کنا سوہنا تے بروقت کہیا سی غالب نے: یا رب زمانہ مینوں مٹاوندا اے کیس لئی۔ ایس لوحِ جہاں دی میں تکا بوٹی کیوں نہ کر دیاں...''

کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟ (حصہ دوم)

لیاقت آباد کی ایک بلند و بالا، کئی منزلہ عمارت کی آڑ سے پیلا ماہتاب نکلا۔ (واہ! اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب! اسرار الحق مجاز یاد آ رہے ہیں۔) یہ ماہتاب، کچے سونے کا سا، بادلوں کے ننھے سفید ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیلتا، معصوم نگاہوں سے سارے شہر کو دیکھ رہا ہے۔

اس دن اس عمارت میں پانچ (یا چھ، سات؟) مسلح افراد نے گھس کر اکٹھے دس قتل کیے تھے۔ یہ قتل کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اس شعبے کے دفتر میں ہوئے تھے جو جائیدادوں کی فروخت اور مالکوں کی تبدیلی وغیرہ کا اندراج کرتا ہے اور جائیدادوں کے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ شعبۂ ہذا میں دس افراد تڑ تڑ تڑ آناً فاناً مقتول ہو گئے۔

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

جائیدادیں... مکانات... دکانیں... محل دو محلے... مٹی، گارا، اینٹیں، پتھر... زمین... زمین... زمین کے بیٹے... زمین کے بھائی... زمین کے باپ، معشوق، گاہک... دلال... زمین کے چچا، بھتیجے... زمین کے ماموں... زمین کے مالک... زمینوں کے مالک... صاحبِ جائیداد...

رات کو قومی ٹیلی وژن پر کہا گیا کہ یہ تو معتوب لسانی تنظیم کی کارستانی ہے۔ بلکہ شام ہی کے اخباروں میں چشم دید گواہوں کی زبانی قاتلوں میں سے چند کے نام بھی شائع ہو گئے جنھیں اخباروں میں شائع شدہ (داخل شدہ؟) خبر کے مطابق علاقے کے دکانداروں نے پہچان لیا تھا۔

بہتے ہوئے آنسو تھم نہ سکے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

یہ قتل کس نے کیے؟

کیا قومی ٹیلی وژن کی خبر درست ہے؟ کیا علاقے میں تنظیم ہٰذا کے لڑکوں نے بھتہ وصول نہ ہونے کے باعث یہ قتل کیے؟

ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ حالانکہ موچڑوں میں آنے کے بعد سے تنظیم ہٰذا کے لڑکے زیادہ تر دفاعی لڑائی لڑے ہیں۔ مگر اس طویل عرصے میں غیر حل شدہ مسئلے کی معروضی صورت حال ایک کایا کلپ سے بھی گزر چکی ہے۔ شہر کے علاقوں کے خالص مقامی گروہی مفادات، اور قتل در قتل در قتل کے باعث ذاتی انتقامی جذبات بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ قتل بھتہ نہ دینے کی سزا ہوں۔

عین ممکن اَور بھی بہت کچھ ہے۔ جیسا کہ سڑک پر ایک سنکی اَدھڑ وٹ نے اول فول بکتے ہوئے کہا، ''اماں ہوش کی دوا کرو! اگر وہ قاتل ایسے ہی زور آور ہیں تو دہشت نہیں ہوگی ان کی؟ اسی علاقے کے دکانداروں نے موقعے پر نام بھی بتلا دیے؟ اور وہ... کیا کہتے ہیں کہ... اخباروں میں بھی آ گئے؟ شام کی شام؟ آ ئیں؟ میاں یہ گولیاں کسی اور کو دینا... ہم بھی گندم کھاتے ہیں...''

تو پھر یہ قتل کس نے کیے ہوں گے؟

اس دن کراچی میں کل اٹھارہ قتل ہوئے تھے۔

آسمان کتنا حسین ہے، اور چاند کس قدر خوبصورت! لہٰذا فٹ پاتھ پر ایک پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے آدمی نے چاند کو بڑی دیر تک بہت غور سے دیکھا۔ نظر اٹھا کر ہر طرف دیکھیں تو کراچی آپ کو ایک

پاگل، جنونی عورت سا نظر آئے گا جس کے بال منہ پر بکھرے ہوئے ہیں اور جس نے منہ پر خون مل لیا ہے اور جو چاند کی طرف منہ اٹھائے کسی مادہ بھیڑیے کی طرح چنگھاڑ رہی ہے۔ مگر اس پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے بوڑھے نے نظر اٹھا کر چار طرف نہ دیکھا بلکہ اپنی نظریں مضبوطی سے چاند پر جمائے رکھیں۔ سنہرا ماہتاب آسمان کی گہری نیلی، دوات میں بھری روشنائی کے رنگ کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ اتنے خطرناک حالات میں بھی، چاند کے بلند ہوتے سمے، جب رات بھیگ چلی، بوڑھا فٹ پاتھ پر کیوں؟ دراصل اس کے پاس جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یعنی یہ رہتے ہی یہاں ہیں۔ آپ انھیں نہیں جانتے، مگر میں جانتی ہوں۔ ان کا نام رئیس میاں ہے۔ طارق روڈ کے بالکل عقب میں جو پنساری بازار ہے، جہاں سوئی سے لے کر بکرے تک فروخت ہوتے ہیں، وہیں یہ ایک ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن اور کھلونے بیچتے ہیں۔ صبح کے وقت یہیں سجاد پہلوان کی دکان پر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ ایک جمعے کی پُرفراغت صبح، سجاد پہلوان کی دکان سے بچوں کے لیے حلوہ پوری بندھواتے ہوئے میری ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

پتا چلا کہ رئیس میاں سابق مشرقی پاکستان سے آئے ہیں (جہاں وہ گورکھپور، مشرقی یو پی سے گئے تھے)۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تمام رشتے دار، بیوی، بیٹے، بہو، پوتے پوتیاں، وہیں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (کیوں؟ کیسے؟ یہ سب پوچھنے کا تو موقع نہ تھا۔) سو وہ سر پر میلی دوپلی ٹوپی منڈھے اور کھلے پائنچوں کا پجامہ کرتا پہنے، ایک اکیلی جان ہی کراچی وارد ہوئے، اور اب اپنی ریڑھی پر ہی رہتے ہیں۔

لہٰذا اس رات بھی سنسان گلی میں، جب تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور کتے بلیاں بھی مٹھائی کے دونے چاٹ کر اِدھر اُدھر سو چکے تھے اور بازار میں تبدیل ہو جانے والے اس سابقہ رہائشی علاقے کی، تجاوزات کی بھرمار سے نہایت تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں باقی بچے بالائی منزل کے مکانوں کی بتیاں نہ جانے کب کی گل ہو چکی تھیں، بوڑھا اپنی ریڑھی پر پیر پسار کر لیٹ گیا اور میلے بازار پر کندن کے تھال سے دمکتے برنجی ماہتاب کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ سنہری چاندنی اس کی بوڑھی آنکھوں میں تحلیل ہوگئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

تب اسے علم ہوا کہ دراصل چاندنی اس کی آنکھوں میں نہیں کھلی بلکہ وہ خود چاندنی میں تحلیل ہو گیا ہے اور ایک ایسے مقام پر ہے جہاں ہر طرف ٹھنڈی، دلکش سنہری روشنی پھیلی ہے۔ وہ ایک بہت بڑے لق و دق میدان میں کھڑا ہے۔ دور دور تک سنہری زمین پھیلی ہے۔

''کیا یہ کراچی ہے؟'' رئیس میاں نے مدھم سانسیں لیتے ہوئے پوچھا۔

فضا میں پروں کی ہلکی پھڑ پھڑاہٹ نے ان کو جواب دیا، ''ہاں، یہ کراچی ہے... آج کا کراچی، جو کل کا کراچی بنے گا۔''

بوڑھے نے آنکھوں پر زور ڈال کر پہچاننے کی کوشش کی، لیکن طویل وعریض میدان دوسرے میدانوں میں پگھلنے لگے۔ رئیس میاں کو محسوس ہوا کہ وہ کسی آواز سے تیز رفتار برقی سواری میں فاصلوں پر سے گزر رہے ہیں اور کہیں کہیں پہچان پا رہے ہیں کہ وہ ضلع ملیر سے لانڈھی، کورنگی، سرجانی ٹاؤن جا پہنچے ہیں یا نیو کراچی، منگھوپیر، سبزی منڈی سے گزر رہے ہیں جہاں چاندنی کے میدان در میدان خالی پڑے ہیں۔ آخر ایک سنہرے میدان میں ان کا راکب رک گیا۔ سفید براق سے اسپِ تازی کو رئیس میاں نے ایک آہنی میخ سے باندھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے ہر دو کناروں پر چند جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔

رئیس میاں نے پاس جا کر دیکھا۔ یہاں طبقۂ اناث میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف مسلح مرد تھے۔

''آپ کون ہیں؟'' رئیس میاں نے لجاجت سے استفسار کیا۔ ان میں سے ایک نے سرخ آنکھوں سے انھیں گھورا اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا، ''تم سے مطلب؟'' پھر اس نے دھمکایا، ''اپنا راستہ لے بڈھے!''

تبھی پولیس کی ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ جیپ میں سوار پولیس افسر نے شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے جھانکا اور شفقت سے جھونپڑی کے مکینوں سے مخاطب ہو کر کہا، ''کیوں بھئی، ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟''

''جی ساب، بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کا کرم ہے جناب!'' جواب ملا۔

''ٹھیک ہے... تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کوئی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو ہمیں بتانا۔'' اس کے بعد جیپ دھول اڑاتی اسٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی شہر کے بارونق علاقوں میں جا پہنچی۔ پھر وہ کئی جیپوں میں بدل گئی اور کئی پُرتمکین عمارتوں کے سامنے رکی جہاں باوقار تعمیرات اور دیگر کاروباری اداروں کے بورڈ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی ''قبضہ گروپ'' یا ''لینڈ گریبرز ایسوسی ایٹس'' کے نام کی تختی آویزاں نہیں تھی، مگر نام میں کیا رکھا ہے! تھانوں کو ماہانہ تو یہ ادارے کسی بھی مد میں دے سکتے ہیں۔

زمینوں پر قبضہ اس طرح بھی کیا جا رہا ہے۔ زمین کے ٹکڑے کی آؤٹر پوسٹ پر مسلح افراد کی جھونپڑیاں بنوا دی جاتی ہیں۔ قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقتور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

''کون لوگ زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں؟'' عورت نے الٹی سانسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا۔

اس رات پیلے ماہتاب کو تکتے ہوئے وہ پھر ہوائی جہاز میں جا بیٹھی تھی جہاں اس نے ایک الوہی انٹرویو دیا تھا اور اس سوال کو ہذیان کی طرح دہرایا تھا کہ ''کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟'' لیکن اب یہ جہاز لندن جانے کے بجائے چاند کی طرف اڑا جا رہا تھا، اور چاند پر پہنچ چکا تھا۔

اسے سینے سے لگا کر جواب دینے والے بوڑھے نے، جو شاید خدا تھا، اس سے کہا:

''قبضہ کرنے کے لیے قوتِ بازو استعمال کرنے والے ہتھیار بند معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ یہ قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کروڑوں روپے نہیں کماتے، مگر رقم ان کو بھی خاصی ملتی ہے۔''

''کیا یہ کراچی کے لوگ ہیں؟'' عورت نے پوچھا۔

''اب تو کراچی کے ہیں،'' بوڑھے نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔ ''الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کر رہے ہیں — ہاکس بے میں بلوچ ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں (حیران نہ ہونا) بنگالی یہ کام کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروفِ کار ہیں۔''

''ہوں...'' عورت نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی، ''سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟''

بوڑھا ہنسا۔ (کیا وہ خدا تھا؟) ''ہیں تو سہی...'' اس نے کہا۔ ''گلشن اقبال سے گلستان جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں: پنجابی ہیں، پٹھان ہیں، اور ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہو رہے ہیں۔'' وہ پھر ہولے سے ہنسا۔

''تو کراچی میں یہ بھی ہو رہا ہے؟'' عورت نے چاند پر استقامت سے نظریں جما کر کہا۔

''ہاں، یہ بھی،'' کسی نے جواب دیا، ''کہیں زیادہ سفاکی کے ساتھ... کیونکہ افراتفری اور سیاسی بدامنی کے زمانے میں ہر واردات سیاسی مخالف گروہ کے سر آسانی سے تھوپی جا سکتی ہے...''

''پھر ڈرگ مافیا ہے... جو عرصۂ دراز سے ہتھیاروں کی فروخت کا کام بھی کر رہا ہے،'' بڑے میاں نے کہا۔

''ہوں...'' عورت اب پھر ایک دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔

خواجہ اجمیر نگری اور قصبہ کالونی میں پٹھان مہاجر فسادات سے کراچی خون میں نہا گیا ہے۔ یہ ٹکراؤ لسانی صرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرگ مافیا نے

پورے شہر کو یرغمال بنالیا ہو، کیونکہ بعض واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تین رپورٹیں وہ اس انگریزی اخبار کو بھیج چکی ہے جس میں ان دنوں وہ کام کر رہی ہے۔ چوتھے دن ٹیلی فون پر دور، بہت دور سے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز...

''بی بی، آپ یہ لفظ ڈرگ مافیا اب نہ لکھیے۔''

''کیوں کیوں، ایڈیٹر صاحب؟'' اس کی حیرت...

''بھئی یہ پشاور ہے... ڈرگ مافیا سے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پٹھانوں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔''

خاموشی... اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا پلاسٹک کا ٹھنڈا ریسیور...

''سمجھ گئیں نا بی بی؟''

ہتھیار اور منشیات... شہر کی شہ رگ میں رواں... پیسہ، بہت زیادہ پیسہ... کروڑ؟ دس کروڑ؟ یہ تو معمولی رقمیں ہیں۔ اس سے بہت زیادہ۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچلنے کے لیے ہتھیار... جو فروخت بھی ہوتے ہیں۔

کیسی رکاوٹ؟ جب کہ یہ روزِ محشر ہے اور عالمِ نفسا نفسی۔ اور جبکہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسہ بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سفر کی ابتدا کرتے اور چاندی کی چھتر چھایا میں پورے صوبہ سرحد، پورے صوبہ پنجاب اور پورے صوبہ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیار مطلوبہ مقام تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ کہتے ہیں ساڑھے تین لاکھ میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں، جدید ترین ماؤزر، ٹی ٹی، کلاشنکوف، بم حتیٰ کہ دور مار میزائل بھی۔

آپ کو یقین نہیں آتا؟

کراچی میں لڑکوں نے میزائلوں سے نشانوں پر گولے برسائے ہیں۔ نشانہ لگانا ابھی انھیں نہیں آتا۔ پھینکتے کہیں تھے اور گولہ کہیں جا گرتا تھا۔ زیادہ تر ان کا نشانہ رینجرز اور پولیس تھانے تھے، مگر گولے انھوں نے کہیں اور برسائے۔

''کیونکہ کراچی میں یہ بھی ہوتا رہا ہے...'' بوڑھے نے کلام جاری رکھا۔ ''مبینہ طور پر...

''مبینہ یہ ہے کہ حقیقی کے لڑکے ایم کیو ایم کے لڑکوں کو قتل کر رہے ہیں۔ باقی سب بھی مبینہ ہے۔

''اس جھپیٹ میں وہ ذاتی دشمنوں یا جن سے کبھی تو تکار ہوئی ہو اُن کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ کیونکہ جب ہتھیار اٹھارہ انیس برس کے لڑکے کے ہاتھ میں ہے تو وہ بادشاہ ہے اور اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کرسکتا ہے۔ وہ بھتہ وصول کررہے ہیں اور بھتہ نہ دینے پر بھی قتل کر رہے ہیں۔

''رینجرز اور پولیس (یہ بھی مبینہ ہے) ایم کیوایم کے لڑکوں کو اذیت پہنچا کر قتل کر رہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کسی کو ماردیں تو پوچھنے والا کون ہے؟ مبینہ طور پر یہ بھی بھتہ وصول کر رہے ہیں۔ گھروں میں گھس کر لوٹ مار کررہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے جو چودہ پندرہ برس کے تھے۔ یہ 'نا معلوم مقامات' پر رکھے گئے ہیں۔ (مبینہ طور پر) رہا کرنے کی رقم پچیس ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔

''ذرا صبر سے سنو... یہ اُکتا دینے والی طویل فہرست ہے...'' بوڑھے نے کہا۔ ''ایم کیوایم الطاف گروپ کے لڑکے (مبینہ طور پر) حقیقی کے لڑکوں اور پولیس اور رینجرز کو قتل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بھتہ وصول کر رہے ہیں اور بھتہ نہ دینے پر قتل بھی کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذاتی دشمنوں یا جن سے کوئی تو تکار ہوئی ہو انھیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔

''اور یہ سب، یعنی پولیس، رینجرز، ایم کیوایم حقیقی اور مجازی، اپنے ان ایجنٹوں اور کارکنوں کو بھی قتل کررہے ہیں جو اب ان کے کام کے نہ رہے ہوں یا خطرناک بن چکے ہوں۔ ان کے نام پتے یہ ایک دوسرے کو فراہم بھی کر دیتے ہیں۔ قتل کرنے والے متحاربوں میں رفتہ رفتہ ایک طرح کا رازدارانہ تعاون پیدا ہوگیا ہے۔ کیونکہ بھتے... موٹی موٹی رقمیں... اس گھومتے چکر کا مرکز ہیں۔ لہٰذا کچھ تمھارا کچھ ہمارا کی بنیاد پر، جو کہ گروہی مفادات کے تعاون کی بنیاد ہے اور جس کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں...''

اس پر ایک آدمی ہذیان میں چلاّیا، ''کیا بک رہے ہو... کیا بکواس کررہے ہو؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے... یہ جھوٹ ہے... جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ...'' منہ سے جھاگ اگلتا وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

''کیا جھوٹ ہے؟'' بوڑھے نے تھکاوٹ سے پوچھا۔ ''یہ کہ اس شہر کے ساتھ، اس کے باسیوں کے ساتھ، اس قدر گھناؤنا، پرت در پرت خون سے تر، سازش اور سفاکی سے غلیظ، مکروہ جرم مہینوں، برسوں سے کیا جارہا ہے؟''

''ہاں!''

''اور کوئی کچھ نہیں کہتا؟''

''ہاں!''

اس پر انگریزی کے ایک صحافی نے انگریزی میں نہایت تیز رفتاری سے کہا، ''اور یہ سب کچھ اس لیے آسانی سے ہو رہا ہے کہ ایم کیو ایم، پی پی پی اور اسٹیبلشمنٹ سمجھوتا نہیں ہو رہا۔''

اس پر اس کے رخساروں پر تین چار چانٹے مارے گئے۔ ''چپ سالا سمجھوتے کا پتر۔ ہمارا دھندا مندا کرنے آ گیا۔ چلے آتے ہیں ٹھیکے دار۔ نہ کھیڈ ساں نہ کھیڈن دے ساں کے مصداق...''

بھئی ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے — اس سے فیض یاب کیوں نہ ہوا جائے؟ اور یہ دریا ہمیشہ، یا کم از کم چند برس اور، کیوں نہ بہتا رہے؟

اسی دریا کے کنارے کھڑے ہیں سندھی بھی۔ نئے نئے جوان یہ بھی ہوئے ہیں۔ لٹھے کی کانچ قمیصیں پہنے، کاندھوں پر اجرک ڈالے، اپنی دھرتی کی مٹی اور مکھن کی مہک سے سوندھے، حیرت سے تموّل کے اس بہتے دریا کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنا پیسہ؟ اس میں ان کا حصہ کہاں ہے؟ ہتھیار تو وہ بھی چلا سکتے ہیں... وہ کسی سے کم تو نہیں... مرد کے بچے ہیں!

مگر کراچی میں وہ کیسے بھتہ وصول کر سکتے ہیں؟ بھتے کا بھی ایک ''حلال'' جواز تراشا جاتا ہے — اسے ''پروٹیکشن منی'' کہا جاتا ہے۔ تو یہاں وہ کسی کو ''پروٹیکٹ'' کرنے کا سوانگ کیسے رچائیں؟ لیکن حیدرآباد میں، جہاں سندھی بھی ۵۰ فیصد ہیں، انھوں نے بے ہتھیار سندھیوں کو ''پروٹیکٹ'' کرنا شروع کر دیا ہے اور وافر مقدار میں سندھیوں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔

رات گئے ایک اکیلی، سنسان گلی میں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے بیمار زرد روشنی میں ایک چھریرا پولیس والا، جس کی پتلی کمر کسی ہوئی پیٹی میں بل کھا رہی ہے، کلے میں گلوری دبا کر نزاکت سے سگریٹ سلگاتا ہے اور مخمور نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے ماچس پھینک کر گنگناتا ہے:

''ہم کو دعائیں دو... ارے ہم کو... دعائیں دو تمھیں... قاتل بنا دیا... آ آ آ... ہم کو...''

خون مالیدہ چہرے والی عورت چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مادہ بھیڑیے کی مانند زور سے چنگھاڑی اور

سنسان گلی میں گونجی۔

''کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟''

کراچی میں کل کے طبقات کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، جو موجودہ اتھل پتھل میں تمھاری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس دھکم پیل میں، اس گھمسان میں جو دردِ زہ کی طرح ایک لاوارث شہر کو جھنجھوڑ رہا ہے، کل کا طبقۂ اشرافیہ جنم لے رہا ہے۔ وہ لوگ جو آج داؤں مار لیں گے انھی کے خاندان کل صاحبِ حیثیت ہوں گے۔ اشرافیہ میں نئے نام اور ذاتیں شامل ہوں گی... نیا نکور بالائی طبقہ پیدا ہوگا۔

کراچی میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی، انسانی معاشرے کے طبقات بننے کی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ پرانے اشرافیہ نے جاگیریں اور مِلیں اخلاقیات پر مضامین لکھ کر حاصل نہیں کی تھیں۔ یہ کھیل خونریزی کے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

کراچی سہا ہوا... کراچی خون میں نہایا ہوا... شام کے اخباروں میں مقتولوں کی تصویر... کرسی سے لڑھکتا ہوا کوئی آدمی... جیسے مکر کر رہا ہو، اداکاری کرتا ہو مرنے کی، قتل ہونے کی...

بوڑھے نے اسے اپنے سینے سے لگا کر سختی سے بھینچا اور کہا: ''سنو...''

وہ سُن سی لیٹی رہی، چاند کو گھورتی۔ پھر بوڑھے نے کہا:

''انسان میں اور دوسرے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گوشت بھنبھوڑنے سے پہلے اور بعد میں آدمی واویلا بہت کرتا ہے، ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔ آئے ہائے! یہ ہم نے کیا کیا! (اکثر کہتا ہے: یہ تم نے کیا کیا!) انسانیت کا خون کر دیا! ننھے ننھے بچوں کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا! (اپنے دہن سے خون پونچھتے ہوئے) عورتوں... میں سنگینیں اتار دیں۔ بھوں بھوں... رونا... سسکیاں... جب کہ اس کا آدھا دماغ زمان و مکاں کے کسی بھی منطقے میں ٹھہرائے گئے حریف کو نیچا دکھانے کی تازہ تگڑم سوچ رہا ہوتا ہے: سالے تیری مُنڈ یا نہ جب تک رگڑ دوں خاک میں...

''پھر متعدد قتل کرنے کے بعد چھینی ہوئی اپنے حصے کی روٹی — یا ایسی روٹی جس پر اس کے خیال میں دراصل اس کا حق تھا — کھانا اسے اچھا بھی نہیں لگتا۔ یہ ابھی تک خون میں تر ہوتی ہے۔ وہ اسے اُگل اُگل کر کھائے گا۔ زمین پر لوٹیں لگائے گا۔ درختوں پر جھولا ڈال کر جھولے گا۔ بارش میں نہائے گا۔ پھر

آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا: آہ! دھنک کس قدر حسین ہوتی ہے! اس پر کچھ شعر لکھے گا...''

''ہم...'' عورت نے کہانی سنتے سنتے ہنکارا بھرا اور ایک لمبی، ٹھٹھری سانس لی۔ اسے دارالسلطنت میں کی گئی اپنے دوست سے گفتگو یاد آئی۔

وہ کرسی میں منجمد بیٹھا تھا۔ اس نے کہا، ''صرف کراچی ہی کیوں؟ پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا کو دیکھیے۔ یہ نام نہاد اکیسویں صدی نسلی تنازعات، خوں ریزی اور تعصب سے عبارت ہوگی۔'' پھر اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا:

''کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟''

''کیا وہ بالکل برباد ہو جائیں گے؟'' عورت نے مسحور ہو کر دہرایا۔

''یقیناً!'' اس کے دوست نے کہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

عورت سوچ میں پڑ گئی۔ آیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بدلے (بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟ مضبوطی سے نظریں اس طرف جمائے رکھنی چاہییں؟ یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے۔ اس نے کرسی پر دیر سے خاموش بیٹھے، بہت تنہا لگتے اپنے عزیز مارکسی دوست پر نظر ڈال کر سوچا۔ ملکی متحارب لوگوں کے عتاب سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رضا ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی کی گندی بحث میں الجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرونِ ملک کی جانے والی نت نئی سازشوں پر خامہ فرسائی کریں۔

مگر عورت کو تو کراچی واپس آنا تھا اور ایک مادہ بھیڑیے کی چنگھاڑ سننی تھی۔

لہٰذا اس نے اپنی نظریں اس رات کے پیلے ماہتاب پر گُھبا دیں جہاں رئیس میاں چرخا کات رہے تھے۔

''پنجابی... سندھی... مہاجر...''

وہ اپنی سانسوں میں بڑبڑائی۔ اور اچانک وہ کسی دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔ غالباً ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء کی ایک کالی گھپ، اماوس کی رات... ایک ریل گاڑی پوری آواز سے رات کی بھیانک تاریکی میں

داخل ہوئی اور دھڑدھڑاتی ہوئی اندھیرے میں سے گزرنے لگی۔ اس کے ایک ڈبے میں دونو جوان لڑکیاں خوف سے لرز رہی ہیں۔ انھیں حیدرآباد سندھ کے قریب، سندھو ندی کے کنارے بنی بستی جام شورو جانا ہے۔ یہ لڑکیاں کس قوم یا قومیت کی ہیں؟ آپ انھیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں... ماں مہاجر اور باپ پنجابی۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرست طلبا تحریک کا زور ہے۔ چند دن پہلے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں سندھی قوم پرستوں نے اشتعال میں آکر ایک پنجابی آبادگار کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ خبر تھی کہ اس گھر کی جوان لڑکی کے ساتھ زنا کر کے اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی، اس طرح کہ اس کے ... ایک کھردری لکڑی گھسی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ اس ڈبے میں اتفاقاً ایک فوجی جوان بھی ہے۔ اس نے لڑکیوں کو بہ حفاظت ان کے گھر تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی جاتی، دھڑدھڑاتی اس ریل گاڑی کی اندرونی روشنی کی لکیر میں ان دو نصف پنجابی نصف مہاجر نوجوان لڑکیوں کے لیے ایک فرشتے سے کم نہ تھا پاک فوج کا جوان، جس نے انھیں بہ حفاظت گھر تک پہنچایا۔

پھر وہ ریل بھی گزر گئی اور کراچی میں ایک دن طلوع ہوا۔ بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک کے زمانے کا ایک دن۔ اس دن کی روشنی میں کراچی کے ایک علاقے بہادرآباد میں بھٹو مخالف مقامیوں نے ایک بوڑھے سندھی کو ہلاک کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی تھی۔ بہت دیر تک وہ لاش جھولتی رہی۔

پھر اس نے انسانی اعضا دیکھے جن پر جلتے سگریٹوں سے ''جئے مہاجر'' یا ''جئے سندھ'' لکھا تھا۔

اسے کراچی کے سندھی مخالف لسانی فسادات یاد آئے۔ سندھ کی اسمبلی میں لسانی بِل پاس ہوا تھا اور کراچی میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا لیاقت آباد کے ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر ایک بڑے میاں باورچی خانے میں گھسے بڑی دیگ میں پانی ابال رہے ہیں۔

''ارے اتنے پانی کا کیا کیجیے گا؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔

بڑے میاں اتنے ضعیف ہیں ... کمر دوہری، تن کا ایک ایک بال سفید... سفید جھک کرتا پہنے۔

''ارے بھئی یہ پانی...'' وہ پوپلے منھ سے بولے، ''پھینکیں گے کھولتا ہوا پانی... کیا نام کہ پولیس

پر... اور یہ...'' انھوں نے پاس رکھا پسی مرچوں کا بڑا سا ڈبا دکھایا۔

عورت ہنسنے لگی۔ چاندنی میں اسے اپنی ہنسی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے گھر کی نچلی منزل سے چمپا اور چنبیلی کی مہک تیرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟ (حصہ سوم)

جب معتوب سیاسی تنظیم کے رکن، سابق بلدیاتی کاؤنسلر کو کراچی کے ایک بھرے پُرے محلے سے گرفتار کیا گیا تھا تو یہ متوقع نہ تھا کہ اس کی لاش دوسرے ہی دن ہسپتال پہنچا دی جائے گی۔ (کئی مہینوں سے اس عمل میں دو تین دن کا وقفہ پڑنے کا معمول تھا۔) پولیس رپورٹ میں درج تھا کہ متوفی پر حراست میں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دل کا دورہ ایک وبا کی طرح گرفتار شدگان میں پھیل چکا تھا اور نوجوان لڑکے حراست میں دل کے دوروں کا شکار ہو رہے تھے۔

پولیس پوسٹ مارٹم کے بعد فوراً لاش واپس لے گئی۔ مگر ہسپتال میں موجود عینی شاہدوں اور چند ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ متوفی کے پورے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اخباروں میں آنے والی دیگر رپورٹوں میں درج تھا کہ اس کی ایک آنکھ بھی غائب تھی۔

یہ پڑھ کر کراچی میں رہنے والا ایک دردمند شخص سر تھام کر بیٹھ گیا کیونکہ اسے متلی ہونے لگی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ ''آنکھ نکال لی! آنکھ نکال لی!'' یہ الفاظ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سا خیال بھی آیا کہ اس رات جب لوگ اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے تھے، ایک شخص کی آنکھ نکالی جا رہی تھی۔ اس خیال سے وہ پوری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخبار میں پولیس کی جانب سے متوفی پر اذیت کرنے کی تردید شائع ہوئی۔ پولیس نے بیان دیا کہ لاش پر اذیت کے نشان پہلے سے موجود تھے۔ وہ معتوب سیاسی تنظیم کے عقوبت خانے میں خود انھی کے ہاتھوں اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اوپر تشدد کروا کے وہ گرتا پڑتا لڑکھڑاتا سڑک پر جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا، اور تب حراست میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

یہ تردید پڑھ کر دردمند شخص کی خاک تسلی نہ ہو سکی۔ بار بار ایک ہی خیال اس کے دل کو کچوکے دیتا رہا، کہ جب اس پر اتنا تشدد ہو چکا تھا تو وہ کمبخت عقوبت خانے سے نکلا ہی کیوں، اور اس حالت میں پیدل

آخر کہاں کے لیے چل پڑا؛ رکشا ٹیکسی ہی کر لی ہوتی۔ لہٰذا پھر وہ پوری رات نہ سو سکا، اور رات بھر اس کے ذہن میں ایک شخص ہیبت سے منھ پھاڑے، گھٹی گھٹی آواز میں کربناک چیخوں کے ٹکڑے حلق سے نکالتا رہا۔ ایک نشتر اس کی آنکھ کا ڈھیلا نکالتا رہا اور وہ آنکھ نکلنے کے ساتھ کرسی سے ٹیڑھا ہو کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

بہرحال، تیسرے دن کے اخباروں میں آیا کہ لاش پہلے ایک رفاہی ادارے کے حوالے کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب لاش ان کے پاس لائی گئی تو اس پر تشدد کے نشان تھے اور آنکھ میں گولی ماری گئی تھی جو کھوپڑی کی پشت سے پار ہو گئی تھی۔

یہ پڑھ کر دردمند شخص پُرسکون ہوا۔ اس نے سوچا کہ لاحول ولاقوۃ! میں تو سمجھا تھا کہ آنکھ نکالی گئی ہے۔ اب پتا چلا کہ اس میں تو گولی ماری گئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس رات وہ آرام سے سویا۔

جس سہ پہر آمنہ بیگم کے گھر ٹیلیفون آیا تھا کہ ان کی بہن کو فیڈرل بی ایریا کے کسی ہسپتال میں داخل کیا گیا ہے، ان کا دل ڈوبنے لگا۔ فون پر بمشکل ہسپتال کا پتا لے کر انھوں نے بٹوا سنبھالا اور گھبرائی ہوئی پڑوسن کے گھر جا پہنچیں۔ دستک دی تو عمران نے دروازہ کھولا۔ وہ انھیں ہسپتال لے جانے کو تیار ہو گیا۔ دُسراہت کی خاطر اس کی ماں بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہو لیں۔

آمنہ بیگم کا پڑوسی، چوبیس پچیس سالہ جوان انھیں گھر کی کار میں ہسپتال لے چلا۔ اس نے پہلا ہی موڑ کاٹا ہو گا کہ سپاہیوں کا ایک ٹرک سامنے آ گیا۔ عمران نے ایکسلریٹر سے پیر ہٹا کر وہیل کو تیزی سے بائیں جانب گھمایا۔ پہیوں کی چیخ کے ساتھ گاڑی لہرائی اور سڑک کے وسط میں آ گئی۔ مگر عمران زیادہ دور نہ جا سکا۔ سپاہیوں کے ٹرک نے تیزی سے پلٹ کر اس کا راستہ روک دیا۔

پھر انھوں نے عمران کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ اسے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ ''خنزیر کے تخم! اگر ٹکرا جاتی تو؟''

پچھلی سیٹ پر بیٹھی دونوں عورتوں کی ہائیں ہائیں اور چیخ پکار چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تھرتھر کانپتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے بہتے، ان کی ناک اور ٹھوڑی اور تھرتھراتے ہونٹوں سے نیچے ٹپکتے رہے۔

سڑک پر خوانچے والا بیٹھا تھا۔ عمران کو بری طرح مار کھاتا دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا اور خوانچے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ تھپڑ کی اور ٹھوکر کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی اور ہاتھوں کی موٹی، بوڑھی رگیں ابھرتی گئیں۔

پاس سے گزرنے والی کسی شہری کی کار نے لحہ بھر کو رفتار دھیمی کی، پھر تیزی سے گلی سے چلی گئی۔

مار کھانے کے بعد عمران گاڑی میں بیٹھا۔ ہوش حواس مجتمع کر کے وہ گلی سے باہر نکلا۔ بڑی سڑک پر آ کر اس نے محلے کی کریانے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکاندار اسے پہچان کر اس کی طرف بڑھا۔ ''ارے، تمھاری یہ حالت!'' واقعے کی نوعیت اسے سمجھائی گئی۔ دکاندار کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ خاموشی سے اندر جا کر پانی کا گلاس لایا۔ عمران نے ہاتھ کی آڑ لے کر دانتوں سے نکلنے والے خون کی کلّی کی اور ٹشو پیپر سے منہ صاف کیا۔ بال ٹھیک کر کے تھوڑی دیر بعد وہ ماں اور پڑوس کی منہ بولی خالہ کو لے کر ہسپتال روانہ ہوگیا۔

پھر عمران بھی کہیں چلا گیا— کہاں؟ کون جانے!

ھم لوگ

فہمیدہ ریاض

ہم لوگ برصغیر جنوبی ایشیا کی تقریباً گزشتہ نصف صدی پر محیط، اذیت ناک تاریخ کے پیچ وخم کے چند اہم مراحل کی عکاسی پر مشتمل داستان ہے۔ اس کتاب کے تین حصے، زندہ بہار، گوداوری اور کراچی بالترتیب بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کے حالات اور چند کلیدی واقعات کے بارے میں ہیں۔ بقولِ مصنفہ ''اس کتاب میں ہمیں یہ روداد ملتی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم لوگوں نے اپنے ساتھ کیا کیا۔'' ہرچند کہ فہمیدہ ریاض حالات کی سنگینی اور اس کے ممکنہ المیہ انجام کو پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں تاہم وہ ان تحریروں میں اس اندوہ ناک کشت وخون میں الجھے تہذیب اور شرافت کے وہ مضبوط دھاگے بھی دکھاتی ہیں جو برصغیر کے لوگوں [یعنی ہم لوگ] کا رشتہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے جوڑتے ہیں اور جو بذاتِ خود ہم لوگوں کی فطرت کا حصہ ہیں۔ یہ ہمارے سہ پہلو سیاسی ضمیر کی آواز ہے، جو شناخت میں تو الگ ہیں لیکن تجربے میں یکساں۔



مصنفہ کے بارے میں

فہمیدہ ریاض جنوبی ایشیا کی نامور شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ وہ ۱۹۴۶ء میں میرٹھ، ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور عمر کے اوّلین برس حیدرآباد، سندھ میں گزارے۔ انھوں نے حیدرآباد اور اس کے بعد برطانیہ میں تعلیم حاصل کی۔ فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ پتھر کی زباں، ۱۹۶۸ء میں اور دوسرا مجموعہ بدن دریدہ، ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ وہ سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر کام کرتی رہی ہیں، بشمول صدر نشین، اردو ڈکشنری بورڈ۔ فہمیدہ ریاض نے صرف زبانی نہیں، بلکہ پاکستان میں جمہوریت کے لیے عملی جدوجہد کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں انھوں نے سیاسی جلاوطنی کے سات برس گزارے۔ ۱۹۹۷ء میں انھیں انسانی حقوق کے بین الاقوامی ادارے کا ''ہیمٹ ہیلمن ایوارڈ'' دیا گیا جو اہل قلم کے لیے مخصوص ہے۔ ۲۰۱۰ء میں انھیں حکومت سندھ کی جانب سے ''شیخ ایاز ایوارڈ'' اور صدر پاکستان کی جانب سے ''تمغۂ حسن کارکردگی'' دیا گیا۔

فہمیدہ ریاض کراچی میں رہائش پذیر ہیں اور مستقلاً تحریر وتدوین میں مصروف رہتی ہیں۔

سرورق تصویر: Three Myths از رضا رومی

ISBN 978-0-19-906232-4



OXFORD
UNIVERSITY PRESS

www.oup.com
www.oup.com/pk

RS 895